ادبیات انٹرنیشنل
شمارہ نمبر 02
اکادمی ادبیات پاکستان
PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS

ادبیات انٹرنیشنل

آن لائن شمارہ نمبر 2، سال 2022

نگران

ڈاکٹر یوسف خشک

مدیر اعزازی

فاروق عادل

معاونین

اطہر قیوم راجا / ڈاکٹر جنید آزر

اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، سیکٹر ایچ۔ ایٹ/ون، اسلام آباد

بین الاقوامی مجلس مشاورت

ضروری گزارشات

☆ مجلے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں۔

☆ نگارشات کے ساتھ اپنا اصل نام، قلمی نام، ای میل اور ڈاک کا پتہ تحریر کریں۔

☆ شامل اشاعت نگارشات کے نفس مضمون کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ ان کی آرا کو اکادمی ادبیات پاکستان کی آرا نہ سمجھا جائے۔

ترتیب

اس نام سے ہے باقی آرام جہاں ہمارا (عقیدت)

سراغِ زندگی (مضامین)

میر و غالب سے دوستی رکھی (غزلیں)

تہذیب، روایت، اسلوب (مضامین)

تتلیاں خیال کی (نظمیں)

رات کہانی کہتی ہے (افسانے)

دیا جل اٹھا دیے کی لو سے (تراجم)

☆☆☆☆

تمنا کا پہلا قدم

اکادمی ادبیات پاکستان کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد مستقل کوششیں جاری ہیں کہ پاکستان کی مختلف زبانوں کے شعرا و ادبا محققین و نقادوں کے ساتھ ساتھ بیرونِ ملک اردو اور مختلف زبانوں میں شعر و ادب تخلیق کرنے والے تخلیق کاروں و محققین کو بھی مستقل پلیٹ فارم مہیا کیا جائے۔

اس مقصد کے لیے پہلے مرحلے میں پاکستان کی بیشتر زبانوں کے لیے 'صوبائی ادبیات' کے ایڈیشنوں کی اشاعت شروع کی اور دوسرے مرحلے میں بیرونِ پاکستان، اردو میں لکھنے والوں کو بھی پلیٹ فارم مہیا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں 'ادبیات انٹرنیشنل' کا پہلا شمارہ شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اب 'ادبیات انٹرنیشنل' کا دوسرا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔

پہلے شمارے میں ہم نے باز دیدی ادب کی اصلاح کے تحت اپنے وطن سے دور رہ کر ادب تخلیق کرنے والوں کے اندازِ فکر اور رجحانات پر بحث کی تھی۔ تازہ پرچہ اس تصور کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں نے اپنے معاشروں میں بہتری پیدا کرنے کی تربیت کے جو انداز اختیار کیے، ان میں ادب کا کردار کیا تھا۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ گزشتہ شمارے کی طرح یہ شمارہ بھی آپ کی داد و تحسین ضرور حاصل کرے گا، ان شااللہ۔

ادبیات انٹرنیشنل کا یہ شمارہ اپنے پہلے شمارے کی طرح اس اعتبار سے بھی ممتاز ہے کہ اس میں دنیائے ادب کی ممتاز شخصیات کے رشحاتِ فکر شامل ہیں جس کے لیے میں ان تمام بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کا شکر گزار ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ ہمیں آئندہ بھی اسی طرح ان کا تعاون حاصل رہے گا۔

اس موقع پر میں 'ادبیات انٹرنیشنل' کے مدیر ڈاکٹر فاروق عادل کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ انھوں نے وسائل کی کمی کے باوجود تن تنہا یہ شمارہ مرتب کیا۔ اس شمارے میں دنیا کے پانچوں براعظموں کے پندرہ ممالک میں پھیلنے پھولنے والی اردو بستیوں کی نمائندہ شخصیات کی تحریریں شامل ہیں۔ اس کام کے لیے غیر معمولی تن دہی اور ثابت قدمی کی ضرورت تھی، مجھے خوشی ہے کہ وہ اس امتحان میں بھی پورے اترے جس کے لیے وہ شکریے اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔

امید ہے کہ شمارہ اول کی طرح ادبیات انٹرنیشنل کا شمارہ دوم بھی اپ کو پسند آئے گا۔ آپ کی رائے کا منتظر آپ کا اپنا۔

ڈاکٹر یوسف خشک میریٹوریس پروفیسر

چیئرمین، اکادمی ادبیات پاکستان

اپنی یہ آرزو ہے

وہ محترمہ بیلن یونس کا گھر تھا جہاں محترمہ شاہین کاظمی نے اپنی نظم سنائی:

"اجنبی شہر کی اجنبی سی گلی
ایک مصروف کوچے کا اک سرد گوشہ
اور اس سرد گوشے میں چپ چاپ، اداسی کی ماری ہوئی ایک اکھڑی ہوئی کالی دیوار تھی
جس کے بوسیدہ سینے پہ تحریر تھے
جتنے نقشے، ادھورے سے ارمان
اور حسرتوں کی کتھا
سارے مقصود، سارے حروفِ نہاں
جن کو ہونٹوں پہ لانا ہی ممکن نہ تھا"

شاہین کاظمی جس دم کسی اجنبی شہر کی ادھڑی ہوئی کالی دیوار کا ماجرا بیان کر رہی تھی، عین اسی وقت ایک سوال میں ذہن میں اٹھا۔ اس سوال کا تعلق ایک یاد سے تھا۔ گو، بہت زمانہ بیت چکا لیکن کسی خوش نما رنگین تصویر کی طرح کچھ واقعات میرے ذہن میں آج بھی تازہ ہیں۔ میرے بچپن کے کچھ برس ضلع رحیم یار خان کی تحصیل لیاقت پور میں گزرے ہیں۔ میرے والد مرحوم اگرچہ ایک طبیب تھے لیکن پیشہ دارانہ مصروفیات کے باوجود ان کے صبح و شام کتابوں کی رفاقت میں گزرتے۔ تفسیر و سیرت میں ان کی دل چسپی غیر معمولی تھی۔ فلسفے میں بھی درک رکھتے تھے۔ شعر و افسانہ میں بھی دلچسپی تھی، اتنی کہ جب کبھی طبیعت رواں ہوتی، فارسی میں شعر کہا کرتے۔ کچھ اسی قسم کا مزاج تھا کہ بچوں کی تربیت کے بارے میں ان کے کچھ رجحانات متعین ہو گئے۔ یہی سبب تھا کہ بہ وجہ بڑی اولاد ہونے کے وہ مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ

رکھتے۔ شہر کے بزرگوں کی مجالس میں، وعظ و نصیحت کی محافل میں، یہاں تک کہ اشیائے خورد و نوش کی خریداری کے مواقع پر بھی۔ شاید یہ سمجھتے ہوں گے کہ اس کے بغیر تربیت ممکن نہیں۔

وہ یاد جس کا مجھے یہاں ذکر کرنا ہے، اس کا تعلق اشیائے خورد و نوش کی خریداری سے ہے۔ لیاقت پور گو ایک تحصیل تھی اور چھوٹا سا قصبہ لیکن اس کے باوجود بہت سی چیزوں کا ایک ڈسپلن تھا، مثلاً گوشت عام بازاروں میں فروخت نہیں ہوتا تھا۔ اس کی خریداری کے لیے مذبح خانے جانا پڑتا تھا۔ مذبح خانے کا بھی ایک نظم و ضبط تھا۔ قصاب لوہے کی جالیوں کے پیچھے بیٹھتا تاکہ اس کا مال مکھیوں اور نقصان پہنچانے والے حشرات الارض سے محفوظ رہ سکے۔

میرے بچپن کے کچھ برس سرگودھا میں بھی گزرے ہیں۔ لیاقت پور ہو یا سرگودھا، ہر دو شہروں میں صبح دم اور سرِ شام بلدیہ کے ٹینکر نکلتے اور سڑک کے دونوں کناروں پر پانی چھڑکتے جاتے۔ میرے جیسا کوئی ناسٹیلجک اگر چاہے تو اس قسم کے معاملات کی فہرست بناتا چلا جائے، اس کے مندرجات بڑھتے چلے جائیں گے لیکن المیہ یہ ہے کہ اب ان تمام چیزوں کا کوئی وجود باقی نہیں رہا۔ کسی کی یاد میں کچھ باقی رہ گیا ہو تو یہ الگ بات ہے۔

المیہ یہ ہے کہ شہری اور انفرادی زندگی کے وہ تمام قرینے جو اچھے اور پسندیدہ ہیں، رفتہ رفتہ معدوم ہوتے چلے گئے۔ یہ کیسے ہوا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش ممکن ہے، کسی اور شعبے میں ہوئی ہو لیکن ادب کے شعبے میں نہیں ہوئی۔

جن لوگوں کو اپنے دیس سے نکل کر دنیا کے مختلف خطوں کی سیاحت کا موقع ملا ہے، ان کا مشاہدہ ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان معاشروں میں نظم و ضبط بڑھتا جاتا ہے اور انسانی فلاح و بہبود کے لیے نئے نئے منصوبے متعارف کرائے جاتے ہیں۔ ہمارا معاملہ مختلف ہے۔ ہر آنے والا دن کوئی نہ کوئی ایسی خبر لاتا ہے جس میں خوشی کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔ جن لوگوں کا تعلق زندگی کے دیگر شعبوں سے ہے، وہ خود جانیں کہ انھیں اپنے ڈسپلن کے مطابق اس معاملے کا جائزہ کیسے لینا ہے۔ ہمارا تعلق ادب سے ہے۔ ہماری دلچسپی اس میں ہونی چاہیے کہ معاشرے کو سربلند کرنے میں ادب کا کردار کیا ہوتا ہے؟

یہی سوال میں نے محترمہ شاہین کاظمی سے پوچھا۔ کہنے لگیں کہ اس پہلو پر میں نے ابھی تک سوچا

تو نہیں لیکن بات درست ہے، اگلی بار جب میں پاکستان آؤں گی تو ضرور اس معاملے پر بھی کچھ روشنی ڈالوں گی۔شاہین کاظمی صاحبہ کا یہی سخن تھا جس پر ہم نے سوچا کہ دیارِ غیر میں پاکستان کا نام روشن کرنے والی ہماری شاعرہ جب تک واپس لوٹتی ہیں، کیوں نہ یہ سوال 'ادبیات انٹرنیشنل' میں بھی اٹھا دیا جائے۔اس فورم پر یہ سوال اٹھاتے ہوئے ہم نے کوشش کی کہ اس شمارے میں بھی مقدور بھر ایسی کوشش کر ڈالی جائے۔تو بات یہ ہے کہ 'ادبیات انٹرنیشنل' کے اس شمارے کا مطالعہ کرتے ہوئے اس پہلو پر بھی توجہ دی جائے، آپ کو ضرور اس سلسلے بہت کچھ پڑھنے کو ملے گا۔ہمارا خیال ہے کہ اردو ادب میں اس نوعیت کی یہ پہلی کوشش ہوگی۔ہم توقع کرتے ہیں کہ ہمارے ادیب، خاص طور پر دنیا کے مختلف گوشوں میں بسنے والے ہمارے ادیب بھی اس پہلو پر توجہ دیں گے۔ہم سمجھتے ہیں کہ ادب میں اس رجحان کی آبیاری اپنے وطن سے محبت اور اس کی خدمت کا ذریعہ ثابت ہوگی کیوں کہ یہ ادب ہی ہے جو معاشرے کی تربیت کر کے اسے خوب صورت بناتا ہے اور افراد معاشرہ میں بلند نظری پیدا کر کے ایسے اہداف کے تعین میں مدد دیتا ہے جو قوموں کو بامِ عروج پر پہنچا دیتا ہے۔یہی ہماری آرزو ہے۔

ڈاکٹر فاروق عادل

مدیر اعزازی

نجمہ عثمان (لندن)

پیامِ نبیؐ چار سُو گونجتا ہے

مدینے کی صبحوں میں تابندگی ہے، مدینے کی پُرنور شامیں سلامت
جدھر سے بھی گزریں، جہاں تک بھی جائیں، یہ رستے یہ گلیاں، یہ راہیں سلامت

محمدؐ کی خدمت میں کیا لے کے جاؤں، جو کہنا ہے کیسے، کہوں کیا بتاؤں
اگر ہو سکے چیر کر دل دکھاؤں، نہاں آنسوؤں میں دعائیں سلامت

سلامت رہے گا یہ عشقِ حبیبی، ہو تا عمر شامل رضائے کریمی
مرا بخت جاگا مری خوش نصیبی، معطر معطر ہوائیں سلامت

ہیں تسکین جاں آپؐ نور الہدیٰ ہیں، سراپا یقیں اور مشکل کشا ہیں
ہمارے لیے آپ صلی علیٰ ہیں، یہ رحمت کی ساری پناہیں سلامت

جبیں جھک رہی ہے، سکوں مل رہا ہے، جہاں میں کھڑی ہوں یہ ماں کی دعا ہے
پیامِ نبیؐ چار سُو گونجتا ہے، صفیں ہر طرف ہیں نمازیں سلامت

جو لکھا ہے بے ساختہ بے خودی میں، ندامت چھپی ہے مری شاعری میں
بچا اور کیا ہے مری زندگی میں، عقیدت سے پُرنم نگاہیں سلامت

☆☆☆☆

ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا (ماسکو)

بیرونی ملکوں میں اردوگو آبادیوں کی سماجی وثقافتی زندگی میں اردو زبان اورادب کا کردار

ایک مدت سے بیرونی ملکوں میں سکونت پزیر ایشیائی قومی برادریوں کے مسائل دنیا کے علمی حلقوں کی توجہ کا ایک مرکز بنے ہوئے ہیں۔ وہ مسائل بنیادی طور پر اقتصادی، سیاسی اور سماجی نوعیت کے ہوتے ہیں جبکہ تہذیب اور ثقافت سے متعلق مسائل کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ ان میں لسانی اور ادبی مسائل سرفہرست ہیں۔

"اردو دنیا" آج یہ الفاظ اصطلاحی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ اگر بیس ویں صدی کے وسط تک اردو زبان وادب کا دائرہ برصغیر تک محدود رہا تھا تو اسی صدی کے اواخر میں اس کی سرحدیں کئی براعظموں تک پہنچی ہیں۔

1947 کے تقریباً فوراً بعد ہندوستان اور پاکستان کے تارکین وطن کی نقلِ مکانی کا سلسلہ شروع تھا۔ ان میں اردوگو افراد کی کمی نہیں تھی۔ اس نتیجے میں بھی مغربی دیسوں میں اردو بولنے والی برادریوں کی تشکیل ہوئی ہے۔

مغربی زبانوں میں لفظ "ڈائسپورا" مروج ہے جو اردو میں زیادہ نہیں چلتا ہے۔ "ڈائسپورا" کی تشریح کچھ اس طرح کی ہے:

"وطن سے باہر ایک دیگر لسانی اور تہذیبی ماحول میں قیام پزیر عوام / قوم کا محدود حصہ جس نے اپنی زبان اور بنیادی طور پر قومی تہذیب اور روایات کو ترک نہیں کیا ہے۔"

ایک اور اصطلاحاتی دقت لفظ "امگرینٹ کے ساتھ پیش آتی ہے۔ ہندی کی "پرواسی" جیسی اردو میں فی الحال کوئی اصطلاح رائج نہیں ہوئی ہے۔ اس معنی میں الفاظ "تارکِ وطن"، "نئے ملک میں آبادکار / نووارد"، "وطن سے دور مقیم لوگ" استعمال کیے جاتے ہیں۔ لفظ "مہاجر" اور اسی جڑ کے الفاظ "ہجرت" اور "مہاجرت" شاید سب سے زیادہ مروج اور عام فہم ہیں) واضح رہے کہ وہ اسلام کی خصوصی اصطلاح کے معنی سے الگ ہیں (اگر دورِ حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر اہلِ زبان دانشور اور ماہرین لسانیات الفاظ "ڈائسپورا" اور "امگرینٹ" کے لیے مستند اصطلاحات کو ترویج دینے پر غور کریں تو بہت مناسب ہوگا۔

مغربی ملکوں کا رخ لینے والے اردوگو، اردو شناس اور اردو سے شغف رکھنے والے افراد کے ہمراہ اردو زبان اجنبی تہذیب وثقافت کے ملکوں میں پہنچ گئی تھی۔ جلد ہی اردو نہ صرف جنوبی ایشیا کے ڈائسپورا میں

رابطے کی زبان بلکہ ذریعہ ابلاغ اور تہذیبی و ثقافتی وسیلہ بھی بن چکی تھی۔ جہاں جہاں اردو نے گھر کر لیا وہاں فوراً ادبی محفلیں سجائی جانے لگیں۔ ان میں اکثر پنجابی، ہندی، گجراتی بولنے والے لوگ بھی شریک ہو جاتے تھے۔ اس طرح شروع سے ہی جنوبی ایشیا کی ڈائسپورا کی تشکیل میں اردو ایک ادبی عنصر کی حیثیت سے کارفرما ثابت ہے۔

اردو ایک ایسی زبان ہے جو اپنے اندر ایک خاص تاریخی اور سماجی نظام کی حامل ہے۔ اس کی یہ حیثیت بخوبی ہجرت میں نمایاں ہوئی اور اب 21 ویں صدی میں بھی خاص شدت سے منظرِ عام پر آئی۔ خاص طور پر توجہ طلب یہ بات ہے کہ آج اردو زبان مغربی ملکوں میں جنوبی ایشیا سے آنے والے تارکین وطن کے لیے انفرادی اور اجتماعی سطح پر ذریعہ شناخت کا کردار ادا کرتی ہے۔

نئی زمیں پہ کھلاتے رہے شناخت کے پھول

جہاں رہے، وہاں اپنی زباں کے ساتھ رہے

(اشفاق حسین)

بیسویں صدی کی ساٹھ کی دہائی میں اردو ڈائسپورا کا ذکر اکثر و بیشتر "اردو کی نئی بستوں" کے نام سے کیا جانے لگا اور ادب کو "اردو کی نئی بستیوں کا ادب" کہا جانے لگا تھا۔ شروع میں اس کے خلاف نامور ادیب اور دانشور زور سے آواز بلند کرتے تھے۔ اس بنا پر کہ اس ادب کا کوئی وجود ہی نہیں کیونکہ "ایک بلبل سے گلستان نہیں بنتا"، لیکن کوئی آدھی صدی کے اندر اندر وطن سے دور تخلیق کیے جانے والے اردو ادب کا ایسا گلشن شگفتہ ہو چکا ہے جس کی بلبلوں کے نغمے پوری اردو دنیا میں سنائی دینے لگے ہیں۔ مغربی ملکوں میں آباد اردو کے شاعروں اور ادیبوں کے متعدد نام آج وسیع پیمانے پر پہچانے جاتے ہیں۔ ان میں سے کئی اشخاص اس دنیا کو چھوڑ چکے ہیں لیکن ان کا ذکر کیے بغیر آج بھی مجموعی اردو ادب پر گفتگو کرنا ناممکن ہے۔

نام حروف تہجی کی ترتیب سے لیے جا رہے ہیں:

ابرار حسن، افتخار عارف (ان کے لندن میں قیام کی بات ہے)، افتخار نسیم، اشفاق حسین، امجد مرزا امجد، انور شیخ، باصر کاظمی، بانو ارشد، بخش لائلپوری، پروین شیر، جاوید دانش، جمیل احسان، حیدر قریشی، ساقی فاروقی، ستیہ پال آنند، سلمان اختر، سیما جبر، شاہین، ظفر زیدی، عرفانہ عزیز، عطیہ خان، فہیم اختر، کوثر علی، مقصود الٰہی شیخ، نصر ملک، وسیم بٹ، وسیم۔۔۔

یہاں صرف ان مصنفین کے نام مذکور ہیں جن کے شعری اور نثری مجموعوں کو عام پذیرائی ملی اور جو خود میری نظر سے گزرے ہیں۔ (بے شک کئی سارے نام رہ گئے ہیں)۔

افتخار عارف آج پاکستانی شاعر کی حیثیت سے مشہورِ عالم ہیں۔ لیکن ان کا پہلا شعری مجموعہ "مہر دو نیم" برطانیہ میں ان کی کئی برس کی ہجرت کے دوران شائع ہوا تھا اور غالباً اسی کے ساتھ اردو دنیا میں بلند درجے کی مہجری شاعری پر سنجیدہ اور معنی خیز گفتگو ہونے لگی تھی۔

سب سے پہلے میں اردو شعروادب کے فروغ کے تناظر میں مہجری شاعری کی دو ایک خصوصیات کا ذکر کرنے والی ہوں۔

یہ فقرہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے کہ ادب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے مہجری ادب کوئی استثنا نہیں۔

مہجری شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں اٹھائے جانے والے مسائل کی سنجیدگی اور ساتھ ہی اس شاعری کی ہیئت و ماہیت کی ہمہ رنگی ہماری توجہ مبذول کرتی ہے۔ اس میں، اردو کلاسیکی شاعری سے لے کر ترقی پسند، جدید اور جدید تر شاعری تک کی سب روایات کے رنگ نظر آتے ہیں۔ مہجری شاعری میں خیال کی نئی توانائی اور اسلوبی جدت بھی نظر آتی ہے۔ مہاجر شعرا کے کلام میں قدیم اور جدید رنگوں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے جس میں مغربی رنگ بھی مخلوط ہے۔

نئی معاشرتی زندگی کی عکاسی کرنے والی مہجری شاعری میں بہت سے ایسے موضوعات پر توجہ دی گئی ہے جن سے دیسی اردو شاعری آشنا نہیں ہے۔ اس میں مہمان اور میزبان تہذیبوں کے مختلف پہلوؤں کے، ان دونوں کے مکالمے کے اور ایک دوسرے سے مستفید ہونے کے امکانات جیسے مضامین کو اردو شاعری میں ایک اضافہ سمجھنا چاہیے۔

ہجرت کا نیا تجربہ مہجری اردو شاعری کے متنوع موضوعات میں سرِفہرست ہے۔ اردو کے علاوہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی نقلِ مکانی بلکہ ہجرت کا تجربہ ایک اہم جمالیاتی رویہ، اور بعض زبانوں کے ادب میں تو ایک کلیدی استعارہ بن گیا ہے۔ اردو شاعری صوفیائے کرام کے اور میر تقی میر کے زمانے سے ہجرت کے موضوع سے آشنا ہے۔ انسانی تاریخ میں غالباً ایک سب سے بڑی اجتماعی ہجرت برِصغیر کی تقسیم کے وقت ہوئی تھی۔ اس کا تلخ بلکہ الم ناک تجربہ اردو سمیت برِصغیر کی کئی زبانوں میں اس موضوع پر مبنی شعروادب کے بڑے ذخیرے کا سرچشمہ ثابت ہوا۔ لیکن سب اگلے زمانوں کے مقابلے میں دورِ حاضر کے مہجری اردو ادب میں منعکس ہجرت کا تجربہ قطعی مختلف ہے کیونکہ مغربی ملکوں میں برِصغیر جیسی تہذیبی یکسانیت کا ماحول موجود نہیں ہے۔ ہر فرد کو جو اپنا دیس چھوڑ کر بیگانی تہذیب کی سرزمین پر ڈیرہ لگاتا ہے، سخت اجنبیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انتظار حسین مرحوم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "گم شدہ تجربوں کو یاد کرنا اپنے وجود کے کھوئے ہوئے حصوں کو از

سرنو یکجا کرنے کے برابر ہے۔" ان الفاظ کا اطلاق آج کے مہجری ادب اور خاص طور سے شاعری پر کیا جا سکتا ہے۔ وہ ہجرت کے اس نئے تجربے سے، یعنی گم شدہ تجربوں کی یادوں سے اور لسانی اور تہذیبی اجنبیت کے شدید احساس سے لبریز ہے اور اس میں وطن سے جغرافیائی دوری کا غم بھی ملا ہوا ہے۔

چھوڑے ہوئے وطن کے لیے سخت نوسٹلجیا اور اپنی آبائی سرزمین کی یادوں کی پکار، پھر بیچ کی تلاش اور خود اپنی شناخت کی تلاش، وفاداری اور مصلحت کا مسئلہ، روحانی ہجرت کا اور تنہائی کا نیا فلسفہ، مہجری شاعری نے ان سب موضوعات کا احاطہ کیا ہے اور ہجرت کے اس نئے ہمہ رنگ تجربے کو جمالیاتی شکلوں میں ڈھالا ہے۔

اس کی وضاحت کے طور پر مہاجروں کی طے شدہ مختلف ذہنی اور نفسیاتی منزلوں پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اشفاق حسین:

شناخت اپنی ہم اک روز بھول جائیں گے
ہمیں ہی اس کا یہاں ڈر، مگر وطن سے کم

افتخار عارف:

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگ زمانہ ہیں ہم کیا، ہماری ہجرت کیا

....

غبار کوچہ وعدہ بکھرتا جاتا ہے
اب آگے اپنے بکھرنے کا سلسلہ ہوگا

...

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

بخش لائلپوری:

بڑے خلوص سے اپنا لیا ہے گھر کی طرح
میں تا حیات نظر بند جس قفس میں رہا

ظفر زیدی:

چل دیا اک اور پتہ ٹوٹ کر
آندھیوں کے دوش پر تکیہ کیے

ساقی فاروقی:

یاد کا شہر تہہ آب نظر آتا ہے
ہر طرف حلقۂ گرداب نظر آتا ہے

شاہین:

شاہیں کہ تھا ازل سے خود سے بھی لاتعلق
اب دشتِ بیکراں میں کس کو پکارتا ہے

...

لہو رلائے زمانہ مگر مجھے ضد ہے
غمِ زمانہ کو ترتیب دوں تبسم سے

شمالی امریکہ کی مہجری شاعری کا ایک نمایاں پہلو، قدرتی مناظر کی نئی نئی تصویریں قابل ذکر ہیں جن کی سب سے متاثر کن مثالیں عرفانہ عزیز کے کلام میں ملتی ہیں۔ مہجری شاعروں کے اجنبی موسموں سے نئے رابطے کا اظہار اردو شاعری میں منظر نگاری کے حصے میں ایک خوبصورت اضافے کی حیثیت کا حامل ہے۔

وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ مہجری اردو شاعری کو ایک منفرد فنی خزانے اور پوری اردو شاعری کے ایک حصے کی حیثیت سے دیکھنا بہت مناسب ہے۔

اردو شاعری پر گفتگو کرنا اور مشاعرے کا ذکر نہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ آج کل برصغیر سے باہر منعقد کیے جانے والے مشاعروں کو اکثر تنقیدی نظر سے دیکھا جاتا ہے یہاں تک کہ گویا ان مشاعروں سے پوری اردو شاعری کو نقصان پہنچتا ہے اور ان میں بہت کمزور شعر پڑھے جانے سے سامعین کا ذوقِ شعر خراب ہو جاتا ہے۔

اس طرح کی تنقید اس لحاظ سے قابل اعتراض ہے کہ مشاعرہ اردو دنیا کی تہذیبی، ذہنی اور سماجی زندگی کا ایک پہلو ہے۔ وہ ایک غیر معمولی ذہنی تفریح کا بھی درجہ رکھتا ہے۔ دوسری تہذیبوں میں اردو مشاعرے کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ دیسی مشاعروں کے مقابلے میں مہجری مشاعروں کی اہمیت اس لیے زیادہ معلوم ہوتی ہے کہ ان میں اردو گو مہاجروں کا جذبۂ اجتماعیت نئی شدت سے جاگ اٹھتا ہے اور مشاعروں کی بدولت مہاجروں کا اردو سے رشتے کا احساس برقرار رہتا ہے۔ ہجرت میں ہر کامیاب مشاعرہ ایک بڑی ادبی تقریب کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ اس لیے مہجری مشاعروں کا گلہ نہیں بلکہ ان کے منتظمین کا گلہ کرنا چاہیے۔ اردو مشاعرے کی قدیم روایت میں اردو زبان اور شعر و شاعری کی جان بخش قوت پنہاں ہے۔ مشاعرے کی سطح زیادہ بلند کرنے کے لیے شاید اس کے منتظمین کو معقول انتخاب کی بنا پر شاعروں کو دعوتیں بھیجنی چاہییں۔ مہجری

مشاعروں پر خاص توجہ دینا۔ان کی سطح کا خیال رکھتے ہوئے ہجرت میں مشاعرے کی روایت کو فروغ دینا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مہجری اردو نثر کے مطالعے کی روشنی میں اس میں متنوع مضامین نظر آتے ہیں۔ہجرت،وطن کے لیے نوسٹلجیا،نئے مغربی مکان سے وابستہ حسرتیں،نئے ملک میں خاص ذہنی کیفیات سے گزرنے کی مشکلات کے،بتانیثیت کے مسائل۔

یہ سب مہجری نثر کے عام مضامین ہیں۔لیکن مغربی ماحول میں پلے بڑھے بچوں،اور ان کے والدین کے درمیاں بڑھنے والے فاصلے کا مسئلہ ایک خاص اہمیت کا موضوع ہے۔بعض ادیب،یہ اہم اور پیچیدہ مسئلہ عبرت ناک سمجھ کر حالات سدھارنے کی کوششوں میں لگ گئے ہیں۔برطانیہ میں مقیم مصنفہ کوثر علی کا عقیدہ ہے کہ اردو کو فروغ دینے کے لیے مہاجروں کے بچوں کو اردو سکھانے کی سخت ضرورت ہے اور اس ضرورت کو حقیقت بنانے کی خاطر جد و جہد کرنی چاہیے۔انھوں نے ڈراماائی صنف کو اردو کی خاطر جد و جہد کا ایک ذریعہ بنایا۔ ان کا پہلا ڈرامہ ایک سکول کی سالانہ تقریب میں پیش کیا گیا اور بہت ہی کامیاب رہا۔اس میں زیادہ تر شریک نووارد مہاجرین کے بچے تھے جن کی اردو زبان کا معیار خاصا اچھا تھا اور جن کو مکالے یاد کرنے میں مشکل نہ تھی۔ سب دوسرے بچے جو ایک عرصہ قبل برطانیہ میں آ چکے تھے اور جن کی اردو کمزور تھی سٹیج پر اپنے دوستوں کی کامیابی دیکھ کر بہت متاثر اور اردو سیکھنے کے لیے حوصلہ مند ہو گئے تھے۔معلوم نہیں یہ اثر اور یہ حوصلہ کتنی دیر تک رہا تھا لیکن کوئی شک نہیں کہ اس کا انحصار بچوں کے والدین کے حوصلے اور محنت پر تھا۔

ڈنمارک میں سکونت پذیر ملک نصر اور ان کی اہلیہ ہما نصر نے مغربی یورپ کی قوموں کی کہانیوں کے اردو میں ترجموں کا سلسلہ شروع کیا ہے۔یہ تراجم نصر ملک کی ویب سائٹ "اردو ہمعصر" شائع پر ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ شمالی یورپ کے ملکوں میں رہنے والے اہلِ اردو خاندانوں کے بچے اردو کے ذریعے مقامی تہذیب سے آشنا ہو جائیں اور اردو زبان سے بھی ہم کنار رہیں۔

اس طرح کی مثالیں کم ہی سہی لیکن نیک پہل قدمی کی پیروی کرنے کے لیے کبھی ایک مثال بھی کافی ہو سکتی ہے۔

آج کل بیرونی ملکوں میں اردو زبان اور شعر و ادب کے فروغ کے بلکہ خود وجود کے سلسلے میں تشویش ناک پیشن گوئی سننے میں آتی ہے اور وہ بے بنیاد نہیں ہے۔ایک افسوس ناک حقیقت سب پر واضح ہے کہ آج مہجری ادب کو "ایک نسل کا ادب" کہنا چاہیے کیونکہ مغربی ماحول میں پلے بڑھے بچے،یعنی تارکین وطن کی دوسری نسل،بنیادی طور پر اردو کا نام ہی جانتے ہیں۔اردو شعر و ادب سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

سکوں ملتا ہے بے آنگن گھروں میں میرے بچوں کو
کھلے دالان کی خواہش تو میری نسل ہی تک ہے

(اشتاق حسین)

ڈائسپورا میں مجموعی اردو ادب کے فروغ کی امید، صرف نئے مہاجروں سے وابستہ کی جاسکتی ہے یعنی ان اردو پڑھنے لکھنے والے نوجوان اشخاص سے جن کو ادبی شوق اور ذوق ہو، جن کی لکھنے کی صلاحیت ہو، جو برصغیر سے باہر جا کر اردو کی خدمت کو خیر باد نہ کہیں اور ادبی سرگرمیاں جاری رکھتے ہوئے اپنا قلم تیز تر کریں۔۔۔ یہ امید بے بنیاد نہیں ہے۔ مثلاً اب اکثر لندن سے ان نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی خبریں آتی ہیں جنھوں نے یہیں برطانیہ میں اپنی پہلی پہلی اردو کتابیں شائع کی ہیں۔ دوسرے مغربی ممالک میں بھی ایسی مثالیں زیادہ سے زیادہ ملنے لگی ہیں۔

ہجرت میں اردو کے خوش گوار مستقبل کے سلسلے میں ایک اور امید افزا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو عالمگیریت میں پنہاں اس تضاد سے وابستہ ہے کہ ایک طرف سے دنیا میں قوموں کے بیچ فاصلے کم ہونے کا رجحان زور پکڑتا ہے اور دوسری طرف "یک رنگی" کے خلاف یعنی ساری دنیا میں ایک ہی تہذیبی اور ثقافتی معیار رائج کیے جانے کے خلاف ردِعمل بڑھتا جا رہا ہے۔ عالمگیریت کے ڈسکورس میں اردو گو مہاجرین کے نوجوان بچوں میں قومی اور دینی شناخت قائم کرنے کی خواہش کا واضح رجحان نظر آتا ہے اور اس کے ساتھ یہ شعور بھی کہ قومی ثقافت، اپنی زبان اور اسی میں تخلیق کیا جانے والا ادب اپنی شناخت قائم کرنے کے موثر قدرتی ذرائع ہیں۔

عالمگیریت کے ہمارے دور میں جب انگریزی زبان نے بین الاقوامی میدان میں اولین جگہ لے رکھی ہے مغربی ملکوں میں اردو کے فروغ کے امکانات دوسری زبانوں کے امکانات کے برابر ہو سکتے ہیں بشرطیکہ فروغِ اردو کے مشتاق افراد اس کے لیے محنت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ اردو کا قدرتی حسن، اور اس کی شیرینی ضرور ان کا ساتھ دیں گی۔

تاریخ گواہ ہے کہ ہر معاشرے کی پائیدار تہذیبی پرداخت اور ترقی میں سب سے اہم کردار شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے ادا کیا۔ وطن سے دور قیام پذیر اردو کے شاعر اور ادیب اپنے قلم کی طاقت سے عالمی تہذیبی رویوں کی ترتیب میں پروقار کردار ادا کر سکتے ہیں۔ مغربی دنیا میں اردو زبان اور ادب کی سماجی اور تہذیبی توقیر کا اور اردو کے روشن مستقبل کا فرض انھیں پر عائد ہوتا ہے۔

☆☆☆☆

سید تقی عابدی (کینیڈا)

اُردو غزل: خسروؔ سے فراقؔ تک سفر
(تحقیق، تنقید اور تشریح)

غزل کیا ہے؟ اس کی تعریف میں لغوی، اصطلاحی، اور روایتی گفتگو کسی طرح سے لٹریچر میں نظر آتی ہے۔ غزل چوں کہ صرف فارسی اور اُردو کی صنف شاعری ہے اگرچہ بہت ہی کم غزل کے قدیم نمونے ترکی زبان میں بھی موجود ہیں، اس لیے اس کی تاریخ، تفسیر، تشریح، تاثیر اور تنقید فارسی اور اُردو تک ہی محدود ہے۔ انگریزی اور یورپین زبان میں اس کا وجود نہیں۔ بعض غرب زدہ اُردو ادیب، نقاد اور شاعر جو سونیٹ Sonnet یا بعض عشقیہ پویم کو غزل کا متبادل گردانتے ہیں وہ صحیح نہیں، عشقیہ مضامین کی نظم کو "لرک" lyric کہتے ہیں جس میں غزل کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ جرمنی کا عظیم شاعر، نقاد اور ناول نگار گوئٹے نے حافظ کی غزلوں سے متاثر ہو کر فارسی شاعری اور غزل کی شعریت سے استفادہ کیا اور کچھ شعری اصطلاحات کا خوب صورت استعمال بھی کیا جن کے ذکر کا یہ محل نہیں۔ عربی زبان کے قصیدوں میں جو قصیدے کے شروع میں عشقیہ اشعار ہوتے ہیں جن کو نسیب یا تشبیب کہتے ہیں غزل کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔ فارسی شاعر رودکی نے قصیدے کے اشعار کو جداگانہ لکھ کر انھیں غزل کا نام دیا۔ اسی لیے وہ غزل کا بادا آدم مانا جاتا ہے۔ جہاں تک غزل کے نام کا تعلق ہے یہ وہ نظم ہے جس میں حسن و عشق کے خیالات اور معاملات کو تغزل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جس کو ہم آگے واضح طور پر بیان کریں گے۔ غزل کے عام معنی محبوب یا عورتوں سے بات چیت ہے یعنی جب صنف نازک سے عشقیہ گفتگو ہوگی تو اس کی زبان دلکش، دلربا، سوز و گداز سے لبریز دھیمے لہجے میں نرم الفاظ کے ساتھ تعریف، تجلیل، ناز و نیاز اور شکوہ و شکایت کے ساتھ ہوگی چناں چہ یہ تمام عناصر ہم کو عشقیہ غزل میں نظر آتے ہیں جب کہ آج کل کی غزل میں تصوف، فلسفہ، پند و وعظ، سیاست، صحافت، سائنس، منطق وغیرہ وغیرہ سب کچھ موجود ہے یہاں غزل کی وسعت کے ساتھ ساتھ اس کی توصیف و تعریف میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

غزل کے نام کے سلسلے میں اس کی نغمگی اور غنائیت کو بھی دخل ہے، یہ بھی مشہور ہے کہ اس نظم کو اس لیے بھی غزل کہتے ہیں کہ اس میں درد کا آہنگ پوشیدہ ہے، جب ہرن یا غزال زخمی یا خوف زدہ ہو کر جھاڑیوں میں چھپ جاتا ہے تو وہ ایک درد بھری آواز نکالتا ہے۔ غزال کی اس آواز کو عاشق کی فریاد میں محسوس کر سکتے ہیں جسے غزل کہتے ہیں۔

غزل کے نام کی توجیہات کچھ بھی ہوں وہ ایک ایسی صنف شاعری ہے جو تمام اصنافِ شاعری میں مقبول تر ہے۔ غزل ایک ایسی توانا اور عمدہ نظم ہے جس کا ایک مخصوص فارم یا ہیئت ہے اور اس میں خیال کی بوقلمونی کے ساتھ زبان و بیان کے اداب اور خصوصیات بھی ہیں۔ غزل رباعی کی طرح ایک کثر صنف ہے لیکن یہاں بحر کی قید نہیں اگر چہ نوے فیصد اُردو غزلیات پانچ چھ بحروں میں تخلیق کی جاتی ہیں۔

صدیوں سے غزل کی ہیئت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہی پہلا شعر جس کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے مطلع کہلاتا ہے اور غزل کا آخری شعر جس میں شاعر تخلص رقم کرتا ہے مقطع ہوتا ہے۔ اگر غزل میں ردیف ہو جو ایرانیوں کی ایجاد ہے تو اُسے مردف کہتے ہیں۔ بعض غزلیں صرف قافیے پر تمام ہوتی ہیں۔

غزل کا ہر شعر اکائی اور منفرد ہوتا ہے مگر اگر کسی عمدہ غزل گو شاعر کی غزل کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ "تمام غزل کے منتشر اشعار میں ایک چھپی ہوئی وحدت ہے جو غزل کے مختلف اشعار میں کسی ترتیب سے یا بغیر ترتیب کے ظاہر ہو رہی ہے اس لیے فراقؔ نے کہا تھا کہ "غزل کے یہ بکھرے ہوئے اشعار بھی اپنے اندر ایک خاص تسلسل اور کیفیت رکھتے ہیں جس کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔"

یہ بھی ضروری نہیں کہ غزل کا ہر شعر علاحدہ اور اکائی کی حیثیت رکھتا ہو۔ اگر دو تین شعر ایسے جڑے ہوئے جو ایک ہی موضوع یا مطلب کو پیش کر رہے ہوں تو غزل میں "ق" لکھ کر قطعہ بند کی صورت میں پیش کر سکتے ہیں۔ بعض شعرا نے "غزل مسلسل" بھی لکھی ہے۔ مابعد جدیدیت یعنی جدیدیت کے بعد کچھ شاعروں نے نئے ہیئتی تجربات بھی کیے ہیں جن میں بعض نے ہندی کے چھند کو اُردو بحر سے ملا کر غزل کہی، بعض نے قوافی سے بغاوت کی اور ایسی غزلوں کو اینٹی غزل کہا گیا، اگر چہ اینٹی غزل لکھنے والے شاعروں کی تعداد محدود تھی جن کی فہرست میں مظہرؔ امام اور عادلؔ منصوری کے نام سر فہرست ہیں۔ جہاں تک اُردو کی سنگلاخ بحروں میں شعر گوئی کا تعلق ہے یہ تجربات بیش تر غزل گو استاد شاعروں نے اپنی استادی کے جوہر دکھانے کے لیے کیے ہیں اور یہ سلسلہ دکھنی شعرا کے بعد انشاءاللہ خان سے ہوتا ہوا بعض اوقات اِدھر اُدھر ادب میں دکھائی دیتا ہے۔

غزل کی تکنیک کے ساتھ اس کی زبان اور بیان کا اختصاص بھی بہت ضروری ہے۔ غزل میں داخلیت کا ہونا ضروری ہے یعنی وارداتِ قلبیہ شاعر کے دل کو متاثر کرتے ہیں اور دل جو آماج گاہِ جذبات ہے جذبے کو مہمیز کر کے شعر میں تغزل کی بدولت جذبات کو بھر دیتا ہے جس کی وجہ سے شاعر خود اپنی طرح پڑھنے والے کو متاثر کر دیتا ہے جو ایک اچھی غزل کی شناخت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ صرف داخلیت شعر گوئی کے لیے کافی نہیں، یہ داخلیت ہے جو خارجیت کو درک کر کے تجربات کے الاؤ میں پکا کر داخلیت کے ساتھ ملا کر ایک عمدہ غزل کے شعر کی تعمیر کرتی ہے۔

داخلیت کے ساتھ دوسری اہم اور لازم چیز شعر میں ایمائیت یا اشارات ہیں جو رمزِ شعر ہیں۔ یہاں گفتگو پیکروں علامتوں اور اشاروں میں ابہام اور ایہام سے جوڑ توڑ کر کے کی جاتی ہے جو اچھی غزل کی شناخت ہے۔ یہاں شاعر نادر تشبیہات، اشارات، علامات اور محاسن علم بیان اور بعض اوقات صنائع اور بدائع زبان سے بھی استفادہ کرتا ہے۔

غزل کے خمیر میں اختصار ضروری ہے۔ غزل کا ایک شعر بعض اوقات پوری نظم کا نچوڑ ہوتا ہے اور اس اختصار نے غزل کو ہمیشہ کے لیے نظم پر فوقیت دی ہے۔ مثال کے طور پر فیض احمد فیضؔ کی غزل کا ایک شعر پیش کیا جا سکتا ہے جس میں فیضؔ پر عائد کردہ راولپنڈی سازش کیس پر روشنی پڑتی ہے کہ اس معاملہ میں کوئی سازش تھی بلکہ یہ خود سازش کہنے والوں کی سازش تھی

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بڑی ناگوار گزری ہے

چناں چہ اصنافِ شاعری میں غزل کا حسن اس کے اختصار، اس کے ابہام اور اس کی لوچ و لچک میں بھی ہے۔ غزل میں ہر قسم کے مطالب کی جگہ موجود ہے لیکن یہاں اشاروں میں گفتگو ہوتی ہے۔ اسی لیے غزل کو پسند بھی کیا جاتا ہے کہ یہاں ایمائیت کی کارفرمائی ہے جو آرٹ کی جان بھی ہے۔

غزل اردو شاعری کی وہ صنف ہے جس میں غنائیت بھری ہوئی ہے۔ یونانیوں نے موسیقی سے لبریز شاعری کو لرک (lyric) کہا ہے۔ غزل جو عربی قصیدوں کی تشبیب سے ہو کر فارسی گلزار سے گزر کر اردو میں آئی تو وہ غنائیت کے لیے ہمراہ احساسات اور جذبات کی لفظوں میں کھینچی تصویر بن کر ظاہر ہوئی۔ چناں چہ اس کے لیے غنائی بحریں چنی گئیں، مخصوص الفاظ انتخاب کیے گئے تاکہ ساز و آواز کے ساتھ خیال و بیان کو جذبے میں گھول کر اور خلوص کے الاؤ میں پکا کر جب خارجی واقعات کو تجربے کی بھٹی میں پکا کر صفحۂ قرطاس پر انڈیلیں تو یادگاری اشعار ابھرنے لگیں۔ پس غزل کا یہ تحفہ خالص فطری شاعر کو الہامی قوت عطا کرتا ہے۔

غزل کی بحروں کو انتخاب کرتے وقت شاعر ان کی نغمگی کا خاص خیال رکھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مصرعوں میں جو الفاظ انتخاب کرتا ہے ان الفاظ کی غنائیت کا بھی لحاظ رکھتے ہوئے ان کو مصرعوں میں پروتا ہے تاکہ معنی اور مطلب غنائیت سے پُر تاثیر ہو جائے لیکن اتنی بھی نغمگی نہ بڑھ جائے کہ معنی دب جائیں اور غزل گیت بن جائے۔

غزل بخصوص عشقیہ غزل جو قدیم اور کلاسیک قدروں کی نمائندگی کرتی ہے آہ و نالے سے بھری ہے چناں چہ غزل کی اُردو شاعری میں سوز و گداز، درد و رنج کے مضامین کے آنسو اور داغ، غزل کے دفتر میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ دنیا میں خوشی کے مقابل غم زیادہ یا قہقہوں کی نسبت آنسوؤں کی شدت زیادہ

ہے۔غم گریہ اور آنسو تزکیۂ نفس کی دوا بھی جانے گئے ہیں۔درد و غم کا یہ مسئلہ عالمی نوعیت کا ہے۔یہ میٹھا درد ہر مقام اور ہر قوم میں پایا جاتا ہے اور درد ہوتے ہوئے بھی پسند کیا گیا ہے۔شیلے کہتا ہے کہ" ہمارے میٹھے نغمے وہ ہیں جو درد و غم کے خیالات سے بھرے ہوں۔

"Our Sweetest Songs are Those that tell the saddest thought."

آج کے اس قحط الرجال اور قحط الکمال دور میں اچھی غزل کے نمونوں کی کمی کا احساس شدید ہے۔اگر چہ غزل گو شاعروں کی کمی نہیں۔غزل کہنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔آسان طریقہ غزل کہنے کا حالیؔ کے فارمولے پر ہوگا جو انھوں نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں پیش کیا ہے۔جہاں مصرعہ لکھ کر قافیے کی مدد سے مضمون نظم کیا گیا ہو، چوں کہ وہ خیال قافیے کے تابع ہوگا اس لیے اس میں تازگی اور ندرت نہ ہوگی کیوں کہ خیال کی پیداوار ذہن کے معدن سے نہ ہو سکی۔سچ ہے......اچھی عمدہ غزل کہنا آسان نہیں اسی لیے یہ ہر غزل گو کی قسمت میں نہیں۔یہاں فکر کی بلندی اور غزل نگار کی جینئس کو دخل ہے کیونکہ غزل میں داخلیت یا وارداتِ قلبیہ کا عنصر خارجیت سے زیادہ ہوتا ہے اگر چہ خارجی عناصر بھی دل کے الاؤ میں پک کر عقل اور ذہن کی روشنی میں صفحۂ قرطاس پر ظاہر ہوتے ہیں۔جن میں ندرتِ خیال، حُسن بیان کے ساتھ اختصار، نغمگی، نرمی، سوز و گداز و درد کی کیفیت کے ہمراہ ایمائیت، رمزیت، علامات و اشاریت صرف دو مصرعوں میں ایسے سمودی جاتی ہے کہ دو مصرعے ایک نظم بن جاتے ہیں یعنی مطالب اس طرح سے ایک دوسرے میں پیوست اور شامل ہو جاتے ہیں اور کھلتے جاتے ہیں۔جیسے دو آئینوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھنے سے مناظر لامتناہی بن جاتے ہیں۔

قاسمؔ نے غزل کو "اِک چیز لچری بہ زبان دکنی تھی" کہا۔

حالیؔ نے جس کو بے وقت کا راگ کہا۔

ہو چکے حالیؔ غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

غالبؔ نے جس کی تنگ ظرفی کا گلہ کیا:

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

لیکن بعض نے خصومت کا برتاؤ کیا۔جیسے وحید الدین سلیمؔ نے غزل کو محض قافیہ پیمائی کہا جس میں حقیقی جذبات نہیں پائے جاتے۔جوشؔ ملیح آبادی نے غیر فطری شاعری کا نمونہ بتایا۔

محمد یحییٰ تنہاؔ اور عظمتؔ اللہ خان نے اِسے لائق گردن زدنی قرار دیا۔

کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنف کہہ کر اردو تہذیب کا ننگ بتایا۔

لیکن ان تمام گفت وشنید کے باوجود وہی غزل اردو شاعری کی آن، بان، جان اور پہچان ہے۔ اردو کے چار بڑے شاعروں میں میرؔ اور غالبؔ غزل کے شاعر ہیں۔ انیسؔ مرثیہ اور اقبالؔ نظم کے ظاہری شاعر تو ہیں، لیکن ان کی شاعری کی قدر و قیمت ادبی نکتہ نظر سے اس تغزل پر مبنی ہے جو مرثیوں اور نظموں میں نہاں اور عیاں ہے اور یہی تغزل ہے جو غزل کا ماذہ بھی ہے، غزل کا مبدا بھی ہے، غزل کا مضمون اور مقصد بھی۔

غزل میں گنجائش بہت ہے، یہ اور بات ہے کہ غالبؔ جیسے نابغہ روزگار کے لیے کچھ اور بھی چاہیے وگرنہ:

غزل اور تنگ دامانی کا شکوہ
سلیقہ ہو تو گنجائش بہت ہے

غزل میں غم اور شادی، ماتم اور شہنائی، فلسفہ اور زندگی سب کچھ سما سکتا ہے، بشرطیکہ وہ ظاہری اور خام نہ ہو بلکہ دل کے آتش کدوں میں پک کر آئے، بہ قول فراقؔ گورکھپوری: "غزل کے لیے کوئی موضوع یا مضمون ثمر ممنوع نہیں، البتہ ہر ثمر خام غزل کے لیے ثمر ممنوع ہے۔ غزل کو کسی بھی زاویے سے دیکھ کر اپنے زاویہ خیال میں ناپ سکتے ہیں۔ اصغرؔ گونڈوی کو اگر غزل کے شرر میں صرف نشاط و مسرت کی روشنی دکھائی دیتی ہے، تو عزیزؔ لکھنوی کو وہ گردشِ زمانہ کا ایسا حلقہ معلوم ہوتا ہے جس میں صرف ماتم نشینوں کی پاکوبی کی آواز سنائی دیتی ہے۔

غزل کیا اک شرارِ معنوی، گردش میں ہے اصغرؔ
یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اصغرؔ اس پر نازاں ہیں کہ انھوں نے غزل کو نکھار، متانت وقار اور نغمگی سے سرشار کر دیا

نکھار اپنا کچھ کھو چکی تھی غزل
پہ اصغرؔ نے اس کو جواں کر دیا
متانت وقار اس میں پیدا کیا
نئی نغمگی سے اُسے بھر دیا

جذباتیت سے کام لیتے ہوئے تمام قدیم شاعری اور بخصوص غزل کو بے کار اور بے سود بلکہ قوم کی فکر و عمل کے لیے مضر جان کر جو غزل کے خلاف بیسویں صدی کے اوائل میں اس کے خلاف اعلان جہاد کیا گیا وہ اردو شعریت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔ غزل چوں کہ توانا روایت تھی، ان جھونکوں سے متاثر تو ہوئی لیکن جڑوں میں مضبوط جڑی رہی۔ بیسویں صدی میں اردو نظم کا فروغ عالمی ادب بخصوص مغربی ممالک یعنی برٹش مملکت اور انگلش شعرا کی بدولت ہوا جو ایک خوش آئند بات رہی لیکن اس کے ساتھ ہی غزل کے ایوان کو مسمار کرنے کی جو مہم چلائی گئی وہ منطقی یا عقلی نہ تھی بلکہ جذباتیت سے لبریز تھی جب کہ ضرورت اس بات کی تھی کہ عقل کی روشنی میں جذباتیت سے ہٹ کر ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور و خوض کیا جاتا۔ غزل کی بنیاد عشق و محبت پر رکھی گئی ہے جس کا مبدا واردات اور جذبات ہیں، چناں چہ عشق و محبت قدیم اور کہنہ ہوتے ہوئے بھی فرسودہ اور بے کار نہیں ہو سکتے۔ کہتے ہیں مچھلی جب بھی پانی سے پکڑی جائے گی تازہ ہی رہے گی۔ اسی لیے جرمن شاعر "ہین" کہتا ہے۔ "عشق و محبت اگر چہ ایسی کہانی ہے جو پرانی ہو چکی ہے اس کے باوجود نئی معلوم ہوتی ہے۔"

اردو کی زندہ ترین روایت جو قدیم ترین بھی ہے، اردو غزل ہے۔ اردو غزل نے کئی صدیوں میں عروج و زوال کے منظر دیکھے، نشیب و فراز کے مقامات دیکھے۔ کیوں کہ سخت جان ہونے کے ساتھ جانِ جاناں تھی اس لیے کبھی بے جان نہ ہوئی بلکہ زندہ رہی اور زندہ دلوں کی ہی نہیں بلکہ افسردہ اور قنوطیوں کے دل کی دھڑکن بھی بنی رہی۔ غزل کی تاریخ اور داستان لمبی ہے، جس کو ہم صرفِ نظر کرتے ہوئے اس عدالت کی کچہری میں آتے ہیں جس میں سرسید احمد خان کی سرپرستی میں مشہور غزل گو شاعر غالبؔ کے شاگرد حالیؔ نے غزل پر مقدمہ دائر کر دیا جس کی تفصیل "مقدمہ شعر و شاعری" میں ثبت ہے۔ اردو غزل کو تختۂ طعن اور تعریض کا نشانہ بنایا اور اسے عفونت میں سنڈاس سے بدتر بتایا اور فوراً اس میں ترمیم اور تبدیلی پر زور دیا۔

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر	عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
بڑا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے	عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے	مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے	جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے!

پہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے "خس کم جہاں پاک" سارے

اگرچہ اس استثنا کا کوئی خاص اثر اس دور کے حالیؔ کے ہم عصر عظیم شعرا داغؔ، اکبرؔ، امیرؔ، مجروحؔ اور تسلیمؔ وغیرہ پر نہیں پڑا، جنھوں نے اسے نالۂ مرغِ چمن غزب سمجھ کر توجہ نہ کی لیکن اقبالؔ، حسرتؔ، فانیؔ، شادؔ اور نجمؔ نے

اس کا خاص اثر لیا، بخصوص علامہ اقبالؔ نے اس کو اپنی غزل کا جوہر قرار دیا۔ اقبالؔ کی اولین غزل داغ کی پیروی میں نظر آتی ہیں جس میں عشق و جذبات کو زبان اور بیان کے رس میں گھول کر پیش کیا گیا ہے

اقبالؔ، لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

لیکن بہت جلد ہی اقبالؔ کا رنگ بدل گیا، یہاں تک کہ جن غزلوں کو وہ مستحسن سمجھ رہے تھے۔ اپنے کلام بانگ درا میں جگہ بھی نہ دی ہے اب اقبالؔ حقیقت منتظر کو لباسِ مجاز میں دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

رسالہ "نگار" ۱۹۶۵ء جدید شاعری نمبر میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اقبالؔ کی غزل گوئی پر ریویو کرتے ہوئے لکھا ہے: "اقبالؔ کی غزلوں میں وہ باتیں نہیں ملتیں جو اردو غزل میں بہت مقبول تھیں، مثلاً رشک و رقابت، فراق و وصال، جسم و جمال کا ذکر، صنائع و بدائع اور زبان کی نمائش، جن کے بغیر غزل، غزل نہیں سمجھی جاتی تھی اور جن کو ہمارے بیشتر شعرا اپنا اور اپنے کلام کا بڑا امتیاز سمجھتے تھے۔ اقبالؔ نے اپنی غزلوں میں عام غزل گو شعرا کی طرح نہ زبان رکھی، نہ موضوع، نہ لہجہ، بلکہ ایسی زبان، موضوع اور لہجہ اختیار کیا جن کا غزل سے کوئی ایسا رشتہ نہ تھا، اس کے باوجود ان کی غزلوں میں تنوع و تاثیر، شیرینی اور شائستگی، نزاکت و نغمگی کے علاوہ جو اچھی غزل کے لوازم ہیں وہ دلبری اور قاہری ملتی ہے۔ اقبالؔ کی غزلوں کے سامنے ہم بے ادب یا بے تکلف ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے۔"

حالیؔ کا مشورہ غزل اور فرسودہ اردو شاعری کے بارے میں عمدہ نظریہ تھا جس کی مخالفت جذباتی طور پر کی گئی۔

"مقدمہ شعر و شاعری" میں حالیؔ غزل کے بارے کہتے ہیں: "غزل کی حالت فی زمانہ نہایت ابتر ہے۔" یعنی حالیؔ جو قوم کی اصلاح بھی پیش نظر رکھتے ہیں بتاتے ہیں کہ اگر شاعری کی اصلاح کی جائے تو قوم اس کے مضر اور منفی اثرات سے محفوظ رہ سکتی ہے اور اگر غزل کو اصلاحی مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ قوم کے لیے فائدہ بخش بھی ہو سکتی ہے۔ حالیؔ مزید غزل پر گفتگو کرتے ہوئے بتاتے ہیں:-

"عام طور پر یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اس کی بنا عشقیہ مضامین پر رکھی جائے۔ اس لزوم کی وجہ سے اکثر شاعر محض تقلیداً عاشقانہ غزل لکھتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پڑھنے والے پر اس کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا لیکن غزل سے اگر عشقیہ مضامین خارج کر دیے جائیں تو وہ

اپنی مقبولیت کھو بیٹھے گی۔"

جدید غزل کی شناخت اور اس کی قدریں برصغیر میں تحریک آزادی اور انگریزوں کی حکومت کے خلاف بلند ہونے والی آواز تھی۔ اس میں جذبہ، حوصلہ اور سوز و گداز شامل تھا جو تقسیم ہند کے بعد ایک خاص قسم کے اضطراب سے دو چار ہوئی ترقی پسند شاعروں کو مایوسی اور افسردگی کا سامنا کرنا پڑا، جو ان کی نظم اور غزل میں آشکار ہے۔ چناں چہ شاعر نے کہہ بھی دیا۔ ع "وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں" ایک اہم اضافہ غزل کے اسٹیج پر جوان شاعروں کا بھی تھا جو قدیم ڈگر کو پسند نہیں کرتے تھے اور ہر ہر قدم پر انھیں ٹھکرا دیتے تھے۔ ایسے پر آشوب اور پر شباب ماحول میں روایتی غزل کے زیور بھی بے قدر اور کم قیمت سمجھے جا رہے تھے اور مخالفین غزل کی بانسری کی بظاہر پُر درد آواز کو اردو غزل کے مقابلے کا علاج سمجھ رہے تھے چناں چہ اسی کشمکش میں غزل کے پریشان گیسو کو سنوارنے کی کوشش جاری رہی تھی اور چند اہم تبدیلیاں غزل کے کریکٹرس عاشق و حسن میں نمایاں طرح سے ظاہر ہوئیں جن کو ہم اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

ا : جدید عشقیہ غزل آج بھی غزل کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ یہاں عاشق پسماندہ، رونے اور گڑگڑا کر محبت کا بھکاری نہیں بلکہ وہ پر وقار محبت سے بھرا ہوا فرد ہے جو سماجی سطح پر معشوق کا ہم پلہ ہے چناں چہ رحم و کرم و التجا کی جگہ سلیقہ، متانت، عزت و دلکشی کا بیان ہے جس کے لیے مناسب الفاظ بھی منتخب کیے گئے ہیں۔

ب : جدید عشقیہ غزل میں اگر چہ حسن و عشق کے معاملات ہی کو اہمیت اور مرکزیت حاصل ہے لیکن یہاں غم جاناں کے ساتھ غم دوراں، یعنی محبت کے ساتھ زندگی کے مسائل کا ذکر بھی شامل ہے۔ یہاں صرف ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی نہیں بلکہ یہاں ادب برائے ہدف ہے اور جدیدیت کے شاعر کا ہدف حسن و عشق کے ساتھ زندگی بھی ہے۔

ج : جدید عشقیہ غزل میں مجنوں کے جنوں کی پیروی نہیں اور نہ کسی کوہ قاف کی پری کا حسن درکار ہے بلکہ اسی دور کے عاشق اور معشوق لڑکے لڑکیاں ہیں جو دل کے جذبات کا سودا عقل و شعور کے ساتھ کرتے ہیں اس لیے مبالغے کی ملامت سے دور ہیں۔ یہاں جنسی معاملات کی تشہیر میں امرد پرستی یا کوٹھے کی طوائف نہیں۔ یہاں بناوٹ نہیں سچائی اور صداقت کا اظہار ہے۔

د : جدید عشقیہ غزل میں فرسودہ قدیم گھسے پٹے استعاروں اور علامتوں سے دوری کا احساس جگہ جگہ پر محسوس ہوتا ہے جس کی وجہ سے مضمون میں تازگی اور معاملات حسن و عشق میں نکھار آگیا ہے۔ ندرتِ بیان، الفاظ کو استعارے میں ڈھالنا، علامت نگاری، پیکر تراشی جو کچھ تھوڑی غزل لٹریچر کی دین ہے جدید

شاعری کی شناخت بھی ہے۔

ھ : جدید عشقیہ غزل میں نئے تجربات جو خارجیت کے بغیر صرف داخلیت کی دین ہے۔ یہاں رقیب کے گلے میں نہ جوتیوں کا ہار ہے اور نہ اس وابستہ حسن کی یادوں کا ذکر ہے اور نہ ہی دنیا ہے بلکہ عاشق کی پیچیدہ جدید نفسانی کیفیت ہے جو خود اس کی رقیب بن گئی ہے۔ اس جسمانی، روحانی اور نفسیاتی روز و شب کی وارداتوں نے حسن و عشق کے معاملات کے درمیان رقابت کی دیوار کھڑی کر دی ہے۔

و : جس طرح ہر فرد ایک اپنی ذات میں پوشیدہ کائنات رکھتا ہے جس طرح ہر شخص ایک نام دام اور خاص کام کا حامل ہوتا ہے جس طرح ہر شخص کا خاص چہرہ اور ایک خاص اندام اور خاص انداز ہوتا ہے اسی طرح ہر جدید و قدیم شاعر کا ایک خاص اسلوب ہوتا ہے اس لیے ان کو جماعتوں، مدرسوں اور دبستانوں میں تقسیم کر کے گفتگو نہیں ہو سکتی بلکہ ہر شاعر کا ذاتی اور پھر تقابلی مطالعہ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

ز : جدید عشقیہ شاعری میں تنہائی کے موضوعات کو شاعروں نے خوب برتا ہے لیکن بعض تنقید نگاروں کا یہ کہنا کہ یہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی غزل کی دین ہے صحیح نہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ یہاں قنوطیت کو دخل نہیں بلکہ رجائیت کا احساس ہے۔ اردو کی عشقیہ شاعری تنہائی کے موضوعات سے مخمل بنی ہوئی ہے لیکن یہ مخمل ہجر میں سجائی گئی ہے۔ شاید اس مسئلہ کی ایک وجہ چند رومانی مغربی شاعروں جیسے ورڈس ورتھ، کولرج اور کیٹس کے چند اشعار کا ترجمہ ہو۔ جو کئی مقامات پر نئی اور جدید اور جدیدی غزلوں کے بیان میں اکٹھا کیے گئے ہیں۔ فارسی کا مقولہ ہے، ہمسایہ کی مرغی قاز ہے۔"مرغ ہمسایہ قاز است" ہر قدر کو پردیس کے حوالے کرنا عدالت کے منافی ہے جس کا اثر ہم محسوس نہیں بلکہ بھگت رہے ہیں۔ کسی کا شعر ہے

وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا
عزت اُسے ملی جو وطن سے نکل گیا

ح : جدید غزل میں تصوف، فلسفہ وغیرہ کے اصطلاحات، تلمیحات، علامات اور اشارات قدیم مروجہ معانی سے ہٹ کر بیان کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے ذات اور کائنات کی معرفت میں رنگینی کے علاوہ گیرائی اور گہرائی کے مطالب سے شناسائی ہوئی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس گلزار کی عمدہ گل چینی اس معیار پر نہ ہو سکی جس کی وہ حقدار ہے۔ جود و شہود، ہجر و وصال، جبر و قدر، عقل و عشق، حیات و ممات، فلسفہ و منطق وغیرہ وغیرہ درجنوں ایسے مطالب ہیں جو نئی غزل کے ممنون ہیں۔

ط : غزل فارسی سے اردو میں آئی۔ تقریباً سات سو برس سے اس کی ہیئت وہی رہی، کسی بھی بحر میں کہی جا سکتی ہے۔ قافیہ، ردیف، مطلع، مقطع سب کچھ اسی طرز کا ہے اگرچہ کچھ تجربات سنگلاخ اور ادق بحروں

میں اساتذہ نے کیے، بعض مقامات پر "قطعہ بند" مسلسل غزل اور مستزاد غزلوں کے نمونے نظر آتے ہیں جو قدیم اور جدید دونوں غزلوں میں موجود ہیں، لیکن خاص طور سے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے دوران چند شعرا جن میں مظہرؔ امام سر فہرست ہیں جنھوں نے غزل کی ہیئت میں ردیف و قافیہ کی تبدیلی سے "Antigazal" اینٹی غزل کا ڈول ڈالا جس کی پذیرائی نہ ہوئی۔

فوق الذکر مطالب کے ساتھ ہم یہ بھی واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ قدیم روایتی اور جدید غزلوں کے فرق اور اضافات کسی بھی صورت میں روایتی غزل کی قیمت کو کم نہیں کرتے۔ ان جدید غزلوں کے فیض سے چوما چاٹی اور سطحی شاعری سے دوری ہوئی۔ اس طرح ڈیڑھ صدی گزرنے کے بعد بھی حالی کی اصلاحی گفتگو اردو غزل کی فکری بلندی اور برتری کی ضمانت کرتی ہے۔ یہاں یہ بھی تذکرہ لازمی ہے کہ بلند عشقیہ شاعری جس کی عمدہ مثالیں میرؔ اور غالبؔ کے پاس فراواں ہیں وہ صرف جمالیات اور جسمانیات تک محدود نہیں بلکہ اس عشقیہ شاعری کا رشتہ زندگی سے جڑا ہوا ہے اور یہ رشتہ ہی اسے بلندی عطا کرتا ہے۔ چناں چہ میرؔ اور غالبؔ کی شاعری میں زندگی کی شمولیت سے کائنات بھی سمٹ گئی ہے۔ یعنی ذات اور کائنات کے رشتے اور رموز ان میں نظر آتے ہیں جو ان کی شاعری کی آفاقیت کی وجہ بھی ہے۔ پس معلوم یہ ہوا کہ ترقی پسندی، زندگی کی قدریں، انسانیت اور حقوقِ انسانی جدید غزل ہی کی دین نہیں بلکہ قدیم ترین عظیم غزل کی شاعری میں بھی موجود ہے۔ اس لیے آج تک عشقیہ شاعری کے امام اور راہبر میر تقی میرؔ ہی ہیں جو خدائے سخن بھی ہیں اور غالبؔ اپنی معنی آفرینی، وژن اور ظرافت سے پیامبری کے درجے پر فائض ہیں۔

☆ بعض قدیم غزل، دکھنی غزل اور کلاسیک غزل میں جو حُسن وعشق کا رجحان اور تصور پایا جاتا ہے اس میں وہی فارسی کی عشقیہ غزل کی چھاپ نظر آتی ہے جہاں حُسن وعشق کے معاملات میں بناوٹ، نمائش، مبالغہ، رندی، مجنون کی بڑ، اساطیری یا مافوق الفطرت عناصر کا ذکر مجازی اور حقیقی عشق سے ملا کر ابہام اور ایہام کو تصوف کے ساغر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ قدیم حُسن وعشق کا رجحان اور تصور ترقی پسند غزل، یا 1950ء کے بعد کی جدید غزل یا 1970ء کے بعد کی مابعد جدیدیت کی غزل سے علاحدہ اور بہت مختلف بھی ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے ہی نظم کی پذیرائی کی بدولت اور غزل کے مصلح اور مخالفین کی گھن گرج نے غزل گو شعرا کو آگاہ کر دیا تھا، چناں چہ جب تقسیم ہند کے بعد ترقی پسند مصنفین کا گروہ بے نام ونشان ہونے لگا، ایسے ماحول میں جدیدیت اور ارباب ذوق نے غزل کا میدان اپنے ہاتھ لے لیا کیوں کہ انھیں زندگی بھی پیاری تھی اور انھیں حسن و عشق سے دلچسپی اور قلبی لگاؤ بھی تھا۔

سوال یہ ہے کہ روایتی غزل اور جدید غزل میں کیا فرق ہے جو ہم روایتی اور جدید غزل کی تعریفات کے

بعد بیان کریں گے۔ روایتی غزل سے مراد وہ غزل جس کا کلاسیک غزل سے رابطہ برقرار ہے اور اس میں ہر دور کی کچھ آہٹ اور ہر زمانے کی زبان کے ساتھ ہر شاعر کا منفرد طرز بیان بھی ہو۔ جدید غزل کبھی ترقی پسند مصنفین کے نظموں کی صدائے باز گشت بن کر ظاہر ہوئی کبھی تقسیم ہند کے بعد جدید غزل کا جامہ زیب تن کیا اور کبھی عبائے مابعد جدیدیت اوڑھ لی اور اس کے چند سال بعد آج کل کی عصری غزل کا دور بیسویں صدی کی آخری دہائیوں سے جاری وساری ہے۔

ہمارا مکان، زمان ہماری زندگی کے ساتھ تیزی سے بدل رہا ہے۔ موجودہ دور قدیم دور کی مسماری اور جدید دور کی تعمیری کاوشوں میں مصروف ہے۔ یہ شکست و ریخت کے علاوہ تزئین اور تشہیر کا دور ہے۔ یہاں جدید غزل میں تہذیب وتمدن کے ذیل صرف مثبت قدروں، مقصدی اور عملی پیمانوں اور عام فہم مسائل کا ذکر ہے جس میں سلاست ہو، ادقیت نہ ہو، جذبہ ہو جذباتیت نہ ہو، سادگی ہو مشکل مطالب نہ ہو، سچ ہو جھوٹ اور مبالغہ بازی نہ ہو تاکہ غزل میں قنوطیت اور رُلانے کے بجائے رجائیت اور بیداری کی تحریک ہو یعنی از خواب گراں خیز کی تلقین ہو۔

یوں تو غزل کے ادوار کو متقدمین، متوسطین اور متاخرین میں تقسیم کیا جاتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ غزل کے کئی دور ہیں جن میں غزل کے مختلف شعرا موجود ہیں اور یہ ادوار غزل کی زبان و بیان، غزل کے موضوعات اور غزل کی معنوی ترقی کا پتہ دیتے ہیں۔ جیسے دکنی شعرا کی غزل گوئی کا دور، ولیؔ، شاہ گلشن کا دور، میرؔ وسوداؔ سے پہلے اور ان کا دور، دردؔ اور سوزؔ کا دور، جرأتؔ، انشا اور مصحفیؔ کا دور، ناسخؔ و آتشؔ کا دور، غالبؔ، ذوقؔ ومومنؔ کا دور، امیرؔ و داغؔ وحالیؔ وتسلیم و جلال کا دور، شادؔ وعزیزؔ، صفی وثاقبؔ کا دور، ظفر، حسرتؔ، اصغرؔ، فانیؔ، شاد، نجم اور جگرؔ کا دور، یگانہؔ، اقبالؔ، سیمابؔ کا دور، فراقؔ وفیضؔ وناصرؔ کاظمی، خلیل الرحمان اعظمی، تابشؔ دہلوی، دلؔ، بیخودؔ دہلوی، سعیدؔ شہیدی، کلیم عاجزؔ، شادانؔ، رساؔ وغیرہ کا دور اور پھر ان شعرا سے اکیسویں صدی اور دورِ حاضرہ کے شعرا کا دور جیسے ظفر اقبالؔ، شہریارؔ، افتخار عارفؔ، فرازؔ، امجدؔ اسلام، پیرزادہ قاسمؔ، وسیمؔ بریلوی، عباس تابشؔ وغیرہ۔

روایتی غزل کی اصلاح اور اس میں مقصد اور عمل کی ضرورت کا احساس حالیؔ کے مقدمے سے شروع ہو چکا تھا۔ چناں چہ ادب برائے زندگی یا ادب برائے مقصد کا نعرہ 1936ء کے بعد کا نہ تھا۔ غزل کے اس تعمیری اور تجدیدی عبوری دور جس میں نظم کے ہوا خواہوں کے جارحانہ حملوں سے غزل کی توانائی میں ضعف پیدا ہو چکا تھا اور مزید نظم کے سیلاب سے جو ترقی پسند مصنفوں کی کثرت سے شدت اختیار کر رہا تھا۔ غزل کو جان کے لالے پڑ گئے تھے، پھر بھی ترقی پسند مصنفین کے دور میں غزل لکھی جاری تھی اور تقریباً 1950ء کے لگ بھگ تقسیم ہند اور اس سے پیدا شدہ انتشارات کی وجہ سے بڑی تعداد غزل کے حامیوں کی نظر آنے لگی اور پھر 1970ء کے بعد

مابعد جدیدیت غزل کے مفید اثرات اور کچھ اجتہادی کاوشیں نظر آئیں جس میں بحروں قافیوں اور ایمائی غزل وغیرہ کا شور محدود ہو کر رہ گیا۔ عمدہ بات یہ ہوئی کہ جدید اور مابعد جدیدیت کی غزلوں کا رشتہ روایتی غزل اور قدیم توانا اسالیب کے ساتھ ترقی کرتا گیا اور جو قدیم کہنہ مشق اساتذہ موجود تھے ان کا اشرواد اور سہارا ان کو ملتا رہا، چناں چہ داغؔ، امیرؔ، جلالؔ، تسلیمؔ، مجروحؔ، رشیدؔ، یگانہؔ، عزیزؔ، صفیؔ، ثاقبؔ، آسیؔ، شادؔ، اقبالؔ، آزادؔ، نیازؔ، اصغرؔ، فانیؔ، حسرتؔ، جگرؔ، سیمابؔ، چکبستؔ، سرورؔ جہاں آبادی کے بعد فراقؔ، فیضؔ، مصطفیٰ زیدی، جذبیؔ، خلیل الرحمان اعظمی، مجازؔ، جاں نثار اخترؔ، مجروحؔ، حسن نعیمؔ، عادل منصوری، مخدومؔ، سلام مچھلی شہری، ظفر اقبال ظفرؔ، پرویزؔ شاہدی، وحیدؔ اختر، ناصرؔ کاظمی، مجید امجدؔ وغیرہ وغیرہ درجنوں شعرا غزل کے گلشن کی تزئین کرتے رہے۔

اگر امیر خسروؔ سے اردو غزل کی عمر شمار کی جائے تو تقریباً سات سو سال ہوتی ہے اور اگر غزنوی دور کے لاہور کے شاعر سلمان سعدؔ کو نظر میں رکھا جائے تو یہ عمر ایک ہزار سال بھی ہو سکتی ہے جو اس دور کی قدیم بھاشا کھڑی بولی ہندوی وغیرہ ہوگی، جیسا کہ مشہور سلمان سعدؔ نے تین دیوان تخلیق کیے عربی فارسی اور ہندوی۔ اب ہمارے پاس صرف فارسی دیوان موجود ہے جس میں غزلیں ہیں، اس لیے یہ خدشہ مُحکم تر ہو جاتا ہے کہ شاعر نے اس صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہو۔ ہم اس غزل کے سفر کے کچھ نکات اور کچھ شعرا کے نمونہ جات لکھ کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ غزل جو پہلے حسن و عشق کی داستان سناتی تھی اس میں تصوفی اقدار شامل ہونے لگے بالکل اسی طرح سے جیسا فارسی غزل میں ہوا جہاں غزل کا باوا آدم رودکیؔ نے قصیدے کے اشعار سے تمہیدی عشقیہ اشعار جس کو نسیب یا تشبیب کہتے ہیں اور جن میں قافیہ ہوتا ہے انھیں غزل کا نام دیا، چناں چہ اس صنف سخن کے لیے ایران کی زمین سازگار ہوئی۔ فارسی غزل ایسی پھولی پھلی کہ کسی دوسری زبان میں فارسی غزل کا جواب نہیں ملتا۔ رودکیؔ کے بعد یہ سلسلہ جاری و ساری رہا، جو درجنوں عمدہ غزل گویوں یعنی عنصریؔ، سنائیؔ، نظامیؔ، عطارؔ نیشاپوری، خسروؔ، سلمانؔ جیؔ، سعدیؔ، حافظؔ و جامیؔ، صائبؔ تبریزی وغیرہ سے ہوتا ہوا آج تک برقرار ہے۔

فارسی کے عظیم اور قدیم شاعر عنصریؔ نے رودکیؔ کی غزل کی استادی کا اعتراف کیا ہے۔

غزل رودکیؔ وار نیکو بود

غزل ہائے من رودکیؔ وار نیست

برصغیر میں بھی تقریباً غزل کا سفر اس نہج پر رہا اور فارسی غزل سلمان سعدؔ سے آج تک بھی جاری ہے۔ برصغیر کے دکنی فارسی شعرا جن میں ظہوریؔ سرخیل ہے اور عمدہ غزلوں کا خالق ہے جس کی استادی کے مرزا غالبؔ قائل ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی دربارِ مغلیہ اور تغلق، خلجی، ایک سے منسلک فارسی شعرا جن میں خسروؔ، فیضیؔ، حسنؔ، رحیمؔ خان خاناں، عرفیؔ، کلیمؔ، نظیریؔ، قدسیؔ، صائبؔ، حزیںؔ، بیدلؔ، جامیؔ، غالبؔ وغیرہ وغیرہ

نے فارسی غزل کی شمع جلائے رکھی۔ جہاں تک فارسی غزل ایران کا تعلق ہے۔ علامہ شبلی "شعر العجم" میں کہتے ہیں۔"غزل کی تحریک عشق و محبت کے جذبات سے ہوتی ہے۔ غزل کی ترقی کی منزل تصوف سے شروع ہوتی ہے۔ تصوف کا تعلق تمام تر واردات اور جذبات سے ہے اور اس کی تعلیم کی پہلی ابجد عشق و محبت ہے۔ تصوف کی ابتدا اگرچہ تیسری صدی کے آغاز سے ہوئی لیکن پانچویں صدی اس کے اوجِ شباب کا زمانہ ہے اور یہی زمانہ غزل کی ترقی کا پہلا نوروز ہے۔"

برصغیر میں فارسی غزل کو مغلیہ دور میں جو رونق نصیب ہوئی اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے یہاں بھی تصوف برائے شعر گفتن اور تصوف جان سخن گوئی کا ماحول رہا۔

غزل کے سفر میں خسروؔ سے آج تک کے شعرا کے اشعار تذکروں، رسالوں، اور ان کے شعری مجموعوں میں بکھرے پڑے ہیں جن سے مکمل طور پر استفادہ نہ ہوا۔

کیوں کہ شعر و ادب اور سماجی حالات ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں ان کو جدا نہیں کیا جاسکتا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو تاریخ لکھنے والوں نے شاعری کے حوالوں کو نظر انداز کیا۔ جس کی وجہ سے صحیح تاریخ مکمل طور پر لکھی نہ جاسکی۔ ہر دور کے شاعر نے اپنے زمانے کے لوگوں کے واقعات دربار اور دَربار کے حالات عوام اور خواص کے معاملات کو بیان کیا ہے۔

جہاں تک روایت کا تعلق ہے شعر و ادب میں ہر دور زمان اور ہر منطقہ و مقام پر کچھ نہ کچھ تبدیلیوں کا ہونا ناگزیر نہیں بلکہ ارتقا کے لیے ضروری بھی تھا کیوں کہ یہی زمانے کی ریت بھی ہے۔ بقول اقبالؔ ع "ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں۔" اُردو غزل کی روایت صدیوں سے رائج ہے اور اس کا مبدا فارسی غزل سے ہے، اردو شاعری میں غزل کے رواج ہی نے اس کا راج بھی سنبھالا ہے چناں چہ اس کی مقبولیت اور اس کی شناخت اور اہمیت سے اردو شاعری کی آن، بان، جان اور پہچان بھی ہے۔ حالیؔ کی مثبت غزل کی تعمیر اور تجدید، جس میں فرسودہ اور بے مقصد شاعری بخصوص غزل سے بے زاری اور دوری تھی۔ اس کے منطقی یا عقلی دلائل کو چھوڑ کر بعض افراد اور گروہوں نے جذباتی ہوکر اس کو رد کیا اور پیام سے زیادہ پیام بر کے خلاف ہو گئے۔ جس میں حسرتؔ موہانی کا اردوئے معلی اور سجاد حسین لکھنوی کا "اودھ پنچ" پیش پیش تھے۔"اودھ پنچ" کے سرورق پر کئی سال تک یہ شعر چھپتا رہا

ابتر ہمارے حملوں سے حالیؔ کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

حالیؔ جو دہلی کی تعریف اور اس کو وطن کی طرح چاہتے تھے وہ بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو کھلتا تھا

کیوں کہ وہ حالیؔ کو اہل دلی اور لکھنؤ نہیں مانتے تھے۔ وہ حالیؔ کو پانی پت کا ایک معمولی شاعر جانتے تھے

دلی دلی کیسی دلی پانی پت کی بھیگی بلی

جیسا کہ ہم نے غزل کے موضوعات کے سلسلے میں بتایا ہے کہ متقدمین، متوسطین اور اغلب متاخرین نے بھی غزل میں عشقیہ واردات کو نظم کیا ہے۔ بیسویں صدی کی غزل میں حالیؔ کی تجدید اور تعمیر سازی کے باعث جو جدید رجحانات پیدا ہوئے اور غزل کے خلاف جو معرکہ برپا ہوا تو کلاسیک غزل، ترقی پسند غزل، جدید غزل، مابعد جدید غزل اور اینٹی غزلیات میں عشقیہ اور ہر قسم کے موضوعات کا اظہار دکھائی دینے لگا۔ ذیل میں ہم چند غزل گو شعرا کے چند اشعار پیش کریں گے جن سے غزل کی بوقلمونی اور موضوعات کی رنگا رنگی ظاہر ہوگی۔ جہاں تک عشق کا مسئلہ ہے فارسی ہی کی بازگشت اردو میں بھی سنائی دیتی ہے۔ عراقیؔ نے کہا تھا: "سارے عالم کا دردِ دل جمع کر کے عشق کا نام دیا گیا ہے۔" عطار کہتا ہے: "عشق کی تفسیر بیان سے باہر ہے۔" مولانا رومؔ کہتے ہیں: "عشق تمام بیماریوں کا مسیحا ہے۔"

ب به عالم هرکجا درد دلی بود
بهم کردند و عشقش نام کردند (عراقیؔ)

ع عین شین وقاف را اندر کتب تفسیر نیست (عطار)

ب شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما
از طبیب جمله علت های ما (مولانا رومؔ)

خسروؔ : زحالِ مسکیں مکن تغافل ورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں، نہ لیہو کا ہے لگائے چھتیاں

کبیرؔ داس : ہمن ہے عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا
رہیں آزاد یا جگ سی ہمن دنیا سے یاری کیا

فراقؔ گورکھ پوری لکھتے ہیں: "یہ غزل کا مصرعہ جو کبیر داس سے منسوب ہے اگر اردو کی پہلی غزل کا ہے تو اردو غزل کا آغاز ہی تصوف سے ہوا ہے۔"

قلی قطبؔ شاہ : تج امولک نور تھے روشن جگت
عشق جھلکاراں دیا تا میرے خواب

ولیؔ دکنی : شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی کا کیا مجازی کا

بیدلؔ دہلوی : اگرچہ فارسی کے عالمگیری دور کے عظیم شاعر ہیں لیکن میر تقی میرؔ نے تذکرے میں ان کے دو اردو شعر لکھے ہیں

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخمِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پہ عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدلؔ کہاں ہے ہم میں

مرزا مظہرؔ جان جاناں: ان کے فارسی دیوان کا ذکر ملتا ہے۔ اردو غزل کا شعر یہ ہے

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

سراج الدین آرزوؔ : فارسی کے عمدہ شاعر تھے۔ میر تقی میرؔ تذکرے میں لکھتے ہیں : "فارسی کے عظیم شاعر تھے اپنی تفریح کے لیے کبھی کبھی ریختہ کے دو تین شعر کہہ کر اس بے وقعت اور بے اعتبار فن کو جسے ہم لوگوں نے اپنا رکھا ہے اہمیت اور اعتبار بخشا ہے۔ شعر تبرکاً درج کیے جاتے ہیں

جان تجھ پر کچھ اعتبار نہیں زندگانی کا کیا بھروسہ ہے

میخانہ بیچ جا کر شیشے تمام توڑے
زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے
چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

شاہؔ مبارک : بوسہ لبوں کا دینے کہا کہہ کے پھر گیا
پیالہ بھرا شراب کا افسوس گر گیا

سراج اورنگ آبادی : خبر تحیرِ عشق سُن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

نشۂ بے خودی نے عطا کیا مجھے وہ لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

میر تقی میرؔ : الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

گفتگو ریختہ میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے
سوداؔ : گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو اِدھر بھی
دردؔ : جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
جہاں تک اس کائنات کا تعلق ہے یہ کیسے وجود میں آئی اور کس طرح سے تمام ہوگی معلوم نہیں، بڑی کاوشیں ہوئیں۔ آخر میں معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد۔
ع اول و آخر ایں کتاب افتادہ است
شادؔ عظیم آبادی : سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا کی خبر
فانیؔ بدایونی تو اس درمیان پر بھی غالبؔ کی طرح شک کرتے ہیں ۔
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

غزل کے شاعروں میں نہ صرف موضوعاتی شاعری ہے بلکہ ہر شاعر کے ساتھ اس کا زمان اور مکان بھی، اس کی شاعری میں کا ہے عیاں اور کا ہے نہاں ہے جو درک کیا جا سکتا ہے۔ یوں تو اردو غزل کے کئی دبستاں مختلف ادوار میں نمایاں نظر آتے ہیں لیکن غزل میں شہرت دہلی اور لکھنؤ کی ہے۔ کہتے ہیں دہلی میں داخلیت اور مربوط جذبات درد اور شکست و ریخت زیادہ ہے جب کہ لکھنؤ میں خارجیت، عیش و عشرت، چوماچاٹی کی شاعری نمایاں ہے۔ اگر چہ ان توجیہات اور مسائل پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ابھی یہ موضوع تشنہ ہے۔ غزل کسی دور میں اور کہیں بھی لکھی جائے ہیئت کے اعتبار سے وہی ہوگی، مطالب اور زبان کے لحاظ سے کچھ جداگانہ ہوتے ہوئے بھی جدا نہ ہوگی۔ دلی کی شاعری کی آہ اور لکھنؤ کی نشاط خیز شاعری کی واہ میں جو حرف جداگانہ "و" ہے وہ دراصل آہ و آہ اتصال یا آہ واہ سے متصل ہے ہر جگہ درد و خوشی، کہیں کم کہیں زیادہ ہے۔ غزل مشترکہ قدر ہے جیسا کہ ان شعروں اور مصرعوں سے ظاہر ہے

غزل میں ذات بھی ہے اور کائنات بھی ہے
ہماری بات بھی ہے اور تمھاری بات بھی ہے

غزل روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سُنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

لیکن غزل کہیں بھی کسی دور میں کہی جائے وہ شاعر کا مقام تعین کرتی ہے

ع غزل اربابِ فن کی آزمائش ہے

اس کے باوجود دلّی اور لکھنؤ کی غزل میں فرق ضرور ہے اور ان کے اسباب جاننے کے لیے اس مقام اور اس دور کے سماجی، ملکی، تہذیبی، اقتصادی اور سیاسی حالات کا جاننا ضروری ہے۔ جو غزلیں دلّی کی مسلسل بربادی کے دور میں لکھی گئیں ان کی مماثلت لکھنؤ کی غدر 1857ء کے بعد کی غزلوں میں رواں دواں ہے پس معلوم ہوا کہ غزل کی داخلیت اور خارجیت اور ان کے عناوین ایک ایسا پیمانہ ہے جو معاشروں کے بدلتے اور مڑتے ہوئے دھاروں کا پتہ دیتے ہیں۔

لکھنؤ کی غزل غدر سے پہلے دلّی کی طرح سوز و گداز، درد و رنج، داخلیت اور جذبہ و سوز کی شاعری احساس و درد نہ تھی بلکہ خارجیت اور عیش مطرب کی تصویر تھی جو ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے۔

ناسخ : اے پری تو نے جو پہنی ہے سُنہری انگیا
آج آئی ہے نظر سونے کی چڑیا مجھ کو

ناسخ : کسی کے محرم آب رواں کی یاد آئی
حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا

آتش : بو سے بازی سے مری ہوتی ہے ایذا ان کو
منہ چھپانے میں جو ہوتے ہیں مہا سے پیدا

آتش : شب وصال میں کھولے قبائے یار کے بند
کمر سے کھول کے پٹکے ہم نے دے پٹکا

امانت : اٹھ گئے ساقین جاناں سے جو شب گل پائینچے
اک دو شاخہ نور کا محفل میں روشن ہوگیا

امیر مینائی : آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن بھی دکھاؤ صاحب
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

سوال یہ بھی تو ہے دنیا بھر کی عشقیہ شاعری کے مسائل توڑ موڑ کر انھی مطالب کی طرف رخ کرتے ہیں جو صنف نازک کے نازک خیالات سے مضبوط ہیں۔

بارگریو کہتا ہے۔عورت" دنیا کی شاعری" ہے بالکل اسی طرح جیسے تارے آسمان کی شاعری ہیں۔
لیکن اسی لکھنؤ سے ایسے بھی شاعر نکلے جو غم جاناں اور غم دوراں کے ساتھ ربط رکھے ہوئے تھے۔

مجاز لکھنوی : سچ تو یہ ہے مجاز کی دنیا
حسن اور عشق کے سوا کیا ہے
وہ عشق کا شاعر مجاز جو یہ کہتا تھا

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض سے گلاب اور زیادہ

وہ یہ بھی کہتا ہے۔

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

آتش لکھنوی : وہی ہے لوحِ شکستِ طلسمِ جسم آتش
جب اعتدال عناصر میں اختلال ہوا

نارائن چکبستؔ : زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

فانی بدایونی : مآلِ سوزِ غمِ ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

ب سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

ب اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

شادؔ عظیم آبادی : کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

یگانہؔ چنگیزی : مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

ب امید و بیم نے مارا مجھے دو راہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

ب کلام یاس سے دُنیا میں پھر ایک آگ لگی

یہ کون حضرت آتش کا ہمزباں نکلا

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا

خدا بنے تھے یگانہؔ مگر بنا نہ گیا

اقبالؔ : کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

کے ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تری جبین نیاز میں

یہاں ہم غزل کے چند اشعار جو اساتذۂ سخن کے ہیں اس لیے بھی پیش کر رہے ہیں کہ ان اشعار کا دور، مقام اور دنیاوی منصب علاحدہ علاحدہ ہے مگر پھر بھی عشقیہ شعروں میں تصوفی قدریں سماجی مسائل ہوں کہ مذہبی نکات، سیاست اور فلسفہ کی بھی جھلک ان اشعار میں موجود ہے۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی

کچھ ہماری خبر نہیں آتی

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

عشق کہتے ہیں جسے سب وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

زمانے کے ہاتھوں سے چارہ نہیں
زمانہ ہمارا تمہارا نہیں

اوپر دیے گئے غزل کے اشعار کے ساتھ ہم نے شاعروں کے نام نہیں دیے لیکن بیشتر قارئین غزل کے شعر سے شاعر کو پہچان گئے جو غزل کے شعر کی شناخت بھی ہے کہ وہ دل میں اتر کر ہمیشہ کے لیے حافظہ میں محفوظ رہ جاتا ہے۔ غزل کا بڑا شاعر وہ نہیں جو معروف اور مشہور ہو بلکہ وہ ہے جو غزل کے مزاج سے واقف ہو اور یہ مزاج کو اس وقت تک وہ مکمل طور پر نہیں جان سکتا جب تک!

تانہ بخشد خدائے بخشندہ
ایں سعادت بزورِ بازو نیست

یہی وجہ ہے کہ غزل صرف مشہور اور معروف عظیم شاعروں تک مخصوص نہیں۔ بعض شاہکار غزل کے اشعار کم معروف اور ایسے گمنام شاعروں کا سرمایہ ہیں جو شاعری کے دربار نشین نہیں بلکہ خاک نشین تھے جن کے شعر آج بھی نور کی قندیل ہیں۔

میر عماد دہلوی : وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

واقفؔ بٹالوی : تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

محسنؔ بھوپالی : نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

آقا روحی : زد پہ ہے تند ہواؤں کے کتابِ ہستی
کوئی اڑتے ہوئے اوراق پہ پتھر رکھ دے

ظہیر کاشمیری : ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

غزل کی گفتگو میں ہم داغ دہلوی کا تذکرہ اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ ایک ممتاز شاعر اور خاص صاحب طرز غزل گو تھے۔ اردو کہکشاں میں یوں تو کئی آفتاب و مہتاب کے علاوہ ستاروں اور سیاروں کی کمی نہیں لیکن کئی شعرا کے اسالیب منفرد ہوتے ہوئے انھی سے شروع اور انھی پر ختم بھی ہوئے۔ یہ داغ کے خاص اسلوب اور ان کی غزل کا تیکھا پن ہے جو کچھ حد تک ان کے شاگردوں میں جاری و ساری رہا۔ داغ کے کئی ہزار شاگرد تھے اور شاید ہی کوئی دوسرا شاعر ہو جس نے تمام عمر شاگردوں کو نہ صرف اپنی محفل مصاحبت میں جگہ دی بلکہ دل میں بٹھایا۔ داغ دہلوی دلی میں پیدا ہوئے اور حیدرآباد میں دفن ہوئے۔ اگر چہ داغ کی تمام تر شاعری انیسویں صدی میں لکھی گئی اور سراہی بھی گئی لیکن بیسویں صدی کے اوائل میں ان کی استادی کا ڈنکا برصغیر کے ہر کونے میں گونج رہا تھا۔ بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر محمد اقبالؔ ان کی شاگردی پر نازاں تھا۔

ے نسیمؔ و تشنہؔ ہی اقبالؔ کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخن داں پر

ے جناب داغ کی اقبالؔ یہ ساری کرامت ہے
ترے جیسے کو کر ڈالا سخن داں بھی سخن ور بھی

کیوں کہ امیرؔ مینائی کے بعد داغ کا انتقال ہوا۔ دونوں استاد شاعر اور دونوں حیدرآباد میں دفن ہوئے تو سرورؔ جہاں آبادی نے شخصی مرثیے میں کہا

داغ و امیرؔ کے لب اظہار بھیج دے
نطق فصیح و شوخی گفتار بھیج دے

تاجِ سخن کے گوہرِ شہوار بھیج دے
منگواتے ہیں نظام کی سرکار بھیج دے

ان موتیوں کو خاکِ دکن کیا کرے گی تو
کس پہ نثار یہ دُرِ یکتا کرے گی تو

داغ نہ صرف عمدہ غزل گو تھے بلکہ اردو شعر و ادب کے عاشقوں میں سے تھے اگر چہ دبستانِ دہلی کی نمائندگی بھی کرتے تھے اور لکھنؤ کے عمدہ شاعر امیر مینائی سے ان کی ان بان چلتی رہتی تھی۔

داغ : مستند اہل زباں خاص ہیں دلی والے
اس میں غیروں کا تصرف نہیں مانا جاتا

غیروں کا اختراع و تصرف غلط ہے داغ
اردو ہی وہ نہیں جو ہماری زباں نہیں

اس کا جواب امیر مینائی نے دیا

اردو کا ذکر لکھنؤ والوں کے سامنے
مشک ختن کا ذکر غزالوں کے سامنے

داغ خاص طنز و لطیف مزاح کے پیکر تھے۔ وہ سخن شناس اور سخن فہم تھے اور دوست دشمن جس کے کلام میں جان ہو دل کھول کر داد دیتے تھے۔

جب داغ رامپور کے نواب کی دعوت پر اصطبل کے داروغہ بن کر گئے تو رامپور کے کہنہ مشق شاعر "رسا" نے اصطبل کے دروازے پر یہ شعر چسپاں کر دیا

شہر دلی سے آیا اک مشکی
آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ نے کہا : "ہمارے کالے رنگ اور گھوڑے کی مشکی قسم کی رعایت سے جو ستم ظریفی کی گئی ہے بے اختیار داد دینے کو دل چاہا۔"

داغ کی غزل میں زبان کی صفائی، سادگی، شگفتگی اور بندش کی چستی ہے۔ داغ کا کلام صداقت سے لبریز ہے اور کلام میں بناوٹ نہیں۔ یہ داغ کی خوش نصیبی تھی کہ ان کی زندگی ہی میں ان کی غزلیں تمام ہندوستان میں پڑھی جاتی تھیں۔ اردو شعر و ادب پر ان کے اشعار جاودانہ ہیں۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

کہتے ہیں اسے زبان اردو
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

داغ کے عشقیہ کلام میں جو حسن کے اقرار کا والہانہ اظہار ہے وہ ان کے کلام کی پہچان بھی ہے۔

ـــ رخِ روشن کے آگے شمع دہ رکھ کر یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر آتا ہے پروانہ

ـــ کھل کھیلیے کھل جایئے دل کھول کے ملیے
کب تک گرہ بندِ قبا کو کوئی دیکھے

ـــ زلف برہم، عرق آلودہ جبیں، دامن چاک
کس کے آغوش سے تو جان چھڑا کر نکلا

ـــ دی مؤذن نے شبِ وصل اذاں پچھلی رات
ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آتا

ـــ کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں

یہ سچ ہے کہ غزل کو ٹکسالی یا محاورہ، روزمرہ اور فصیح بنانے میں داغ کا نام صفِ اوّل کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ داغ نے اپنے اشعار میں خود اپنی غزل کا ریویو کیا ہے۔

ـــ پسند آئے ہم کو بھی اشعارِ داغ
زباں پاک وشستہ بیاں صاف صاف

؎ اے داغ مقلد ہیں اسی طرز کے ہم بھی
ہر شعر میں ہو بلبلِ شیراز کا انداز

داغ کی غزل کے مصرعوں میں محاورات ایسے اچھے مقام اور تاثیر سے باندھے جاتے ہیں کہ وہ ضرب المثل بن جاتے ہیں۔

ع ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں
ع تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی
ع حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے
ع جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں
ع جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتا ہے

اردو غزل کی اس تحریر کے اخیر میں بیسویں صدی کی غزل کے ممتاز اور معروف شاعر رگھوپتی سہائے فراقؔ کا ذکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ علمائے شعر و ادب نے انھیں بیسویں صدی کی غزل کا امام، مسیحا اور محسن قرار دیا ہے جن کے اقتباسات ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ فراقؔ نے چوں کہ روایتی غزل سے رشتہ برقرار رکھتے ہوئے ترقی پسند دور کی غزلوں، جدید اور مابعد جدید غزلوں کا بھی ساتھ دیا اور غزل کی شاعری پر کئی پر مغز مضامین لکھے اور کارآمد مشوروں سے نوازا اور تنقید میں اپنی تصانیف سے غزل کے گلشن کو سنوارا۔ ہم ان کے شعری کلام سے جو رباعیوں، نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے صرف کچھ بطور نمونہ اشعار پیش کریں گے اس سے قبل ہم فراقؔ کی غزل پر مشاہیر شعر و ادب کے اقتباسات اور غزل کے مستقبل کے بارے میں ان کے خیالات بھی پیش کریں گے۔ فراقؔ نے خود کہا تھا۔

؎ ختم ہے مجھ پہ غزل گوئی دورِ حاضر
دینے والے نے وہ اندازِ سخن مجھ کو دیا

؎ تیری غزل تو نئی روح پھونک دیتی ہے
فراقؔ دیر سے چھوٹی ہوئی ہے نبضِ حیات

؎ میں نے اس آواز کو پالا ہے مرمر کے فراقؔ
آج جس کی نرم لو ہے شمعِ محرابِ حیات

ـ کار مرقع ساز نہیں فن شاعری
لیتا ہے لفظ لفظ غزل میں نیا جنم

ـ گونج اٹھے گلشن ہستی ترے نغموں سے فراقؔ
وہ غزل چھیڑ جسے سب کہیں گل بانگ حیات

ـ چھڑتے ہی غزل بڑھتے چلے رات کے سائے
آواز مری گیسوئے شب کھول رہی ہے

ـ تاریکیاں چمک گئیں آواز درد سے
میری غزل سے رات کی زلفیں سنور گئیں

نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

"دورِ حاضر اس میں شک نہیں کہ ترقی سخن کا دور ہے اور مغربی تعلیم نے ذہنیتِ انسانی کو اتنا وسیع و بلند کر دیا ہے کہ ہم کو ہر جگہ اچھے اچھے غزل گو نظر آرہے ہیں، لیکن اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ ان میں کتنے ایسے ہیں جن کے شاندار مستقبل کا پتہ ان کے حال سے چلتا ہے تو یہ فہرست بہت مختصر ہو جائے گی۔ اتنی مختصر کہ اگر مجھ سے کہا جائے کہ میں بلا تامل ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کروں تو میری زبان سے فوراً فراقؔ گورکھپوری کا نام نکل جائے گا۔"

جوش ملیح آبادی "یادوں کی برات" میں لکھتے ہیں: "آخر میں نہایت افسوس کے ساتھ، میں یہ کہوں گا کہ ہندوستان نے ابھی تک فراقؔ کی عظمت کو پہچانا نہیں ہے، سرکار ہند کو چاہیے کہ وہ ان کو سر آنکھوں پر جگہ دے اور ان کو، بہ ہمہ وجوہ، مطمئن کر کے اپنے دامن کو مزید پھولوں سے بھرے جو شخص یہ تسلیم نہیں کرتا کہ فراقؔ کی عظیم شخصیت، ہندوستان کے ماتھے کا ٹیکا، اردو زبان کی آبرو، اور شاعری کی مانگ کا صندل ہے، وہ خدا کی قسم، کور مادر زاد ہے۔ زندہ باد فراقؔ ۔۔۔۔۔ پائندہ باد فراقؔ

یگانہ چنگیزی: "فراقؔ کی شاعری حقیقی شاعری کی بہترین مثال ہے...... یہ میری زندگی کے آخری لمحات ہیں۔ دنیا سے جاتے ہوئے غزل کو فراقؔ کے ذمہ کیے جا رہا ہوں۔"

جگر مرادآبادی: "جب لوگ ہم لوگوں کو بھول جائیں گے اس وقت بھی فراقؔ کی یاد تازہ رہے گی۔"

سید اعجاز حسین: "جذبات نگاری میں دقتِ فکر کا عنصر شامل کر کے فراقؔ نہ صرف تاثیر کلام میں اضافہ

کر دیتے ہیں بلکہ اس میں معنویت بھی بلند نظر آتی ہے۔"

احتشام حسین: "کافر غزل" میں لکھتے ہیں: "ہم عام طور پر اپنے مطالعہ میں کلاسیکیت اور رومانیت دو متضاد یا متخالف قسمیں قرار دے کر اس طرح گفتگو کرتے ہیں گویا انھیں یکجا نہیں دیکھا جا سکتا...... کلاسیکیت میں روایت کے احترام کے ساتھ طریق فن اور ظاہری تراش خراش پر زور دیا جاتا ہے، رومانیت میں جذبہ اور تخیل کے وفور پر۔ لیکن حقیقت کیا ہے؟ تخلیقی عمل کی بھٹی میں یہ دونوں صورتیں مل کر ایک نیا پیکر اختیار کر لیتی ہیں۔ روایت کا تسلسل بھی باقی رہتا ہے اور ایک ایسا نیا پن بھی پیدا ہو جاتا ہے جو حقیقت کے معنوی احساس سے وجود میں آتا ہے۔ فراقؔ کی غزل میں یہ صورت بار بار نمایاں ہوتی ہے۔ فراقؔ نے زندگی کے اس شعور کی نفی نہیں کی ہے جو قدیم تھا اور اس شعور سے بدظن اور بیگانہ نہیں ہیں جو آج کا عہد ہر حساس طبیعت رکھنے والے کے لیے فراہم کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم نہ تو فراقؔ کی شاعری کو انقلابی کہہ سکتے ہیں اور نہ بندھی ٹکی روایتوں کی پیروی کرنے والی۔"

محمد حسن عسکری: -"فراقؔ کی شاعری میں عاشق کا کردار" میں لکھتے ہیں: "فراقؔ نے اردو شاعری کو ایک نیا عاشق دیا ہے اور اس طرح بالکل نیا معشوق بھی۔ اس نئے عاشق کی ایک بڑی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر ایک ایسا وقار پایا جاتا ہے جو اردو شاعری میں پہلے نظر نہیں آتا...... ان کی شاعری میں جذبہ اور خیال ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے ان کے شعور میں یہ دونوں عمل ساتھ ساتھ ہوتے ہیں اسی وجہ سے ان کی شاعری اتنی تہہ دار ہے کہ فراقؔ صاحب کبھی عوام میں مقبول نہیں ہو سکتے۔ یہ شاعری ابہام اور فصاحت دونوں کا امتزاج ہے۔"

سید محمد عقیل: -فراقؔ کی "بوطیقا" میں لکھتے ہیں: "فراقؔ نے اپنی شاعری کے لیے ہمیشہ جذبات کی نرم روی کے ساتھ الفاظ میں غنائیت، خواب آور فضا اور جذبات سے پھوٹتے ہوئے الفاظ تلاش کرنے کی فکر کی ہے۔ انھیں معصومیت، حقیقت اور بے ریا کیفیات کی الفاظ میں ہمیشہ تلاش رہی ہے کہ یہ تمام تلاش فطرت سے قریب لے جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ ناظر یا سامع شاعر کے ساتھ ان بلندیوں تک اٹھ سکے جہاں تک فراقؔ اسے لے جانا چاہتے ہیں ورنہ سارے محسوسات اور جذبات اور الفاظ کی Many Sidedness بالکل "مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر" والی کیفیت پیدا کرے گی۔"

اصغر گونڈوی: -"اردو شاعری میں آنے والی شخصیت فراقؔ کی شخصیت ہے۔ میں فراقؔ کو اردو کا ایک اہم ستون تسلیم کرتا ہوں۔"

گوپی چند نارنگ: -"کہاں کا درد بھرا تھا ترے فسانے میں" لکھتے ہیں: "فراقؔ گورکھپوری ہمارے عہد کے ان شاعروں میں سے تھے جو کبھی صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں حیات و کائنات کے بھید بھرے

سنگیت سے ہم آہنگ ہونے کی عجیب وغریب کیفیت تھی۔ اس میں ایک ایسا حسن، ایسا رس، اور ایسی لطافت تھی جو ہر شاعر کو نصیب نہیں ہوتی۔ فراقؔ نے نظمیں بھی کہیں اور رباعیاں بھی، لیکن وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ ہندوستانی لہجہ اردو شاعری میں پہلے بھی تھا، فراقؔ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے خدائے سخن میر تقی میرؔ کی شعری روایت کے حوالے سے ان کی بازیافت کی اور صدیوں کی آریائی روح سے ہم کلام ہو کر اسے تخلیق اظہار کی نئی سطح دی اور آج کے انسان کے دل کی دھڑکنوں کو اس میں سمو دیا۔"

ڈاکٹر فرمان فتح پوری:۔"فراقؔ ایک رجائی غزل گو" میں لکھتے ہیں : "عہد حاضر کا کوئی بھی سماجی یا سیاسی مسئلہ ایسا نہ ہوگا جسے فراقؔ نے غزل میں حل نہ کر دیا ہو۔ زندگی کی ہر کشمکش اور ہر لطافت جس سے کہ انسانیت دو چار ہوتی رہی ہے تغزل بن کر فراقؔ کی مجموعی غزلوں میں رچی ہوئی ہے۔ کیوں کہ فراقؔ کا محبوب انسان ہے اور وہ انسان کے غم وخوشی میں شریک رہنا چاہتا ہے۔ فراقؔ فردی محبت کا قائل ہے مگر اجتماعی مقصد ومحبت میں کسی مخصوص فرد یا ذات کو فراموش کر دیتا ہے۔ وہ غم دنیا کو ہمیشہ غم محبوب پر ترجیح دیتا ہے اور دنیا کے دکھ درد کو دیکھ کر اپنے دکھ کو بھول جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے

چپ ہوگئے ترے رونے والے
دنیا کا خیال آگیا ہے

اس طرح اپنے متعلق فراقؔ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے

یوں ہی فراقؔ نے عمر بسر کی
کچھ غم جاناں، کچھ غم دوراں"

فراقؔ اردو غزل کے مستقبل پر لکھتے ہیں:۔"میرا خیال ہے کہ ایک طرف تو آئندہ کی غزل میں سینکڑوں نئے عنوانوں سے حیات اور کائنات پر تبصرہ ہوگا اور دوسری طرف صوفیانہ، عاشقانہ اور عارفانہ غزل کے پرانے موضوعات آئندہ کی ذہنیت سے ہم آہنگ ہو کر نئے انداز سے غزل میں آئیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلسل نظمیں مختلف اصولوں سے اردو شاعری میں داخل ہو جائیں گی۔ اردو شاعری محض غزل پرستی تک محدود نہ رہے گی لیکن غزل جب قدیم لفظ پرستی اور سہل پسندی سے آگے بڑھ کر ایک نئی جذباتی اور داخلی زندگی کی ترجمانی کرے گی۔ تو اردو غزل ان نوا ہائے سرمدی سے حیات انسانی کو مرتعش کر دے گی جو ابھی پردہ ساز میں ہے، غزل کی چاہت، اس کا اختصار، اس کی نغمگی، اس کی مرکزیت، غزل کے روشن مستقبل کی خبر دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اب تک عالمگیر شہرت مسلسل نظموں کو ہوئی ہے مثلاً ہومرؔ، ورجلؔ، دانتےؔ، والمیکؔ، ویاسؔ اور فردوسیؔ کی نظموں کو۔ لیکن ہم یہ کیوں بھول جائیں کہ وید مقدس، انجیل اور قرآن پاک

کا اسلوب نظموں کی بہ نسبت غزلوں سے قریب ہے۔ مستقبل میں جس مقام پہ نظموں کی آواز ختم ہوگی اسی مقام سے غزل کے سرمدی نغمے شروع ہوں گے۔ بڑی بات ہمیشہ طویل اور مسلسل نہیں ہوتی اور جس طرح غزل بدل جائے گی اسی طرح لکھنے والوں اور سمجھنے والوں کا مذاق بھی لطیف اور بلند ہو جائے گا۔ غزل کا مستقبل اس سے زیادہ واضح طور پہ اگر ہم جاننے کی کوشش کریں گے تو ہماری حالت اس مؤذن کی سی ہوگی جو اذان دیتا ہوا ایک طرف کو بھاگا جا رہا تھا یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کی آواز کتنی دور پہنچی ہے۔"

تصوف اور فلسفہ میں، عشق و حسن کی شاعری میں، اور ٹھیٹھ زندگی کی شاعری میں پرانی انفرادیت کی جگہ ایک نئی انفرادیت اور اجتماعی زندگی کے پرانے احساس کی جگہ ایک نیا احساس آج کل کے غزل گو شعرا کو ہو رہا ہے۔ بہر حال واقعیت ہو یا حقیقت، ظاہری زندگی ہو یا معنوی مجہولیت ہو یا عملیت، اردو غزل میں ان میں سے ہر ایک کا نیا جنم ہو رہا ہے اور نئے رنگ و روپ سے نشو و نما ہو رہا ہے۔ رسمیت مٹ رہی ہے۔ سچی کاوش و تلاش اور زندگی کے نئے احساس اور وجدان اور جمالیات کی ایک نئی غرض و غایت کا پتہ موجودہ اردو غزل سے مل رہا ہے۔ سماجی اور سیاسی زندگی میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں، عقلیت اور وجدانیت میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں، نئی انسانیت کی جو اسپرٹ رونما ہو رہی ہے۔ کائنات اور حیات کے پرانے احساس جن عنوانوں سے نئے احساس بنتے جا رہے ہیں۔ سائنس، جدید سوشیالوجی، جدید فلسفہ، جدید فضا اور ماحول مغرب اور مشرق کا تصادم اور ان کا امتزاج جس طرح غزل میں رونما ہوا ہے اس کی نمایاں مثال اقبالؔ کی غزلیں ہیں اور یہ اثر "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" میں اتنا تیز نمایاں ہے کہ اقبالؔ کی غزلیں اردو شاعری میں انقلاب کا حکم رکھتی ہیں اور یوں تو دورِ حاضر کی غزلوں میں روح اور مزاج اس قدر بدلے ہوئے ہیں کہ فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ یہ غزلیں آج کی ہیں کل کی نہیں۔ آئندہ کی غزلوں میں یہ ضروری نہیں کہ اقبالؔ یا کسی اور بڑے شاعر کی اندھی تقلید ہو لیکن اثر ان کا ضرور رہے گا اور قوتِ ارادی کے ساتھ جذبات کا ایک ایسا حیرت انگیز اتحاد ہوگا کہ آج ہم اس کا پورا اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ آئندہ کی غزل میں جذبات نہ ہوں گے یا معاملہ بندی نہ ہوگی یا غزل مجلسی چیز ہونے کے بجائے عملی چیز بن جائے گی، میرا خیال ہے کہ ایک طرف تو آئندہ کی غزل میں سینکڑوں نئے عنوانوں سے حیات اور کائنات پر تبصرہ ہوگا اور دوسری طرف صوفیانہ، عاشقانہ اور عارفانہ غزل کے پرانے موضوعات آئندہ کی ذہنیت سے ہم آہنگ ہو کر نئے انداز سے غزل میں آئیں گے۔

☆☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار (استنبول؛ ترکی)

ترکی اور پاکستان کے ادبی روابط

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ترکی اور پاکستان کے تعلقات صدیوں پر محیط ہیں۔ بے شک پاکستان ۱۹۴۷ میں معرضِ وجود میں آیا اور اسی سال ترکی اور پاکستان کے سفارتی روابط کا آغاز ہوا مگر پاکستان اور ترکی کے لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے موجود دوستی اور برادری کے تعلقات جو ہیں، وہ ملکوں اور سرحدوں کی پابندی سے برتر اور قدیم تر ہیں۔ بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں ملکوں کے لوگوں کے تعلقات اس وقت شروع ہوئے جب پہلے ترک نے برصغیر میں قدم رکھا۔ بالخصوص محمود غزنوی کی فتوحات کے ہمراہ ترکی قبائل کے کچھ حصے وارد ہندوستان ہوئے اور کچھ عرصے بعد بالخصوص سلجوقی سلطنت کے قیام کے ساتھ ان قبائل کے کچھ دیگر حصے عازمِ ایران اور ایشیائے کوچک یعنی موجودہ ترکی ہو گئے۔ الغرض کچھ رشتہ دار اُدھر پاکستان میں رہے اور کچھ رشتہ دار ترکی روانہ ہوئے۔

اس طرح ترکی اور پاکستان کے سفارتی روابط کے آغاز سے صدیوں پہلے اس خطۂ زمین سے ترکی النسل لوگوں کی آمد ہوئی۔ محمود غزنوی سے لے کر قطب الدین ایبک کو دکھن میں محمود قلی قطب شاہ سے لے کر دہلی میں بابر بادشاہ تک مختلف ترک قبائل برصغیر پاک و ہند میں مختلف ادوار میں داخل ہوتے اور اس خطۂ زمین کے باسی بنتے گئے۔

بے شک تُرک برصغیر میں فاتح بن کر آئے لیکن یہاں آ کر انھوں نے ایک اجنبی طاقت کی حیثیت سے ملک پر حکمرانی نہیں کی اور نہ وہ انگریزوں کی طرح اپنی نسل کو دوسروں سے برتر نسل سمجھے اور نہ ہی انھوں نے اپنی قوم اور دوسری قوموں کے درمیان ناقابلِ تسخیر سیاسی اور سماجی دیواریں کھڑی کر کے اپنے مفادات اور اقتدار کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی بلکہ انھوں نے برصغیر کی ترکیب کیمیائی میں خود کو شامل کر لیا اور اپنے قومی شعور کو مسلمانانِ ہند کے قومی شعور میں شامل کر دیا اور اس خطے کا جزوِ لاینفک بن کر رہ گئے۔ انھوں نے اس کام کو اس قدر خوش اسلوبی سے کیا کہ محمود غزنوی سے لے کر بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی تک برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں وہ ایک اجنبی طاقت کی حیثیت سے نہیں بلکہ بذاتِ خود برصغیر کی اپنی اولاد کی حیثیت سے یاد کیے جانے لگے اور ہر چند تُرکوں کا اقتدار خود برصغیر کی مٹی میں مل کر غائب ہو گیا لیکن پھر بھی معماری کے میدان سے لے کر تاریخ اور شعر و ادب کے میدان تک مختلف شعبوں میں ان کے اثرات نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ترکی

اور پاکستان کے روابط کا ایک پہلو ہے۔

ان گزرتی صدیوں میں ترکی النسل بادشاہ ہندوستان کے طول و عرض میں برسر اقتدار تھے جیسے کہ عثمانی بادشاہ حجاز سے لے کر یوکرین اور آذر بائیجان سے لے کر آسٹریا کے دارالحکومت ویانا اور افریقا میں مراکش تک حکمرانی کرتے تھے۔ ان صدیوں میں جبکہ دونوں ملکوں یعنی ہندوستان اور ترکی میں سلطنتیں مضبوط تھیں تو ان ملکوں کے تعلقات توازن اور برابری کی بنیاد پر قائم تھے، دوستی اور برادری کی بنیاد پر نہیں۔ مگر زمانہ بدل گیا اور دونوں ملکوں کی سلطنتوں کا تختہ اُلٹ گیا۔ پہلے ہندوستان پر انگریزوں نے قبضہ کیا اور پھر سلطنت عثمانی میں کمزوریاں رونما ہوئیں اور آہستہ آہستہ اور ٹکڑا ٹکڑا عثمانی سلطنت بھی اپنے جلادوں کے ہاتھوں بٹنے لگی۔

دوسرا پہلو سلطنت عثمانیہ یعنی ترکی اور برصغیر پاک و ہند کے روابط کا ہے۔ عثمانی ترک مسلمان تو تھے ہی لیکن عثمانی سلاطین کے مقدس خلافت کے مقام پر فائز ہونے نے ہندوستانی مسلمانوں کی نظر میں ترکوں کی اہمیت کو دو بالا کیا۔ لہٰذا خود ایک نوآبادیاتی طاقت یعنی برطانیہ کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے والے اور محکوم قوم ہونے کی صعوبتیں اور دشواریاں برداشت کرنے والے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے خلافت کے مقام پر اور مسلمان ترک بھائیوں پر کیے جانے والا ہر حملہ بذات خود ان کی اپنی قومی ہستی پر کیے جانے والے ایک حملے کی طرح سمجھا گیا اور انھوں نے بلا تامل ان حملوں کے سامنے سد باب بننے کی ہر ممکن کوشش کی جیسے کوئی اپنے پیاروں کی جان کو خطرے میں محسوس کرے اور ان کی جان بچانا چاہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۸۷ء روس اور ترک کی جنگ سے لے کر جنگ طرابلس اور بلقان تک اور پھر پہلی جنگ عظیم کے دوران برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے ترک بہن بھائیوں کی حفاظت اور ان کی ہستی کو بچانے کی خاطر ہر ممکن قربانیاں دیں اور مسلسل جد و جہد میں مصروف رہے۔

ہر چند ترکی میں خلافت کے مقام کو ختم ہونے کے بعد کچھ عرصے کے لیے ان تعلقات میں جمود سا آگیا مگر دوستی اور برادری کے تعلقات، جو بھی منفی عوامل سامنے آئیں، پھر بھی کبھی ختم نہیں ہوئے اور کروٹ بدل بدل کر مختلف ادوار اور مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہوئے جو آج ترکی اور پاکستان کے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات کی صورت میں ہم سب کے سامنے ہیں۔ (۱)

بالکل اسی طرح یہ امر دونوں ملکوں کے ادبی روابط پر بھی صادق آتا ہے اور ان روابط کو پرکھتے ہوئے انھیں ۱۹۴۷ء کے بعد سے شروع کرانا کچھ مناسب نہیں لگتا۔ کیونکہ ترکی کے دوست اور برادر ملک پاکستان کے لوگوں کے آبا و اجداد وہی لوگ ہیں جن کے ساتھ عثمانی ترکوں کے تاریخی، سیاسی، سماجی اور نیز ادبی روابط قائم ہوئے تھے۔ میرا مطلب غیر منقسم ہندوستان کے مسلمان جنھوں نے پاکستان کو قائم کیا۔

اب اگر ہم اسی تاریخی پس منظر کو مدنظر رکھ کر دیکھیں تو ہمیں ادبی روابط کو مزید مضبوط بنانے والے دو اہم استعارے ملیں گے: "اردو زبان اور شاعر مشرق اور مفکر اسلام علامہ محمد اقبال"۔

اردو زبان کا ذکر ہوتا ہے تو میں ہر محفل میں یہ عرض کرتا ہوں کہ زبان اردو نہ صرف برصغیر پاک و ہند کی مشترکہ تہذیبی اور ثقافتی زبان ہے بلکہ وہ ہماری یعنی ہم ترکوں کی بھی اتنی ہی اپنی زبان ہے۔ کم از کم تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے یوں ہے۔ جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے اردو، بنفس نفیس ترکی زبان کا لفظ ہے اور ابتدائی مراحل سے لے کر اردو زبان کے خمیر میں ترکوں کا آٹا اور نمک بھی شامل رہا ہے۔ جب محمود غزنوی کی اس خطے میں فتوحات شروع ہوئیں اور ان کی فوج نے لاہور پر اپنا علم بلند کیا تو لاہور کی گلی کوچوں میں اس زبان کی ابتدائی شکل ظہور پذیر ہوئی اور پھر جب قطب الدین ایبک نے دہلی کو فتح کیا یہ زبان دہلی میں لشکرگاہ کے بازاروں میں پروان چڑھ کر پلنے پھولنے لگی اور اپنی اصل صورت نکھاری۔ یعنی اس زبان کی پیدائش ہی ترک سلاطین کے گہوارے میں ہوئی اور یہ زبان ان کے ساتھ برصغیر کے چار اطراف پھیل گئی۔ اس زبان کا ادب جب شکل پذیر ہونے لگا تو امیر خسرو دہلوی نے اس کی انگلی پکڑی۔ امیر خسرو وہ اولین شاعر ہیں جن سے ہمیں اردو ادب کے اولین ادبی نمونے دستیاب ہوئے۔ امیر خسرو ایک کثیر اللسان ترک تھے۔ پھر ان کے بعد قلی قطب شاہ کو لیجیے۔ قلی قطب شاہ وہ اولین شاعر ہیں جن کا اردو میں دیوان مرتب ہوا۔ قلی قطب شاہ بھی ترکی النسل تھے۔ پھر اردو زبان کو فکری وسعتیں عطا کرنے والے عظیم شاعر غالب، وہ بھی ایک سلجوقی ترک تھے۔ ان کے علاوہ خواہ بہادر شاہ ظفر کو لیجیے، خواہ داغ دہلوی کو، یہاں کئی نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مختصر بہت سے ترکی النسل شعرا اور ادبا نے اردو زبان اور ادب کی خدمت کی۔ یعنی پیدائش سے لے کر ادب کے آسمان کی بلندیوں کو چھونے تک ترکی النسل افراد اس خوبصورت زبان کے خادم رہے۔

اور پھر جب ہم اردو ادب کی تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اردو زبان ترکی اور پاکستان کے ادبی روابط کے استحکام کے لیے اپنا کردار بخوبی انجام دیتی رہی ہے اور آج بھی دیتی ہے۔

مثال کے طور پر اٹھارویں صدی کے ربع آخر اور انیسویں صدی کے ربع اول میں عثمانی سلطنت کے دار الخلافت استنبول میں "پیک اسلام"، "جہان اسلام" اور "اخوت" کے عنوان سے تین اردو اخباروں سے ہمیں سابقہ پڑتا ہے (۲) استنبول سے نکلنے والے ان اخبارات کا واحد مقصد تھا "خلیفۃ المومنین کے زیر سایہ رہ کر اسلام، وطن اور ملت کی خدمت" جیسے کہ "جہان اسلام" کے مدیر ابوسعید العربی الہندی نے لکھا:

"ہماری دیرینہ آرزو تھی کہ خلافت اسلامیہ کی پناہ میں آ کر اور ہلال پاک کے سائے میں بیٹھ کر ایک اخبار زیادہ التعارف بین المسلمین کے لیے نکالیں مگر ہر ایک کام کے لیے وقت مقرر ہوتا ہے۔ سو اب خدا کی

توفیق سے وہ وقت آگیا اور ہم کو اپنی تمنا پوری کرنے کا موقع ملا۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک۔
یہ بڑا دعویٰ ہے کہ ہم خدمت اسلام کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ دعویٰ کرنے سے یہ بہت بہتر سمجھتے ہیں کہ کام کریں اور لفظی امور کو چھوڑ دیں اور یہ سمجھیں کہ ہر شخص کا فرض اولین ہے کہ وہ وطن وملت کی خدمت کرے اور اس بات کا انتظار نہ کرے کہ لوگ اس کی تعریف کریں، لیکن جو امور ہمارے پیش نظر ہیں ہم ان کا اظہار بھی کریں گے اور مسلمانوں کی ضروریات کے متعلق قلم اٹھایا کریں گے۔ یہ بھی ہماری خواہش ہے کہ اہل ہند کو بعض تجارتی امور کی طرف دعوت دیں تاکہ ایک تجارتی سلسلہ ممالک اسلامیہ کے قومی استحکام کا باعث ہو اور ہندوستان کے احوال سے یہاں کے مسلمانوں کو اور یہاں کے مسلمین اور احوالِ مسلمین سے دیگر ممالک کے اہل اسلام کو آگاہ کرتے رہیں۔"(۳)

مزید برآں بالخصوص انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر کوئی ایسا دن نہیں گزرتا جس میں برصغیر کے اردو اخبارات میں ترکی، عثمانی خلافت اور ترکوں کے مسائل کے بارے میں خبر شائع نہ ہو۔ پیسہ اخبار، زمیندار اور الہلال جیسے اپنے زمانے کے مؤقر اخبار اسی سلسلے میں پیش پیش تھے۔ انھی دنوں میں ترکی کے اخباروں میں بھی برصغیر پاک وہند سے متعلق خبریں کثرت سے شائع ہوتی تھیں جن میں 'سبیل الرشاد' اور 'وطن' نامی ترکی اخبارات شامل تھے۔ یعنی اردو اخبارات خواہ وہ استنبول میں ہوں خواہ برصغیر پاک وہند میں ترکی اور برصغیر کے مسلمانوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی کے لیے کوشاں رہے اور یوں تو بالواسطہ ترکی اور پاکستان کے دوستانہ اور برادرانہ روابط کے لیے محکم بنیادیں قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

محض اخبار اور رسالے نہیں جنھوں نے سیاسی، سماجی اور ادبی روابط کو شہ دی بلکہ خود اردو ادب نے بھی ان روابط کو محکم تر کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ شبلی نعمانی سے لے کر آج تک برصغیر کے اور خاص طور پر پاکستان کے بہت سے سفرنامہ نگاروں نے یا ترکی پر سفرنامے لکھے ہیں یا اپنے سفرناموں کا ایک الگ حصہ ترکی کے لیے مختص کیا۔ بہت سے نام یہاں پیش کیے جاسکتے ہیں مگر معلوم نہیں کن کن کے نام پیش کروں۔ نواب عمر خان کا "سفرنامہ آئینہ فرنگ: ۱۸۸۵ء"، شبلی نعمانی کا "سفرنامہ روم ومصر وشام: ۱۸۹۴ء"، مولوی عبدالرحمن امرتسری کا "سفرنامہ بلاد اسلامیہ: ۱۹۰۵ء"، شیخ عبدالقادر کا "مقام خلافت: سفر استنبول کے حالات۔ ۱۹۰۶ء"، منشی محبوب عالم کا "سفرنامہ یورپ۔ بلاد روم ومصر وشام: ۱۹۰۸ء"، نازلی رفیعہ سلطان کا "سیر یورپ: ۱۹۰۸ء"، اخترم حمیدیہ بیگم سربلند جنگ "دنیا عورت کی نظر میں: ۱۹۱۰ء"، محمد حمید اللہ خان کا "سفرنامہ قسطنطنیہ: ۱۹۱۰ء"، شاہ بانو کا روزنامچہ سیاحت: ۱۹۱۲ء"، نواب بہادر یار جنگ کا سیاحت ممالک اسلامیہ۔ نواب بہادر جنگ کا روزنامچہ: ۱۹۳۱ء" اور اسی طرح جدید مصنفوں میں شریف فاروق کا "اتاترک کے وطن میں: ۱۹۶۱ء"، حیدر علی خان،

''سفرنامہ قسطنطنیہ؛ ۱۹۶۳''، عطاء الحق قاسمی کا ''شوق آوارگی؛ ۱۹۷۰ء''، خلیل احمد حمیدی کا ''ترکی قدیم و جدید؛ ۱۹۷۲ء''، مستنصر حسین تارڑ کا ''نکلے تیری تلاش میں؛ ۱۹۷۲ء''، وجاہت علی کا ''جب میں نے ترکی دیکھا؛ ۱۹۷۴ء''، عبادت بریلوی کا ''ترکی میں دو سال؛ ۱۹۸۶ء''، سید ابوالحسن علی ندوی کا ''دو ہفتے ترکی میں؛ ۱۹۹۶ء''، غلام حسین ذوالفقار کا ''استنبول ترکیہ سفر و حضر میں؛ ۲۰۰۱ء''، فرید احمد پراچہ کا ''سفرنامہ ترکی؛ ۲۰۱۲ء''، فرخ سہیل گوئندی کا ''ترکی ہی ترکی؛ ۲۰۱۴ء''، ''سلمیٰ عوان کا استنبول کہ عالم میں منتخب؛ ۲۰۱۵ء''، عبیداللہ کیہر کا ''یارمن ترکی؛ ۲۰۱۵ء''، محمد اشرف کمال کا ''یورپ کے دہلیز پر: سفرنامہ ترکی؛ ۲۰۱۶ء'' اور طاہر انور پاشا کا ''ترکی میں پاشا؛ ۲۰۱۹ء'' اور یوں کئی نام اس طویل فہرست میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔

اسی طرح ترکی سے اردو اور بعد میں اردو سے ترکی میں تراجم کا سلسلہ بھی ہے۔ مثلاً اردو افسانے کو لیجیے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اردو مختصر افسانے کی صنف کے مستحکم ہونے میں ترکی افسانوں سے تراجم کا بھی عمل دخل ہے۔ سجاد حیدر یلدرم اس سلسلے میں ایک عظیم نام ہے۔ انھوں نے ایک دفعہ لکھا تھا:

''میری تمنا تھی کہ کسی طرح ترکوں کے قصے ترجمہ ہوں۔ اس سے نہ صرف ہمارے ناولوں کے لٹریچر میں ایک نئے قسم کا اضافہ ہوگا بلکہ ترکوں کی زندگی کا اصل نقشہ بھی ہمیں نظر آئے گا۔ ترکوں کی سوشل زندگی کی تصویر کی میں اردو میں اس لیے ضرورت سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرز معاشرت میں جو انقلاب پیش آرہا ہے وہ انھیں بھی پیش آچکا تھا۔''(۴)

وہ ترکی زبان کے ساتھ ساتھ ترکی ادب سے بھی بخوبی واقف تھے اور ترکوں سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے عثمانی بادشاہ یلدرم بایزید کے نام کو اپنے لیے مستعار لیا۔ ان کا پہلا افسانہ ''نشے کی ترنگ'' جو اکتوبر ۱۹۰۰ء میں معارف میں شائع ہوا وہ ترکی سے ترجمہ تھا۔ اسی طرح احمد حکمت مفتی اوغلو کے ڈرامے کا اردو ترجمہ انھوں نے ''ثالث بالخیر'' کے نام سے کیا۔ اسی طرح یلدرم نے احمد حکمت کی تصانیف سے ''صحبت ناجنس'' اور ''خارستان و گلستان'' کو اردو کے ماحول میں پیش کیا اور ''آسیب الفت''، ''زہرا'' اور ''مطلوب حسینان'' بھی ان کے ترکی ادب سے تراجم میں شامل ہیں۔(۵)

یوں تراجم کا یہ سلسلہ جو اس وقت شروع ہوا تھا، کبھی کچھ عرصے کے لیے ٹھہراؤ کا شکار بھی ہوا، اس دن سے آج تک جاری ہے۔ ترکی ادب کے کئی اہم نام جن میں یونس ایمرے، محمد عاکف ایرصوئے اور خالدہ ادیب آدی وار سے اردو میں تراجم ہوئے۔ بالخصوص جمہوری پبلی کیشنز کے مالک گوئندی صاحب نے ترکی سے اردو کے تراجم کا جو سلسلہ شروع کیا وہ قابل تحسین ہے۔ مثال کے طور پر اورخان کمال ''باپ کا گھر'' (مترجم: خالد فتح محمد)، اورخان پاموک ''سرخ میرا نام'' (مترجم: ہما انور)، ایلف شفق ''ناموس'' (مترجم: ہما انور)، احمد حمدی

طانپنار"شہر اطمینان"(نسرین انجم بھٹی)، یشار کمال "بوئے گل"(مترجم : تنویر اقبال)، عدالت آغا اوغلو "انجام بہاراں"(مترجم: ہما انور)، اور خان کمال "جمیلہ"(مترجم: خالد فتح محمد) وغیرہ اسی سلسلے میں سامنے آئے ہیں۔ جن کی وجہ سے یقیناً ترکی اور پاکستان کے ادبی روابط میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے۔ اردو سے ترکی زبان میں تراجم نسبتاً کم ہیں اور اس سلسلے میں کام کرنے کی بہت ضرورت ہے۔

ترکی کی یونیورسٹیوں میں موجود شعبہ جات اردو بھی ترکی اور پاکستان کے نہ صرف ادبی بلکہ تہذیبی، ثقافتی اور سماجی روابط کے استحکام میں اپنی خدمات انجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ترکی میں اردو کی تعلیم کا آغاز سب سے پہلے ۱۹۱۵ء میں دارالفنونِ عثمانی یعنی استنبول یونیورسٹی ہوا۔ مختلف مسائل کی وجہ سے اردو کی تعلیم و تدریس میں کچھ وقفہ آنے کے باوجود یہ سلسلہ پھر سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے۔ فی الحال ترکی کی تین یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم و تدریس جاری ہے۔ استنبول یونیورسٹی کا شعبہ اردو اساتذہ اور طالب علموں کی تعداد کے لحاظ سے سب سے بڑا مرکز ہے۔ ہمارے شعبے میں نو اساتذہ ہیں۔ مزید برآں بی اے کی سطح، جس میں چار سالہ کورس جاری ہے، پر سو سے زائد طلبہ و طالبات زیر تعلیم ہیں، اس کے علاوہ ایم اے اور پی ایچ ڈی کے پروگرام بھی جاری ہیں جن میں چھ طالبعلم اپنے اپنے مقالات لکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انقرہ یونیورسٹی اور قونیہ سلجوق یونیورسٹی میں بھی اردو کی تعلیم و تدریس جاری ہے اور اساتذہ علمی و ادبی کاموں کے ذریعے پاکستان اور ترکی کے تعلقات کی بہتری کے لیے کوشاں ہیں۔

جس طرح میں نے عرض کیا ہے کہ پاکستان اور ترکی کے ادبی روابط کے سلسلے میں ہمارے لیے ایک اور روشن استعارہ شاعرِ مشرق اور مفکرِ اسلام علامہ محمد اقبال ہیں۔ اب ان کے بارے میں بھی چند الفاظ عرض کر کے اپنی تقریر کے اختتام کی طرف لے جاؤں گا۔

شاعرِ مشرق، مفکرِ اسلام، فلسفی، مختصراً ایک ہمہ گیر شخصیت کے حامل ہوتے ہوئے اقبال نے اپنے ماحول اور ملک کی حدود کو پار کر کے دوسرے ممالک کے اندر ذہنوں میں گھر بنا لیا ہے۔ اور ان کے اثرات بلاشک و شبہ ممالک اسلامی پر زیادہ گہرے مرتب ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال کے افکار و تصورات نے جن قوموں پر اپنا اثر چھوڑا شاید ان میں ترک قوم سرِ فہرست ہے۔ یہ صرف اس لحاظ سے نہیں کہ علامہ اقبال کے دل اور ان کی شاعری میں ترکوں کی خاص جگہ ہے بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ اقبال کی اپنی شاعری میں ظاہر کیے ہوئے مسائل و مصائب سے ترک قوم براہ راست دوچار ہوئی اور مجادلہ اور مجاہدہ کے مراحل سے گزر کر اپنی ہستی بچالی۔ اس لیے ترک اقبال کی شاعری میں اپنی تاریخ، اپنے خیالات و احساسات، اپنی امیدیں مختصراً اپنے آپ کو دیکھتے تھے اور اب بھی دیکھ رہے ہیں۔ ترکی کے قومی ترانے کے خالق اور عظیم شاعر محمد عاکف ایرصوئے

سے لے کر معروف دانشور علی نہاد تارلان اور عبدالقادر قرہ خان اور ان سے لے کر ہم لوگوں تک سینکڑوں ترکوں نے علامہ اقبال کی تصانیف کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا ہے، ان پر کئی کتابیں اور مضامین لکھے ہیں اور ترکی کی یونیورسٹیوں میں علامہ اقبال پر درجنوں مقالے لکھے جا چکے ہیں کیونکہ ان کو ہم اپنا شاعر سمجھتے ہیں۔(۶)

الغرض ادب ملکوں کے دوستانہ اور برادرانہ روابط میں اور ان ملکوں کے لوگوں کے دل و دماغ میں ناقابل تردید اور بہت دیر پا اثرات مرتب کرتا ہے لہٰذا ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کاروبار سے پیدا ہوتے والی دوستی ایک پل کی اور ادب سے جنم لینے والی دوستی نہ صرف زندگی بھر کی ہوتی ہے بلکہ وہ نئی آنے والی نسلوں میں بھی منتقل ہوتی ہے۔

حوالے

1- Halil Toker-Zekai Kardas, Journey of FriendshipandBrotherhood, A PictorialSurvey of Turkey Pakistan Relations, MavraPublishers, Lahore 2021, pp 21-24.

۲۔ خلیل طوقار، جہانِ اسلام، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور ۲۰۱۱ء، ص ۲۹۔ ۳۰۔

۳۔ خلیل طوقار، جہانِ اسلام، ص ۴۲۔ ۴۳۔

۴۔ شہناز رحمٰن، اردو افسانے پر ترکی کے اثرات۔ یلدرم کے افسانوں کے حوالے سے

/mazameen.com/literature/other-prose//https:

۵۔ سید مبارز الدین رفعت، سجاد حیدر یلدرم نمبر، ماہنامہ پگڈنڈی، امرتسر، ۱۹۶۱ء، جلد ۹، شمارہ ۵، ص ۳۰۔

۵۔ خلیل طوقار، اقبال اور ترک، بزمِ اقبال، لاہور ۲۰۰۴ء، ص ۵۱۔ ۵۲۔

□□□□

ڈاکٹر ابوبکر عباد (نئی دہلی؛ بھارت)

مسئلہ جدید نظم نگاری اور جائزہ حالی کی نظموں کا

پہلے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جس سے نظم جدید کے ابتدائی عہد، اس زمانے کے شعرا کے مزاج، اس نئی صنف کی ایجاد، مقبولیت کے اسباب اور حالی کی نظم نگاری کی شانِ نزول کا علم ہوتا ہے :

> 1874ء" میں جب کہ راقم پنجاب بک ڈپو سے متعلق تھا اور لاہور میں مقیم تھا مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ، ڈائریکٹر سر رشتۂ تعلیم پنجاب، کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرہ کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دروبست عشق اور مبالغے کی جاگیر ہوگئی ہے، اس کو جہاں تک ممکن ہو، وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی جائے۔۔۔ جو لوگ ہندوستان میں اردو نظم پر تھوڑی یا بہت قدرت رکھتے تھے، وہ عشقیہ مضامین کی ممارست سے شاعری کو عاشقی کا مرادف جانتے تھے اور مبالغے کو شعر کے ذاتیات میں داخل سمجھتے تھے۔ وہ واقعہ نگاری اور تصویری حقائق کو منصب شاعری کے خلاف تصور کرتے تھے۔۔۔ 1872ء میں (صحیح تاریخ 1870ء ہے) سرسید احمد خاں نے پرچہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس کے سبب سے ان مسلمانوں کے خیالات میں جو لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے تھے، بہت جلد ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا۔ اردو فارسی انشا پردازی کا قدیم طریقہ ان کی نظر میں نہایت سخیف اور سبک معلوم ہونے لگا اور اپنی شاعری کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔۔۔ مجھے مغربی شاعری کے اصول سے نہ اس وقت کچھ آگہی تھی اور نہ اب ہے۔ نیز میرے نزدیک مغربی شاعری کا پورا پورا تتبع ایک ایسی نا مکمل زبان میں جیسی کہ اردو ہے، ہو بھی نہیں سکتا۔ البتہ کچھ تو میری طبیعت مبالغہ اور اغراق سے بالطبع نفور تھی اور نئے چرچے نے اس نفرت کو زیادہ مستحکم کر دیا۔ اس بات کے سوا میرے کلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے انگریزی شاعری کے تتبع کا دعویٰ کیا جا سکے یا اپنے قدیم طریقے کے ترک کا الزام عائد ہو۔"

(بحوالہ دیباچہ کلیاتِ نظم حالی، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب لاہور، 1968ء، ص 53-52)

حالی کا اردو نظم نگاری کو انگریزی شاعری کا تتبع سمجھنا اور ان کا یہ کہنا کہ "جو لوگ ہندوستان میں اردو نظم پر تھوڑی یا بہت قدرت رکھتے تھے۔۔۔ وہ واقعہ نگاری اور تصویری حقائق کو منصب شاعری کے خلاف تصور کرتے تھے۔" اور یہ کہ انجمن پنجاب کی تحریک کا مقصد "ایشیائی شاعری۔۔۔ کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی جائے"، حیرت انگیز ہے۔ جب کہ واقعہ نگاری اور تصویری حقائق یا منظر کشی کی روایت قلی قطب شاہ سے شروع ہوتی ہے اور نظیر اکبر آبادی اسے عروج پر پہنچاتے ہیں۔ پھر حقائق و واقعات پر مبنی نظمیں بھلا نظیر اکبر آبادی سے زیادہ کس نے لکھی ہوں گی۔ ممکن ہے تب قلی قطب شاہ کا کلام دریافت نہ ہوا ہو، اور شیفتہ اور دوسرے تذکرہ نگاروں کی طرح حالی بھی نظیر اکبر آبادی کو شاعر نہ مانتے رہے ہوں؛ لیکن سب سے زیادہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ حالی کے بعد سے لے کر اب تک ہمارے ناقدین بھی حالی کی پیروی، یا اپنی معصومیت میں اردو نظم نگاری کا آغاز 1874 سے ہی تسلیم کرتے اور اس کی تبلیغ بھی کرتے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ انجمن پنجاب سے کہیں زیادہ توانا اور مستحکم روایت نظیر اکبر آبادی (1746-1830) کی نظم نگاری کی صورت میں ہمارے یہاں انجمن پنجاب سے نصف صدی سے بھی زیادہ پہلے سے موجود تھی۔

نظیر اکبر آبادی کی نظموں میں وہ تمام موضوعات شامل ہیں جن پر انجمن پنجاب کے شاعروں نے نظمیں لکھ کر یہ دعوے کیے کہ اردو میں اس نوع کی نظموں کا آغاز کرنل ہالرائڈ کے ایما پر اور انگریزی شاعری کی اتباع میں پہلی بار کیا جا رہا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے یہاں ہندوستان کے موسم، تہوار، میلے ٹھیلے، یہاں کی عظیم شخصیات، حب وطن، تہذیب اور ثقافت جیسے سبھی موضوعات پر آسان، سادہ، سہل زبان میں نظمیں موجود تھیں۔ جن میں حقیقت بیانی بھی ہے، واقعہ نگاری بھی اور تصویری حقائق' یا کہیے منظر نگاری بھی اپنی بلند سطحوں پر ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ نظیر اکبر آبادی کی تقریباً سبھی نظمیں حقائق و واقعات پر ہی مبنی اور مبالغے اور اغراق سے پاک ہیں۔ نظیر نے بچوں کے لیے بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں اور مختلف مذاہب کے بزرگان دین پر نظمیں لکھ کر بین المذاہب بھائی چارے کی عمدہ مثالیں بھی قائم کی ہیں۔ کہنا چاہیے کہ ان کی نظموں میں ایک مکمل اور جیتا جاگتا ہندوستان اپنے صد رنگ پہلوؤں کے ساتھ سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ سو، اردو نظم نگاری کو 1857 کا زائیدہ، کرنل ہالرائڈ کے مشورے کا نتیجہ یا انگریزی شاعری کی اتباع کہنا صداقت نہیں ہے۔ بلکہ کہنا چاہیے یہ اردو نظم نگاری اور نظیر اکبر آبادی کے ساتھ زیادتی ہے۔ ہاں! انجمن پنجاب کی تحریک کو نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری کی توسیع کہیے تو بجا ہے۔ بہر حال، فی الوقت گفتگو کا موضوع حالی کی نظم نگاری ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ خود حالی کی نظم نگاری کی ابتدا 1874 میں قائم ہونے والے انجمن پنجاب سے دو برس پہلے ہو چکی تھی۔ 'کلیات منظومات حالی' کی پہلی نظم بعنوان "جواں مردی کا کام" کے نیچے قوسین میں تاریخ

مرقومہ 1872 عیسوی درج ہے اور حاشیے میں مولانا حالی کی یہ تحریر ہے "یہ حکایت ایک انگریزی نثر سے لی گئی ہے اور اس کو اردو میں باضافۂ بعض خیالات نظم کیا گیا ہے۔" (کلیاتِ نظم حالی، جلد اول، 1968، ص 365) انگریزی نثر کی بنیاد پر منظوم کی گئی نظم 'جواں مردی کا کام' گلستاں کی حکایت کی یاد دلاتی ہے اور حالی سعدی سے بے حد قریب معلوم ہوتے ہیں۔ اس نظم کے حوالے کے بعد حالی کی نظم نگاری کو محض انجمن پنجاب کی پیداوار اور حالی کو کرنل ہالرائڈ کی دریافت کہنا کسی طرح درست نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انجمن کے مشاعروں کی شرکت نے انھیں باضابطہ نیچرل شاعری کی جانب متوجہ کیا اور بعد ازاں سرسید کی رفاقت نے انھیں شعوری طور پر نظم کو مقصدی شاعری، یا کہیے پیغام رسانی کا ذریعہ بنانے پر آمادہ کیا۔ حالی نے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں پڑھنے کے لیے صرف چار نظمیں لکھی تھیں: 'برکھارت'، 'نشاطِ امید'، 'حب وطن' اور 'مناظرہ رحم و انصاف'۔ یہ تمام نظمیں مثنوی کی ہیئت میں ہیں۔

انجمن پنجاب کے تحت کی جانے والی شاعری کا بیشتر حصہ مناظرِ فطرت اور مظاہرِ قدرت کے بیان پر مشتمل تھا، گوکہ اس کی روایت ہماری مثنویوں، مرثیوں اور نظیر اکبرآبادی کی نظموں میں پہلے سے موجود تھی۔ تاہم نظم جدید کے حوالے سے حالی کا کارنامہ یا ان کی جدت یہ ہے کہ انھوں نے اس صنف کا رخ منظرکشی کی ہنرمندی، واقعات بیانی اور مشاہداتی لطف اندوزی سے فکری مقصدیت کی طرف موڑ دیا اور اسے سماجی وابستگی اور عصری مسائل سے ہم آہنگ کیا۔ اور یہ سب تب ہوا جب وہ لاہور سے دہلی واپس آئے، سرسید سے متاثر ہوئے اور علی گڑھ تحریک میں شمولیت اختیار کی۔ سرسید کی ہم نشینی میں حالی کا قومی شعور مزید بالیدہ ہوا، ملک و ملت کی فلاح کا جذبہ جنون کی حد کو پہنچا تو خود میں زبردست تبدیلی محسوس کی اور نتیجے کے طور پر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو ملک و معاشرے کی بہبود کے لیے انھوں نے وقف کر دیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب انھوں نے غزل کہنی تقریباً ترک کر دی تھی اور نظم کو اظہار کے سب سے توانا میڈیم کے طور پر اپنایا تھا۔

تسلیم کیجیے کہ مولانا الطاف حسین حالی کی حیثیت سوانح اور تنقید کے بنیاد گزار کے ساتھ ساتھ مجدد شاعر کی بھی قرار پاتی ہے۔ فکری اور موضوعاتی سطح پر انھوں نے غزل میں جو توسیع کی وہ اپنی جگہ، اردو نظم پر بھی ان کے کم احسانات نہیں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی ہمارے بڑے شاعر اور نظمِ جدید کے پیشوا ہیں۔ ان کی نظمیہ تخلیقات کا دائرہ اپنے معاصرین کے مقابلے میں سب سے زیادہ وسیع اور جملہ اصنافِ سخن پر محیط ہے۔ انھوں نے شعری اصناف میں موضوعات کے دائرے کو صرف وسعت ہی نہیں دی، بلکہ تمام اصناف کو زمانے کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی کیا اور جدید میلانات کا حامل بھی بنایا۔ ان کی نظموں میں علم، اخلاق، اصلاح، حب وطن اور ہمدردیِ نسواں جیسے موضوعات صدر درجہ نمایاں ہیں۔ کہنے کی اجازت دیجیے کہ مولانا الطاف حسین حالی

اردو کے پہلے تانیثی شاعر ہیں۔ حالی نے عورتوں کے مسائل، ان کے جذبات اور ان کی نفسیات کو جس طرح سمجھا، محسوس کیا، انھیں جس خوبی سے بیان کیا اور ان کے تدارک کے طریقے بتائے اس کی ہمارے یہاں کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

حالی کی نظموں میں کوئی فلسفہ تو نہیں، لیکن مسائل و امکانات کا بیان کثرت سے ہے۔ تاریخی حوالے، اپنے عہد کے منظرنامے اور مستقبل کی تعمیر ان کی نظموں کے بنیادی عناصر ہیں۔ سیاسی، سماجی، اخلاقی اور تہذیبی مسائل کی شمولیت سے انھوں نے نظمیہ شاعری کے کینوس کو وسعت و عظمت اور اس کے بیانیہ کو تاثیر و توانائی بخشی ہے۔ وہ اپنی نظموں کی تشکیل میں فن کے ساتھ فکر اور حسن کے ساتھ افادیت کے تانے بانے کو بہر طور شامل کرتے ہیں۔ مانوس لفظیات، سامنے کی تشبیہات و استعارے، عام بول چال کے محاورے، ضرب الامثال اور معلوم اصطلاحوں کے ذریعے وہ بے مد سنجیدہ معاملات اور خشک موضوعات تک کو اس خلوص، اثر انگیزی اور شعری ہنرمندی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ وہ دل پہ نقش اور ذہنوں میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ خوب واضح رہے کہ حالی نے شاعری؛ بالخصوص نظمیہ شاعری 'برائے شعر گفتن'، 'فوری جذبات کے برملا اظہار' اور 'اک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے' کی صناعی کے تحت نہیں کی، بلکہ انھوں نے چند منشور کو سامنے رکھ کر بڑے ہی منصوبہ بند طریقے سے شاعری کی ہے، جس کی مکمل اور منضبط توسیع ترقی پسند تحریک کو قرار دیا جانا چاہیے۔ اسی طرح ان کے موضوعات، ان کا ڈکشن اور طریقۂ اظہار بھی تقریباً طے شدہ تھا۔ وہ اپنے فکر و خیال کا اظہار بڑی ہی سلاست، بے باکی، جامعیت اور اثر انگیزی کے ساتھ کرتے اور بالعموم بیانیہ، مکالماتی، استدلالی اور ترغیبی طرز اسلوب اپناتے ہیں کہ شاید ادب و سماج میں اصلاح، ارتقا اور انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی طریقۂ کار اور تحریری ٹولس ہو بھی نہیں سکتے تھے۔

حالی کی نظموں کو موضوعات کے اعتبار سے درج ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

۱۔ قومی و ملی : 'مسدس مد و جزر اسلام' (1879)، 'عرض حال' (1888) اور 'شکوۂ ہند' (1888)

۲۔ ہمدردیٔ نسواں: 'مناجات بیوہ' (1884)، 'چپ کی داد' (1905)

۳۔ تعلیمی و اصلاحی: 'مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ' (1880)، 'ننگ خدمت' (1887) مسلمانوں کی تعلیم (1889) قوم کا متوسط طبقہ (1891) جشن قومی (1892) صدائے گدایانِ قوم (1893) حاضرین کانفرنس سے خطاب (1898) علی گڑھ کالج کیا سکھاتا ہے (؟) شکریہ حضور نظام (؟) شکریہ' والی رام پور (1900) گدایانِ قوم (1901) تحفۃ الاخوان (1902) فلسفۂ ترقی (1903) انجمن حمایت اسلام لاہور (1904) ترغیب امدادِ یتیماں (1905)

۴۔ درسی، اخلاقی،مناظراتی: جواں مردی کا کام(1872) برکھارت (1874) نشاطِ امید (1874) حب وطن(1874) مناظرہ رحم وانصاف (1874) تعصب وانصاف (1882) کلمۃ الحق (راست گوئی) (1883) مناظرہ واعظ وشاعر (1883) پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ (1887) دولت اور وقت کا مناظرہ (1887) حقوقِ اولاد (1888) ناقصوں کے دعوے کاملوں کے سامنے فروغ نہیں پاتے (؟)

۵۔ بچوں کی نظمیں: (1904-1908) خدا کی شان، بڑوں کا حکم مانو، مرغی اور اس کے بچے، بلی اور چوہا، شیر کا شکار، پیشے، گھڑیاں اور گھنٹے، دھان بونا، روٹی کیوں کر میسر آتی ہے، موچی، چٹھی رساں، سپاہی، ایک چھوٹی بچی کے خصائل، نیک بنو نیکی پھیلاؤ۔

۶۔ تراجم: زمزمۂ قیصری، (1876) انگریزی اشعار کا ترجمہ(؟)، ناقدری(1913)، واقعہ ہجرت (1886)

گویا نظمِ جدید کے تحت حالی نے جو نظمیں لکھی ہیں اُن کی کل تعداد اکیاون ہے۔ جن میں سے چار قومی وملی نظمیں، دو نظمیں ہمدردیِ نسواں کے تعلق سے، پندرہ تعلیمی واصلاحی نظمیں، بارہ درسی، اخلاقی اور مناظراتی نظمیں، چودہ نظمیں بچوں کے لیے اور چار ترجمہ شدہ نظمیں ہیں۔

ابتدائی نظمیں:

برکھارت،' نشاطِ امید،'حب وطن' اور' مناظرہ رحم وانصاف' وہ نظمیں ہیں جو حالی نے انجمن پنجاب لاہور کے موضوعاتی مشاعروں کے لیے لکھی تھیں۔اول الذکر تین نظمیں 1874 اور مناظرہ رحم وانصاف 1876 کی تحریر کردہ ہیں 'برکھارت' منظریہ نظم ہے۔ جس میں دو موسموں، گرمی اور برسات کی منظر کشی کی گئی ہے۔ ابتدا گرمی کی شدت کے بیان سے ہوتی ہے۔ جس کے اثر کو جنگلی اور پالتو جانوروں، انسان، زمین اور نباتات وغیرہ پر اپنی انتہائی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ اس کے بعد برسات کا ذکر ہے۔ جس میں گھٹا چھانے، بادل گرجنے، پانی برسنے اور اس کے نتیجے میں ہر متنفس کے سکون پانے اور باغوں میں جھولا وغیرہ ڈال کر خوشیاں منانے کا بیان ہے۔ لیکن جیسی منظر نگاری اور پیکر تراشی گرمی کے بیان والے حصے میں ہے برسات والے حصے میں ویسی خوبصورت پیکر تراشی یا منظر کشی نہیں ہے۔

'نشاطِ امید' اس سلسلے کی دوسری نظم ہے۔ اس میں مختلف حوالوں سے امید کو اجاگر کیا گیا ہے اور مایوسی سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس نظم میں حالی کی شخصیت کا رجائی پہلو پوری طرح سے سامنے آتا ہے۔ پہلی نظم کی طرح اس میں خوبصورت تشبیہوں سے حسن پیدا کیا گیا ہے تاہم تلمیحات کی کثرت اس میں مستزاد ہے۔ جگہ جگہ

تلمیحات کے سہارے سے قاری کے اندر حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش بطورِ خاص نمایاں ہے۔ حالی امید سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

خاطرِ رنجور کا درماں ہے تو — عاشقِ مہجور کا ایماں ہے تو
نوح کی کشتی کا سہارا تھی تو — چاہ میں یوسف کی دل آرا تھی تو
پانڈوں کے ہمراہ چڑھی رن میں تو — رام کے بھی ساتھ پھری بن میں تو
تو نے سدا قیس کا بہلایا دل — تھام لیا جب کبھی گھبرایا دل
ہو گیا فرہاد کا قصہ تمام — پر ترے فقروں پہ رہا خوش مدام
تو نے ہی رانجھے کی یہ بندھوائی آس — ہیر تھی فرقت میں بھی گویا کہ پاس
ہوتی ہے تو پشت پہ ہمت کی جب — مشکلیں آساں نظر آتی ہیں سب

'حبِ وطن' حالی کی وطنی اور قومی شاعری کا پہلا سنگ میل ہے۔ حالی کا یہ پسندیدہ موضوع ہے۔ بعد میں حالی کے یہاں اس موضوع نے وسعت اختیار کی اور ان کی ایک اہم شناخت بنا۔ ہمارے ناقدین اس نظم کا موضوع 'قومی، ملی یا ملکی جذبے سے سرشاری' قرار دیتے ہیں جو درست نہیں ہے۔ دراصل اس نظم کا موضوع پردیس میں وطن کی یاد ہے۔ یا آپسی اتحاد و اتفاق ہے۔ نظم کے واقعات کا انتخاب اور اس کا موڑ واضح اشارہ کر رہا ہے کہ حالی لاہور میں کسی نوع کے تعصب کا شکار ہوئے تھے، یا انھیں وہاں کوئی تکلیف پہنچی تھی جس کے غم کا بیان یا اس کا مخفی اظہار یہ نظم ہے۔ نظم میں حالی کے درد و غم کے ساتھ کہیں کہیں ہلکا طنز بھی نمایاں ہو جاتا ہے جو مذکورہ مفروضے کو مزید تقویت بخشتا ہے۔ نظم میں وطن سے مراد ملک نہیں بلکہ ان کا آبائی وطن رشہر ہے جو انھیں پردیس میں اپنی جزئیات کے ساتھ یاد آرہا ہے اور انھیں ناسٹلجیا کی کیفیت میں مبتلا کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کی عمومی صورت حال اور یہاں کے لوگوں کی نفسیات بھی اس نظم میں بیان کی گئی ہے۔

حالی کی خوبی یہ ہے کہ وہ جس طرح زبان کے معاملے میں بے مدبرل ہیں ویسے ہی ان کا معاملہ شعری صنائع کے استعمال میں بھی ہے۔ ان کے یہاں تشبیہات و استعارات اور تلمیحات عرب و ایران کے مقابلے میں ہندوستان سے نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں، سامنے کے ہوتے ہیں اور خوب ہوتے ہیں۔ اس نظم سے حالی کے تاریخی شعور کا انداز ہ بھی ہوتا ہے۔ عرب و عجم کی تاریخی شخصیات کے ساتھ آریوں کے ہندوستان آنے، یہاں کے باشندوں کو شدر بنانے کا ذکر اور رام چندر جی کے بن باس کے واقعات جیسے حوالے نظم کے کینوس کو وسیع کرتے ہیں۔ وطن سے محبت کے متعلق یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

ہو مسلمان اس میں یا ہندو بودھ مذہب ہو یا کہ برہمو
جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی جین مت ہو یا ہووے ویشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک میں اتفاق سے آزاد شہر میں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر کھاتا غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر

'مدو جزر اسلام' معروف بہ مسدس حالی (1879)

مسدس مدو جزر اسلام اپنے عہد کی سب سے زیادہ مقبول کتب کے قارئین و سامعین کی انتہائی پسندیدہ اور حالی کی بے حد اہم، اثر انگیز اور شاہکار نظم ہے جو سرسید کی ترغیب و تحریک پر قلم بند کی گئی۔ سرسید کا یہ قول ملاحظہ فرمائیے:

> "حالی سے ہم نے کہا۔ اے میرے مخدوم! خدا نے تم کو زبان دی ہے۔ معجز بیان دی ہے۔ للہ اپنی قوم کے حال پر روؤ۔ قوم کی جو تباہ حالت ہے اس پر مثل قرطبی کے مرثیہ لکھ دو۔"

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مرتبہ اصغر عباس، لکھنؤ 1982، ص 68)

اور جب حالی نے مسدس کی ہیئت میں قوم کا مرثیہ لکھ کر 'مدو جزر اسلام' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کی تو سرسید نے اس کے مطالعے کے بعد اپنے جذبات و تاثرات کا اظہار یوں کیا:

> "جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہوگا۔۔۔۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے جو بات دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ بے شک میں اس کا محرک ہوا۔ اور اس کو میں ان اعمالِ حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔۔۔۔"

(مکاتیب سرسید، جلد اول، مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، ص 48)

مسدسِ حالی کو قومی و ملی شاعری میں ایک نئی آواز سے تعبیر کرنا چاہیے۔ جس سے ادبی نظریات کی سمت اور سماجی تحریکوں کے رخ متعین ہوتے ہیں۔ اس میں مسلمانوں کو ماضی کے کارنامے دکھلا کر ان کے دلوں میں موجودہ صورتِ حال سے بیزاری پیدا کرنا اور انھیں ایک روشن مستقبل کے لیے تیار کرنا تھا۔ یہ نظم

دراصل مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان اوران کے علمی، اخلاقی، سائنسی اور سیاسی صلاحیتوں اور فتوحات کا مرثیہ ہے۔حالی نے ماضی میں اسلاف کے کارناموں اور حال میں اپنی قوم کی بے عملیوں کے تضاد سے نظم کے طنز،تاسف اور تاثر میں ایسی شدت پیدا کی ہے کہ قاری وسامع کے ذہن ودل عرصے تک ان کے اثر سے آزاد نہیں ہوپاتے۔

نظم کا آغاز مسلمانوں کی زبوں حالی اور بے حسی کے بیان سے ہوتا ہے۔اس کے بعد عرب کے دورِ جاہلیت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔بعدازاں اسلام کی آمد،اس کی تعلیمات،اس کی شان وشوکت کا ذکر اور دینی اور دنیاوی ترقیوں کے اعتبار سے پوری دنیا میں مسلمانوں کے سبقت لے جانے کا بیان ہے۔حالی یورپی ممالک اور ہندوستان کی دوسری قوموں کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ دنیا کی قوموں کو مسلمانوں نے ہی پہلے پہل جہاں بانی وجہاں پیمائی کے ساتھ ساتھ علم،تہذیب اور ترقی کے دوسرے علوم وفنون سکھائے تھے۔مسلمانوں کی ترقی سے پہلے ان قوموں کے حالات کی تصویر کشی حالی یوں کرتے ہیں :

وہ نیشن جو ہیں آج گردوں کے تارے — دھندلکے میں پستی کے پنہاں تھے سارے
نہ وہ دور دورہ تھا عبرانیوں کا — نہ یہ بخت و اقبال نصرانیوں کا
پراگندہ دفتر تھا یونانیوں کا — پریشاں تھا شیرازہ ساسانیوں کا
جہازِ اہلِ روما کا تھا ڈگمگاتا — چراغِ اہلِ ایراں کا تھا ٹمٹماتا
ادھر ہند میں ہر طرف تھا اندھیرا — کہ تھا گیان گُن کا لدایاں سے ڈیرا
ادھر تھا عجم کو جہالت نے گھیرا — کہ دل سب نے کیش وکنش سے تھا پھیرا
نہ بھگوان کا دھیان تھا گیانیوں میں — نہ یزداں پرستی تھی یزدانیوں میں
وہ قومیں جو ہیں آج غم خوارِ انساں — درندوں کی اور ان کی طینت تھی یکساں
جہاں عدل کے آج جاری ہیں فرماں — بہت دور پہنچا تھا واں ظلم و طغیاں
بنے آج جو گلہ باں ہیں ہمارے — وہ تھے بھیڑیے آدمی خوار سارے
جہاں ابرِ رحمت گہر بار ہے اب — جہاں مُہن برتا لگاتار ہے اب
تمدن کا پیدا نہ تھا واں نشاں تک — سمندر کی آئی نہ تھی موج واں تک

مسدس کے آخر میں معاملہ برعکس ہوجاتا ہے۔مسلمان قوم جس نے پوری دنیا کو تہذیب وترقی سکھلائی تھی،اب وہ خود اپنی بے عملی اور بداعمالیوں کی بناپرعلم وہنر سے دور،مذہب واخلاق سے بیزار،لہولعب میں مبتلا اور آپسی انتشار میں مشغول نظر آتے ہیں۔یہ اشعار ملاحظہ کیجیے :

بڑھے جس سے نفرت وہ تحریر کرنی　　جگر جس سے شق ہو وہ تقریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی　　مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی
یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ　　یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر　　جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر　　کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں　　پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں　　اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں　　شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے　　نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

نہ سنی میں اور جعفری میں ہو الفت　　نہ نعمانی و شافعی میں ہو ملت
وہابی سے صوفی کی کم ہو نہ نفرت　　مقلد کرے نا مقلد پہ لعنت
رہے اہلِ قبلہ میں جنگ ایسی باہم　　کہ دینِ خدا پر ہنسے سارا عالم

ظاہر ہے'مسدسِ حالی' کو جہاں لوگوں کی بڑی تعداد نے پسند کیا وہیں کچھ شاعر وادیب اور بعض مذہبی رہنماؤں نے اس پر سخت تنقیدیں بھی کیں۔ کیونکہ حالی نے مسدس کے ذریعے مسلمانوں کے آزرکدے میں پہلی بار ماننِد ابراہیم بڑی بے رحمی سے بت شکنی کی تھی۔ جانے انھوں نے کتنے اصنام توڑے؛ شاعری کی روایت کے، رسم ورواج کے، عقائد وافکار کے، نظریات کے، عادات وخصائل کے اور مکر وفریب کے۔ بہر حال ان تنقیدوں میں سے ایک چیز یہ سامنے آئی کہ مسدس کا اختتام مسلمانوں کے زوال کے بیان پر ہوا ہے جس کی وجہ سے قوم میں مایوسی پھیلے گی۔ چنانچہ بعد میں حالی نے مسدس کا ضمیمہ لکھا جس میں قوم کے نوجوانوں کو یہ بتایا گیا کہ کس طرح ان کے اسلاف نے دینی اور دنیاوی ترقی کے مراحل طے کیے تھے۔ اور پھر انھیں یہ باور کرایا گیا کہ ان جوانوں کے اندر آج بھی ایسی خوبیاں موجود ہیں، جن سے وہ بھی یہ سب کچھ کر سکتے ہیں اور ان سے ہی قوم کی امیدیں وابستہ ہیں۔ یوں نظم حوصلہ مندی اور خوش آئند مستقبل کی امید کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ اس ضمیمے کے اختتام پر غزل کے فارم میں ایک مناجات بعنوان'عرضِ حال بجناب سرورِ کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ واکمل التحیات' شامل ہے جسے مسدس میں بیان کیے گئے تمام مقاصد کا خلاصہ کہنا چاہیے۔

ملتِ اسلامیہ کی چودہ سو سالہ طویل داستان کو حالی نے نسبتاً ایک مختصر نظم میں جس فنی ہنر مندی، تاریخی عوامل کے شعور اور صحیح اسلامی نقطۂ نظر کے ساتھ بیان کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ حالی خوب جانتے تھے کہ

مدو جزر اسلام کی داستان کو عرب و عجم کے شاہناموں سے کس طور مختلف ہونا چاہیے چناں چہ انھوں نے مسلمانوں کے رزم و بزم اور حرب و ضرب کے بے شمار کارناموں سے صرف ان بنیادی اقدار کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا جن کے فروغ یا فقدان پر اسلامی تحریک کے عروج یا زوال کا انحصار تھا۔

حالی نے اس نظم میں صنائع بدائع سے پرہیز کیا ہے۔ تشبیہوں کا استعمال کم کیا ہے، پیکر تراشی کی کثرت ہے اور تلمیحات کی کوئی کمی نہیں۔ قرآن و احادیث کے متعدد احکام و واقعات کو بڑی فنکاری کے ساتھ عوامی زبان میں ڈھال کر نظم کا حصہ بنایا ہے۔ نظم میں مختلف اقوام وممالک کے اشخاص، مقامات اور واقعات کے حوالے اس تواتر سے آئے ہیں کہ حالی کی تاریخی، تہذیبی اور جغرافیائی معلومات پر حیرت ہوتی ہے۔ مسدس کی ایک بڑی خوبی اس کی زبان ہے۔ حالی نے اردو کے ساتھ ہندی، علاقائی، عوام میں رائج اور گھریلو بول چال کی زبان کو نگینوں کی طرح اس نظم میں سجایا ہے اور محاوروں اور ضرب الامثال سے اس کے حسن اور اس کی شیرینی کو دوبالا کیا ہے۔

مسلمانوں کی تعلیم (1889)

یوں تو مولانا کی کوئی بھی نظم نصیحت سے خالی نہیں ہوتی مگر ایک نظم بعنوان 'مسلمانوں کی تعلیم' جو انھوں نے ترکیب بند کی ہیئت میں لکھی ہے؛ اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں زمانہ ایک کردار کے طور پر ظاہر ہوتا ہے اور وہ مسلمانوں سے مخاطب ہو کر انھیں خوابِ غفلت سے بیدار ہونے اور علم و ہنر اور صنعت و حرفت میں ترقی کرنے کی نصیحت کرتا ہے۔ نظم کا پہلا بند ملاحظہ کیجیے:

زمانہ دیر سے چلا رہا ہے اے مسلمانو — کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز پہچانو
سنے ہوں گے نہ معنی "لاتسبوالدہر" کے تم نے — تو اب سن لو کہ ہوں میں شان ربانی مجھے مانو
وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے — اگر میری نہ مانو گے تو پچھتاؤ گے نادانو!
مری بازی کا منصوبہ گیا کب کا پلٹ یارو — خبر تم کو بھی ہے کچھ اے مری چالوں سے بے گانو
گئے وہ دن کہ لاکھوں بے ہنریاں عیش کرتے تھے — ہوا ہے باہنر جینا بھی اب مشکل مری جانو!
مٹے ہو جس ہنر اور فن پہ تم وہ مٹنے والے ہیں — یہ سودا کب تک اے شمع سحرگاہی کے پروانو!
بھرا سمجھے ہو جس گھر کو نہیں دیار واں کوئی — کہاں بیٹھے ہو تم اے خانۂ ویراں کے دربانو!

نصیحت میری مانو اب بھی اپنی ہٹ سے باز آؤ
پھری جس وقت دیکھو میری چتون تم بھی پھر جاؤ

چپ کی داد (1905)

مسدسِ حالی، مناجاتِ بیوہ اور حقوقِ اولاد کی طرح 'چپ کی داد' بھی بار بار الگ کتابی شکلوں میں شائع ہوتی رہی ہے۔ 1937 میں شائع ہونے والے اس نظم کے سولہ صفحے کے کتابچے کے سرورق پر یہ تحریر درج ہے:

> "یہ نظم مولانا مرحوم نے ایڈیٹر صاحب رسالہ خاتون علی گڑھ کی فرمائش پر ۱۹۰۵ء میں لکھی تھی۔ رسالہ میں شائع کرنے کے علاوہ ایڈیٹر صاحب نے اسے اسی وقت علیحدہ بھی کتابی شکل میں چھاپا تھا۔ موجودہ ایڈیشن اسی کی نقل ہے۔"

(چپ کی داد، حالی بک ڈپو، پانی پت، جولائی، 1937)

گویا یہ نظم اپنے وقت کے سب سے بڑے حامی تعلیمِ نسواں مولوی ممتاز علی کی فرمائش پر مولانا حالی نے لکھی تھی۔ مناجاتِ بیوہ کی طرح 'چپ کی داد' بھی ہمدردیِ نسواں سے متعلق ہے۔ ہمارے ناقد نظم کا موضوع عورتوں کی مظلومیت بتاتے رہے ہیں جو بہت زیادہ صحیح نہیں۔ دراس نظم کا بنیادی موضوع و مقصد تعلیمِ نسواں ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ نظم کے آخر میں کس طرح لڑکیوں کو حقِ تعلیم کی بشارت دی گئی ہے :

گو نیک مرد اکثر تمھارے نام کے عاشق رہے　　پر نیک ہوں یا بد، رہے سب متفق اس رائے پر
جب تک جیو تم، علم و دانش سے رہو محروم یاں　　آئی ہو جیسی بے خبر، ویسی ہی جاؤ بے خبر
تم اس طرح مجہول اور گمنام دنیا میں رہو　　ہو تم کو دنیا کی، نہ دنیا کو تمھاری ہو خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات　　ٹھیرا تمھارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سربسر
آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب　　دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

ساتھ ہی تعلیم سے محرومی کی بنا پر بچپن کی شادی، ستی ہونے اور بیوگی کی کربناک زندگی گزارنے پر مجبور کیے جانے جیسے مسائل کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ یہ سارے جبر و ظلم عورتوں کے تعلیم یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے ان پر ہو رہے ہیں۔

چپ کی داد میں حالی نے نہ صرف عورتوں کے مظلوم طبقے کی وکالت کی ہے بلکہ مشرقی خاتون کے ایک مثالی کردار کے طور پر ان کی بڑی ہی سچی تصویر بھی پیش کی ہے۔ حالی نے عورت کو اس نظم میں ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے روپ میں دیکھا اور یہ غور کیا ہے کہ وہ اپنے میکے میں بھی سارے کام کرتی ہے، سسرال میں بھی اسے سکون نہیں ملتا اور دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ بچوں کی پرورش کی ساری ذمہ داریاں بھی اسی پر

ڈال دی جاتی ہیں۔ حالی نے اس نظم کے توسط سے مردوں کو پہلے پہل یہ احساس دلایا کہ وہ عورت جس کے بے پایاں مہر و محبت اور ایثار و خدمات کے طفیل میں انھیں گھریلو، معاشرتی اور سماجی زندگی کی حلاوتیں اور سعادتیں اور عزت و وقار نصیب ہیں اور جن کے دم قدم سے ان کی تہذیبی روایات کا بھرم قائم ہے، ان پر مردوں ہی کی جانب سے کیسے کیسے جبر کیے گئے۔ صدیوں سے اب تک کیسے انھیں طرح طرح کے مظالم کا شکار بنایا گیا۔ یہاں تک کہ انھیں یہ یقین دلا دیا گیا کہ تعلیم ان کے لیے قطعاً ضروری نہیں ہے:

علم و ہنر سے رفتہ رفتہ ہوگئیں مایوس تم　　　سمجھا لیا دل کو ہم خود علم کے قابل نہ تھیں

جو ذلتیں لازم ہیں دنیا میں جہالت کے لیے　　　وہ ذلتیں سب نفس پر اپنے گوارا تم نے کیں

سمجھا نہ تم کو ایک دن مردوں نے قابل بات کے　　　تم بیویاں کہلائیں لیکن لونڈیاں بن کر رہیں

یہ نظم طویل بحر میں، ترکیب بند کی ہیئت میں آٹھ بندوں پر مشتمل ہے۔ آٹھویں بند میں چھے اشعار کے بعد 'خطاب بہ حامی تعلیم نسواں' کے عنوان سے بارہ اشعار ہیں۔ آخر کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے جس میں اس واقعے کی طرف واضح اشارہ ہے جس میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے والیہ بھوپال بیگم سلطان جہاں نے رقم فراہم کی تھی۔ شعر میں سلطان جہاں کے نیچے خفی خط میں 'والیہ بھوپال' بھی تحریر ہے:

جو حق کے جانبدار ہیں بس ان کے بیڑے پار ہیں　　　بھوپال کی جانب سے یہ، ہاتف کی آواز آئی ہے

ہے مہم جو درپیش، دستِ غیب ہے اس میں نہاں　　　تائیدِ حق کا ہے نشاں، امدادِ سلطانِ جہاں

بچوں کی نظمیں (1904-1908):

حالی کو بچوں کے شاعر کی حیثیت سے کم لوگ جانتے ہیں۔ ایک تو اس وجہ سے کہ حالی کی قومی، اصلاحی اور مقصدی شاعری کا رنگ بے حد شوخ تھا جس کے سامنے بچوں کی شاعری کا رنگ زیادہ نہ نکھر سکا۔ دوسرے اس زمانے میں مولوی محمد اسماعیل میرٹھی بچوں کی دلچسپی، ان کی نفسیات اور درسیات کے پیش نظر کثرت سے اور کہیں زیادہ عمدہ شاعری کر رہے تھے۔ اور تیسرے یہ کہ حالی نے بچوں کے لیے نہ زیادہ نظمیں لکھیں اور نہ زیادہ دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا کہ ان کے مقاصد و منہاج کچھ اور تھے۔ بہر حال مولانا حالی نے بچوں کے لیے جو نظمیں لکھی ہیں ان کی کل تعداد چودہ ہے۔ ان میں بچوں کی دلچسپی، نفسیات، عام معلومات اور اخلاقیات کو ذہن میں رکھا گیا ہے۔ یہ نظمیں مختلف تفریحی اور معلوماتی موضوعات سے متعلق ہلکی پھلکی زبان اور آسان بحروں میں ہیں۔ ان میں ناصحانہ انداز کے بجائے بیانیہ طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے اور بڑی ہی خوبصورتی سے ان میں اصلاحی یا اخلاقی درس کو پیش کیا گیا ہے۔

ان نظموں کو عام طور سے ہمارے ناقدین طبع زاد سمجھتے ہیں۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ ٹریننگ کالج، لاہور کے پرنسپل، مسٹر ایچ۔ ٹی۔ نولٹن نے حالی کے صاجزادے خواجہ سجاد حسین کی معرفت انگریزی مضامین کے کچھ تراجم حالی کے پاس بھجوائے تھے کہ وہ انھیں بچوں کے لیے اردو میں منظوم کر دیں۔ حالی نے وقت کی تنگی یا پیرانہ سالی کے ضعف کے باعث ترجمے میں اپنے بعض دوستوں اور شاگردوں کی مدد لی اور پھر ان کی اصلاح و ترمیم اور حذف و اضافے کے بعد خواجہ سجاد حسین کی معرفت ہی مسٹر نولٹن کو بھجوا دیں۔

1908 میں مسٹر نولٹن نے بچوں کے لیے نظموں کا ایک مجموعہ 'اطوار بازیچہ' کے نام سے شائع کیا، جس میں ترجمہ شدہ بارہ نظمیں حالی کے نام سے شامل ہوئیں۔ یا تو یہ کہ ترجمے میں عام طور سے دوسروں کی مدد لی جاتی ہے، یا پھر یہ کہ ان کی اصلاح و ترمیم حالی نے ہی کی تھی، شاید اسی لیے خواجہ سجاد حسین نے ترجمہ شدہ نظموں کے تعلق سے یہ وضاحت ضروری نہیں سمجھی کہ ان میں حالی کے علاوہ دوسروں کی معاونت بھی شامل ہے۔ اب خواجہ سجاد حسین کے نام حالی کے خط کا یہ اقتباس دیکھیے جو 22 اکتوبر 1903 کے خط سے ماخوذ ہے :

"نظمیں ۱، ۲، ۳، ۵، ۶، ۷، ۸، ۱۰، میں نے دیکھ لیں اور صاف بھی ہو گئیں سو ان کو آج کی ڈاک میں روانہ کرتا ہوں۔ نظم نمبر ۱۲ شاید کل پرسوں تک روانہ ہو سکے کیوں کہ اس کو از سرِ نو لکھنا ہے۔ تین نظمیں ۴، ۹، ۱۲، ابھی تک دلی سے نہیں آئیں اور نمبر ۱۱ آئی ہے مگر وہ اردو زبان میں مشکل سے منظم ہو سکتی ہے۔۔۔۔ مولوی محمد سعید صاحب نے جو بالفعل مولوی لطیف حسین خاں کی جگہ بورڈ ہائی اسکول دہلی میں عربی فارسی کے مدرس ہیں۔۔۔ انھوں نے بعض نظمیں خصوصاً 'روٹی کیسے پکتی ہے؟' ایسی عمدہ لکھی ہے کہ میں ہرگز ایسی نہ لکھ سکتا۔ میں نے ان نظموں میں جو تصرف کیا ہے وہ صرف اس خیال سے کہ بچے ان کو اچھی طرح پڑھ سکیں اور کوئی الجھٹ باقی نہ رہے، یا کوئی بات سرکاری تعلیم کے اصول کے خلاف نہ ہو۔ جن مضامین کا ترجمہ تم نے بھیجا ہے اس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ مرغی اور بچے، ۲۔ بلی اور چوہا، ۳۔ جنگل، ۴۔ گھڑیاں اور گھنٹے، ۵۔ سپاہی، ۶۔ چٹھی رساں، ۷۔ پیشے، ۸۔ روٹی کیوں کر پکتی ہے، ۹۔ موچی، ۱۰۔ دھان بونا، ۱۱۔ بڑھئی، ۱۲۔ جولاہا۔" (مکتوباتِ حالی، ص 50-349)

لیکن نظموں کی اشاعت کے وقت بعض نظموں کے عنوان تبدیل کیے گئے۔ کلیات میں شامل نظموں کے عنوانات یہ ہیں: 'خدا کی شان'، بڑوں کا حکم مانو، مرغی اور اس کے بچے، بلی اور چوہا، شیر کا شکار، پیشے، گھڑیاں اور گھنٹے، دھان بونا، روٹی کیوں کر میسر آتی ہے، موچی، چٹھی رساں، سپاہی، ایک چھوٹی بچی کے خصائل، نیک بنو

نکی پھیلاؤ۔ان نظموں کے لیے قطعہ، مثنوی، مربع، مخمس اور مسدس کی ہیئتیں استعمال کی گئی ہیں۔ زمانہ تحریر 1904 سے لے کر 1908 تک ہے۔

مکالماتی نظمیں:

اردو میں باضابطہ مکالماتی نظموں کی بنیاد حالی نے ڈالی ہے۔انھوں نے خالص اس نوع کی چار نظمیں لکھی ہیں۔'مناظرہ رحم و انصاف'،'واعظ اور شاعر کا مناظرہ'،'پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ' اور'دولت اور وقت کا مناظرہ'۔ان کے علاوہ ان کے بعض قطعات بھی مکالماتی ہیں مثلاً 'عقل اور نفس کی گفتگو' وغیرہ۔

'مناظرہ رحم وانصاف' میں حالی نے بعض قدیم فارسی شعرا کے تمثیلی و مکالماتی اسلوب کا احیا کیا ہے۔ اور'مناظرہ واعظ و شاعر' میں واعظ و شاعر کی نفسیاتی تحلیل جس صداقت اور لطیف طنز و مزاح کی رنگ آمیزی کے ساتھ کی گئی ہے اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔'پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ' میں ایکا (اتحاد) کہتا ہے کہ قوم میں سرفرازی اور سربلندی میری وجہ سے ہے۔پھوٹ (عداوت) اتحاد سے کہتا ہے کہ تمھاری جو عظمت ہے وہ میری وجہ سے ہے اور تمھاری فتح بھی محض میرے دم سے ہے، کیوں کہ میں مخالف جماعت میں اپنا تسلط قائم کر لیتی ہوں۔دولت اور وقت کے مناظرے میں بھی دونوں کے اپنے اپنے دلائل ہیں، اپنی اپنی منطق ہے۔دونوں اپنی اپنی اہمیت کے دعوے کرتے ہیں۔دولت اچھی زندگی اور تعلیم کے حصول میں اپنی اہمت بتاتا ہے۔ وقت اپنی افضلیت یوں ثابت کرتا ہے کہ تم اگر کھو گئے تو واپس آسکتے ہو لیکن اگر کوئی مجھے کھو دے تو میں پلٹ کر کبھی واپس نہیں آتا ہوں۔اس سلسلے کی سب سے عمدہ اور دلچسپ نظم'واعظ اور شاعر کا مناظرہ' ہے۔نظم کی ابتدا ایک خواب سے ہوتی ہے اور پورا مناظرہ خواب میں ہی ہوتا ہے۔نظم میں مناظرے کی مجلس آراستہ ہے۔واعظ و شاعر دونوں ایک دوسرے کی شخصیت اور اس کے علم کی خامیاں گنواتے ہیں اور ہر ایک اپنے فضل و کمال کے اظہار سے دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا ہے۔مگر آخر میں جب دونوں کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر ہوتے ہیں تو ، ایک دوسرے سے لڑنے کے بجائے دونوں نہایت دوستانہ ماحول اور بڑے ہی خوش گوار موڈ میں مناظرے کا اختتام کرتے ہیں:

قبلہ اب وہ دن گئے کہ شاعروں کی قدر تھی	شاعری اور نکتہ پردازی میں ہے اب کیا دھرا
اب تو یہ کہتا ہوں شعروشاعری کو چھوڑ کر	وعظ میں شاگرد ہوجاؤں کسی استاد کا
کی سخن پرداز نے واعظ سے جب یہ گفتگو	قہقہوں سے چارسو مجلس میں اک غل پڑ گیا
خواب کا سارا سماں جاتا رہا سب یک بیک	اور دی پہلو سے دل نے کان میں میرے صدا
ہزل ہو یا پند نصیحت لیجیے ہر بات سے	کہہ گئے ہیں اہل دل دع ما کدر،خذ ما صفا

ان تمام نظموں میں منطقی استدلال کے علاوہ شاعرانہ تخیل کی نکتہ آفرینی کا انداز بھی بڑا دلچسپ اور انوکھا ہے۔ اس طرح کی نظموں کا مقصد ظاہر ہے دلچسپی اور حظ کے پیرائے میں اطلاع بہم پہنچانا، علم و ہنر کی ترغیب دینا، اخلاق کی درستگی اور مخصوص مقاصد کے لیے راہ ہموار کرنا ہے۔ 'مناظرہ رحم و انصاف' سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

عزتِ قوم چاہتے ہو اگر　　جا کے پھیلاؤ اُن میں علم و ہنر
ذات کا فخر اور نسب کا غرور　　اٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور
قوم کی عزت اب ہنر سے ہے　　علم سے یا سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دور آئے گا　　بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات　　یاد رکھنا ہماری آج کی بات
گر نہیں سنتے قول حالیؔ کا　　پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

ترجمہ شدہ نظمیں / منظوم ترجمے:

حالی نے دوسری زبانوں سے چار نظموں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ جن کے عنوانات ہیں: 'زمزمۂ قیصری'، 'انگریزی اشعار کا ترجمہ'، 'ناقدری' اور 'واقعہ ہجرت'۔ اول الذکر نظم انگریز شاعر مسٹر ایسٹوک کی ایک نظم کے تین حصوں میں سے ایک حصے کا ترجمہ ہے۔ حالی نے اس کا ترجمہ اپنی مرضی سے، یا براہ راست انگریزی زبان سے نہیں کیا۔ بلکہ اسے اس وقت کے دہلی کے کمشنر کے حکم سے اردو نثر سے منظوم کیا تھا۔ یہ منظوم ترجمہ ترکیب بند کی ہیئت میں پینتیس بندوں پر مشتمل ہے۔ ترجمے میں شامل حالی کی تحریر سے یہ اقتباس دیکھیے:

> "اس نظم کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ہندوستان اور مسلمان بادشاہوں اور انگریزی سلطنت کا ذکر ہے۔ دوسرے اور تیسرے حصے میں تمام رئیسوں کا، جو دربار قیصری میں شریک ہوئے تھے، عموماً اور حضور نظام کا خصوصاً تذکرہ ہے۔ مصنف نے پہلے حصے میں بعض مسلمان بادشاہوں پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ ناظرین اس کو دیکھ کر مجھ سے خوش یا ناراض نہ ہوں۔ میرا صرف اتنا قصور ہے کہ میں نے ان خیالات کو ایک ایسی زبان میں نظم کر دیا ہے، جس کو میرے ہم وطن سمجھ سکتے ہیں۔"
>
> (کلیاتِ نظم حالی، جلد دوم، 1970، ص، 96-295)

دوسری نظم 'انگریزی اشعار کا ترجمہ' کے عنوان سے دیوان میں شامل ہے۔ مولانا نے یہ ترجمہ کس کی ایما پر اور کہاں سے کیا ہے اس کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا۔

تیسری نظم 'ناقدری' انگریزی شاعر گرے کی مشہور نظم Elegy کے ایک بند کا ترجمہ ہے۔ حالی نے یہ

ترجمہ محمڈن کالج علی گڑھ، کے آنریری سکریٹری حاجی محمد اسحاق صاحب کے برادر معظم کی فرمائش پر کیا تھا۔ یہ صرف چار مصرعوں کی نظم ہے، جس پر رباعی کا گمان ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

موتی ہزار قعر سمندر میں ہوں نہاں ۔۔۔ پر یہ بتاؤ ان کا خریدار ہے کہاں
کھلتے ہیں پھول سیکڑوں ویران دشت میں ۔۔۔ ہے کون رنگ و بو کا وہاں اُن کے قدرداں

چوتھی اور آخری مترجمہ نظم حضرت علیؓ کے اشعار کا براہ راست عربی سے ترجمہ ہے۔ مولانا نے یہ ترجمہ خلیفہ محمد حسین وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کی فرمائش پر 30 نومبر 1886 کو لاہور میں کیا تھا۔ ظاہر ہے ان نظموں کے ترجمے میں مولانا کی ذاتی خواہش کو کوئی دخل نہیں ہے۔ البتہ ان تمام نظموں کی سادگی، صفائی اور روانی حالی کے مزاج، ان کے دلنشیں اسلوب اور فن ترجمہ نگاری سے ان کی واقفیت کی غماز ہیں۔

☆☆☆☆

طارق محمود مرزا (سڈنی؛ آسٹریلیا)

اقبالؒ کے فکری مآخذ

شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کے فکری مآخذ کے متعلق مختلف قیاس آرائیوں کا سلسلہ ان کی حیات میں شروع ہو گیا تھا جو ابھی تک تھما نہیں ہے۔ خصوصاً ان کے شہرۂ آفاق اور معراجِ انسانیت "فلسفۂ خودی" کے متعلق مختلف نقادوں نے مختلف یورپی علمی شخصیات کے نام لیے ہیں۔ زیادہ تر کی تان فرانسیسی فلسفی نطشے پر ٹوٹی ہے جس نے "مردِ کامل" کے نام سے عظمتِ انسانی کا فلسفہ پیش کیا تھا۔ ابھی کل ہی میں جوش ملیح آبادی کی کتاب "یادوں کی بارات" پڑھ رہا تھا، انھوں نے بھی اقبالؒ پر طنز کے تیر برساتے ہوئے لکھا کہ انھوں نے نطشے کے مردِ کامل کو مسلمان کر کے مردِ مومن بنا دیا ہے۔ خیر جوش صاحب نے تو اس کتاب میں اور بھی بہت کچھ لکھا ہے جس میں اپنے تئیں معاشقوں، اپنی بادہ خوری، شب و روز کی عیاشیوں، کانگریس کا ساتھ دینا اور مسلم لیگ کی مخالفت، ہندو نوازی، مسلم دشمنی، قیامِ پاکستان کی مخالفت اور پھر اسی پاکستان میں سرکاری مراعات سے استفادہ اور پھر پاکستان چھوڑ کر ہندوستان لوٹ جانے تک، ان کی کوئی کل سیدھی دکھائی نہیں دی۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ مشرق اور مغرب دونوں بحرِ علم کے غواص تھے۔ کارل مارکس، گوئٹے، ارسطو، ابنِ خلدون، رازی، رومی، نطشے، آئن سٹائن، بائرن، پٹوفی، ہیگل، مزدک سمیت علم و ہنر کے کتنے ہی تابندہ چراغ تھے جن سے اقبالؒ نے اکتسابِ فیض کیا۔ تاہم ان تمام حکما سے علامہؒ نے اپنے نظریات کو خلط ملط نہیں ہونے دیا، بلکہ ایک بلند پایہ مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے اپنی سوچ اور اپنا نظریہ منفرد اور جداگانہ رکھا۔ کہاں نطشے کا مردِ کامل جو بے روح مشین کی طرح ہے اور کہاں اقبال کا مردِ مومن جس کی خودی کا سرِ نہاں لا الہ الا اللہ ہے۔ ویسے بھی شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ کی فکر اور فلسفہ تہذیبِ مشرق کا عکاس ہے جو عمومی طور پر مغربی فکر کے برعکس ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

علامہؒ کے فکر و نظر میں بوعلی اور رازی کا انداز اور رومی کا سوز و ساز ان کے کلام کو الہامی بنا دیتا ہے۔ علامہ اقبالؒ رومی جیسے مردِ عارف کے مداح تھے جس کی فکر میں سوز ہے۔ وہ انھیں پیرِ رومی کہتے تھے اور خود کو مریدِ ہندی۔ انھوں نے بوعلی کو عقل و دانش اور رومی کو عشق و مستی کا استعارہ قرار دیا۔ اقبال فرماتے ہیں:

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی

یورپ سے لوٹنے کے بعد اقبالؒ کے اندر ایسی انقلابی تبدیلیاں آئیں کہ انھوں نے وطنیت اور قومیت کا جال توڑ کر اسلام کا علم تھام لیا۔ وہ مفکرِ اسلام، حکیم الامت اور ترجمان القرآن بن کر احیائے اسلام اور نشاۃِ اسلامیہ کے علمبردار بن کر نمایاں ہوئے۔ چنانچہ اگلے تیس برس جو ان کی زندگی کے تھے وہ انھوں نے اسلام کے نظامِ فکر، فلسفۂ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت اور پیغام کو عام کرنے میں صرف کیے۔ اس کے بعد انھوں نے قرآن کے پیغام کو عام کرنے کے لیے جیسے خود کو وقف کر دیا۔ دیکھیے کس درد بھرے لہجے میں حضور رسالت مآب ﷺ سے مناجات میں عرض گزار ہیں:

> ''اے اللہ کے رسول ﷺ! اگر میرے دل کی مثال اس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو اور اگر میری شاعری میں قرآن کے بجز کسی اور شے کی ترجمانی ہو تو آپ میرے فکر کا پردہ چاک کر دیجیے اور اس چمن کو مجھ جیسے کانٹے سے پاک کر دیجیے۔ مزید برآں قیامت کے دن مجھے ذلیل و رسوا کیجیے گا اور اپنی قدم بوسی سے محروم کر دیجیے گا۔''

آغاز ہی سے اقبال کے کلام اور پیام میں قومی اور ملی شعور نمایاں تھا۔ انھوں نے تاریخ اسلام، اسلامی علم و فلسفہ، فقہی مباحث اور قرآن و سنت کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ تاریخ اسلام سے ان کی فکر کو جلا ملی۔ اس علمی آگہی کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ کی عظمتِ رفتہ کے زوال، اس کی زبوں حالی، بیشتر مسلمان ملکوں کی غلامی، جہالت اور یورپ کی غاصبانہ نو آبادیاتی پالیسی نے اقبالؒ کے عقل و شعور کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ مسلمانوں کے علمی ورثے، اسلامی تاریخ، مسلم مفکرین، علما، حکما کے کارنامے اسلام کے سنہری اصول، مسلمانوں کی فکری تحریکوں اور مغرب کے فلسفے کے گہرے مطالعے نے اقبالؒ کو اپنی بنیاد یعنی سیرت النبی ﷺ اور قرآن کے قریب کر دیا۔ قرآن کریم ان کے شعور سے تحت الشعور تک سرایت کرتا چلا گیا۔ انھیں بیشتر مسائل کا حل اس الہامی کتاب میں دکھائی دینے لگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قرآن سے ان کا رشتہ گہرے سے گہرا ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ قرآن اور صاحبِ قرآن ان کے فکر و فلسفہ کا محور بن گئے۔ چنانچہ اقبالؒ قرآن کے ایسے مفسر اور شارح بن کر سامنے آئے جنھوں نے اس الہامی پیغام کو شعری اسلوب میں ڈھال کر نیا رنگ و آہنگ دیا جو تاقیامت اہلِ ایمان کے قلب و ذہن کو گرماتا رہے گا۔ علامہؒ کے کلام میں قرآنی پیام بھی ہے اور شعری حسن بھی ہے اور انتہائی موثر پیرایہ بھی۔ جس سے کوئی بھی حساس قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا، صفت میں سورہ رحمٰن

جہاں تک عقلی خیالات کا تعلق ہے، اقبالؒ کے نزدیک استدلالی اور طبیعی عقل حیوانی جذبات کے تابع ہوتی ہے اور انسان کے خیالات اور فکر و نظر میں تنگی کا باعث بنتی ہے جس سے عام قاری کو مغالطہ ہوتا ہے اور وہ ہر قسم کی عقل کو بے کار سمجھنے لگتا ہے۔ اقبالؒ عقل جزوی کے قائل نہیں کیونکہ یہ عقل ایمانی اور عقل نبوی ﷺ کی نفی کرتی ہے۔ ایسے گمراہ کن فلسفے انسان کو خدا اور خودی دونوں سے دور کر دیتے ہیں۔

اقبالؒ نے اپنی شاعری اور فلسفے کے ذریعے حقیقت حیات تک رسائی آسان بنادی ہے جو انسان کو تحت معراج تک پہنچا سکتی ہے۔ تاہم یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اقبال زندگی کی حقیقت سے آگاہ ہونے کے باوجود وجدان پر زیادہ یقین رکھتے ہیں کیونکہ بنیادی طور پر وہ ایک صوفی ہی تھے۔ اقبال غالباً دنیا کے واحد فلسفی ہیں جو شعر کو ذریعۂ اظہار بنا کر فکر کو فن کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن انھیں شعر اور فلسفے کے فرق کا ادراک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آپس میں مدغم ہو کر کہیں بھی تضاد پیدا نہیں کرتے۔ اسی طرح آیاتِ قرآنی بھی ان کے اشعار کی زینت بن کر ان کے نظریۂ حیات کو مزید تقویت عطا کرتی ہیں۔ کتاب اللہ کی آیات کو اشعار میں استعمال کرنا ایک نہایت دقیق کام ہے لیکن یہ کام علامہؒ نے نہایت مہارت اور خوبی سے کیا ہے۔ اقبالؒ کی عقل اور دانائی فکرِ انسانی تک محدود نہیں بلکہ اس کے مآخذ قرآن و سنت بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا پیغام واضح اور ابہام سے پاک ہے۔

خالق کائنات، اس کے حبیب محمد ﷺ اور اس کی کتاب قرآنِ مجید سے علامہؒ کا تعلق اتنا گہرا تھا کہ ان کے ذہن و قلب اور فکر و فلسفہ پر حاوی تھا۔ وہ کلام اللہ سے اس طرح جڑ گئے تھے کہ دنیا کی تمام کتب، تمام فلسفے، تمام منظر اس کتاب سے پیچھے رہ گئے۔ انھوں نے یورپ کی سیر کی، دنیا کے بہترین فلسفیوں کا مطالعہ کیا، قانون، حکمت اور فلسفے کی تعلیم حاصل کی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا ربط و ضبط صرف قرآن سے باقی رہ گیا، دیگر سب کچھ انھوں نے ترک کر دیا۔ گھر کی لائبریری سے تمام کتابیں اٹھوا دیں۔ اپنے فکر و فلسفے اور شاعری کے لیے صرف ایک مآخذ پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور یہ مآخذ قرآن تھا۔ ان کا شعر ہے:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

☆☆☆☆

حمیرا رحمٰن (نیویارک؛ امریکہ)

حروف چند مری شاعری کے چاروں طرف
کہ جیسے ہاتھ ہو تشنہ لبی کے چاروں طرف
ہزار بار بجھی آنکھ، پھر ہوئی روشن
کچھ آئینے بھی تھے بے چہرگی کے چاروں طرف
بہت سے خواب تھے رنگین، اس کے تھیلے میں
سو لوگ بیٹھ گئے اجنبی کے چاروں طرف
ہوا بدلنے کی آنے لگی ہے خوش خبری
بہت دھواں تھا گذرتی گھڑی کے چاروں طرف
ہم آنے والے زمانوں سے دور کیوں نہ رکھیں
جو الجھنیں ہیں ہماری صدی کے چاروں طرف
یہ کھیل آنکھ مچولی کا دادا پوتے میں
ہنسی کا ہالہ ہے سنجیدگی کے چاروں طرف
جزیرے چھوٹے بڑے ہیں کسی تسلی کے
مری نگاہ میں ٹھہری نمی کے چاروں طرف
مکان کھولا گیا گھر میں آنے والوں پہ
شجر لگائے گئے بے گھری کے چاروں طرف
چلو حمیرا کوئی نیک کام کرتے ہیں
اُمنگ بوتے ہیں مردہ دلی کے چاروں طرف

☆☆☆☆

عرفان ستار (کینیڈا)

کون و مکاں سے ماورا، کیسا سکون تھا مجھے
جانے یہ کس مقام پر، وقت نے آلیا مجھے

ممکنہ شکل کوزہ گر، اس سے کہیں حسین تھی
اور ذرا سی دیر تُو، پیار سے سوچتا مجھے

آج میں اس کے قرب میں، ہوتے ہوئے بھی تھا نہیں
یعنی ہوا ہے وصل میں، ہجر کا تجربہ مجھے

عکس و جمال کے سبھی، سلسلے ختم ہو چکے
اس کو بجھا رہا ہوں میں، اور یہ آئینہ مجھے

تیرا نہ میں رہا تو پھر، کوئی نہیں رہا مرا
میں تجھے چھوڑ کر گیا، اور مرا خدا مجھے

میں تو سمجھ رہا تھا بس، رنج سا ایک رنج ہے
اور ترے فراق نے، توڑ کے رکھ دیا مجھے

دشت کو تیرے عشق میں، ایسا کیا ہے پُربہار
آج جنابِ قیس بھی، کہتے ہیں مرحبا مجھے

قرب کی ساری خواہشیں، آج سے خواب ہو گئیں
یعنی کہ آج رات سے، خواب میں دیکھنا مجھے

تُو نے کہا تھا میرے بعد، کوئی نہیں، کبھی نہیں
یاد رہا ہے عمر بھر، تیرا کہا ہُوا مجھے

درد کسے سنائیے، زخم کسے دکھائیے
ڈھونڈ چکا جہاں تہاں، کوئی نہیں ملا مجھے

خواب ہوں یا وجود ہوں، ہست ہوں یا نبود ہوں
یعنی سمجھ نہ آسکا، اپنا معاملہ مجھے

نقش ذرا ابھار کر، رنگ ذرا نکھار کر
چل مرے نقش گر ذرا، ٹھیک سے پھر بنا مجھے

کون سمیٹتا مجھے، کون بھلا سمیٹتا؟
کون بھلا سمیٹتا، کون سمیٹتا مجھے؟

خوابِ سرور اور میں، فرطِ وفور اور میں؟
کیا مجھے جانتا نہیں، بھول گیا ہے کیا مجھے؟

☆☆☆☆

عشرت آفریں (امریکہ)

اوڑھنیوں پر پھول کھلائے ہیں مَیں نے
صدیوں میں یہ نقش بنائے ہیں مَیں نے

چولہا، چکّی، چرخہ مجھ سے ہے منسوب
صدیوں اپنے ہاتھ جلائے ہیں مَیں نے

تم نے خنجر، مَیں نے کی سوئی ایجاد
اور تمھارے عیب چھپائے ہیں مَیں نے

یہ بھی سچ ہے گندم مَیں نے ڈھونڈا تھا
کھیتوں میں یہ بیج اُگائے ہیں مَیں نے

کائنات کا پہلا سُر اک لوری تھی
تم کو تو یہ گیت سکھائے ہیں مَیں نے

ہنسنا رونا دونوں جیون ناٹک تھا
تنہا دو کردار نبھائے ہیں مَیں نے

☆☆☆☆

شاہین کاظمی (سویٹزرلینڈ)

نقش بنتے بگڑتے رہے رات بھر، اِک اداسی مرے خال و خد ہوگئی
زرد پتوں کو چھو کے گزرتی ہوا ، ساری بے تابیوں کی سند ہوگئی

ساحلوں کی ہوا نے بہت دیر تک، سرد پانی کے بوسے لیے تو مگر
جانے والا سفینے سے پلٹا نہیں، آنسوؤں کی سفارش بھی رد ہو گئی

ایک مرتے ہوئے خواب پر جب پڑھا، بھاگتے وقت نے آخری مرثیہ
گو کہ دھڑکن میں جاری تھا ماتم مگر آنکھ روئی نہیں آج، حد ہو گئی

دل جلا ہے تمنا کی سوزش سے اب گھاؤ رسنے لگے ہیں پرانے سبھی
اِک عجب ذائقہ تھا گو انکار کا، اس سوالی کی لیکن مدد ہو گئی

شمع دانوں میں جلتے ہوئے تیل سے جب اچانک ہی شعلہ بھڑکنے لگا
سجدہ گاہوں کی ساری نمی ایک دم، یوں لگا آسمانی رسد ہو گئی

☆☆☆☆

مونا شہاب (واشنگٹن؛ امریکہ)

یقیں گماں کے درمیاں سوالیہ نشان ہے
مرے لیے تو یہ جہاں سوالیہ نشان ہے

لکھی گئیں ہیں ہجرتوں پہ سینکڑوں کہانیاں
مگر ہماری داستاں سوالیہ نشان ہے

سوال تھا کہ گلستاں کا حال کچھ بتائیے
ملا جواب باغباں سوالیہ نشان ہے

محبتوں کے دیوتا منافقت کے شہر میں
تری کھنچی ہوئی کماں سوالیہ نشان ہے

سمٹ گئی زمین تو نشان حد کا مٹ گیا
مگر فلک کی حد کہاں سوالیہ نشان ہے

سوال نفرتوں کی مد میں صرف کیوں ہے آپ کا
یہ پیار بھی تو جانِ جاں سوالیہ نشان ہے

☆☆☆☆

عرفان مرتضیٰ (امریکہ)

تپتے ہوئے صحراؤں میں ملتے ہیں شجر کم
معلوم مجھے ہوتا تو کرتا مَیں سفر کم

تارے مری تقدیر کے رنگین بہت ہیں
پر ہے مری تقدیر پہ تاروں کا اثر کم

اب یاد مجھے آتے ہو تُم گاہے بہ گاہے
سوچوں کے محلے سے بھی ہوتا ہے گزر کم

کم کم ہی خبر ملتی ہے اس کی مجھے اب تو
ہے اس سے تعلق تو مرا اَب بھی، مگر کم

یہ دیکھ کے اُڑنے کی مَیں خواہش نہیں کرتا
اُڑنے کا مَیں سوچوں بھی تو پڑ جاتے ہیں پَر کم

اب مَیں نے سنا ہے وہ دعائیں نہیں دیتا
اور مجھ کو دعا دے بھی تو ہوتا ہے اثر کم

آتا ہے کبھی جب وہ ملاقات کی خاطر
لگتا ہی نہیں مجھ کو محل سے مرا گھر کم

ارشد لطیف (برطانیہ)

نئے زمانے گئے زمانوں سے مختلف ہیں
مرے مسائل ترے فسانوں سے مختلف ہیں

نہ کام آئی نہ آئے گی کام اشک شوئی
یہ رنج و غم مجلسی بیانوں سے مختلف ہیں

مرے گھرانے کے لوگو کیا راگ الاپتے ہو
تمہارے سُر تال دل کی تانوں سے مختلف ہیں

کوئی تو ہو جو بتائے جا کر بلندیوں کو
پروں کی مجبوریاں اڑانوں سے مختلف ہیں

ہمیں تو سچ مچ میں مرنا پڑتا ہے پیارے صاحب
ہمارے کردار داستانوں سے مختلف ہیں

☆☆☆☆

صغیر اسلم (کینیڈا)

تری خوشی کے لیے کیا سے کیا بنائے گئے
جو لوگ کچھ بھی نہیں تھے خدا بنائے گئے

یہ خاک و چاک کی تقسیم پر نہیں موقوف
کہ اہلِ دل تو ازل سے جدا بنائے گئے

ہمیں سے قتل کرایا گیا وجود اپنا
کہیں چراغ، کہیں پر ہوا بنائے گئے

روا رکھا گیا یہ جبر بارہا ہم پر
جو رہ شناس نہ تھے رہنما بنائے گئے

کھلا جو رازِ ہوس تو برائے خلق خدا
نئے لباس میں کچھ دیوتا بنائے گئے

بنامِ داد و دعا بھیک مانگنے والے
ہمارے دور میں بے انتہا بنائے گئے

وہ ریگ زارِ محبت ہے آندھیوں میں صغیر
جہاں نقوشِ وفا جا بجا بنائے گئے

ڈاکٹر ولاء جمال العیسلی (قاہرہ، مصر)

خدا نے جوڑا ہے ہم کو کوئی جدا نہ کرے
دعا یہی ہے لبوں پہ کہ تو جفا نہ کرے
شجر کی شاخ سے گل کو کوئی جدا نہ کرے
ہوا جو کرتی ہے وہ ظلم دوسرا نہ کرے
دعا یہی کرو اے دوستو کہ یہ دنیا
ہمارے سامنے برباد ہو خدا نہ کرے
جو میری روح نہیں جسم کا تھا شیدائی
میں چاہتی بھی یہی تھی کہ وہ وفا نہ کرے
ترے لبوں سے جو نکلا وہ تیر دل پہ لگے
مری دعا ہے نشانہ ترا خطا نہ کرے
محبتوں میں وہی کامیاب ہوتا ہے
جو زخم روز ہی کھائے مگر گلہ نہ کرے
جو زخم دل پہ لگا ہے لگا ہی رہنے دے
یہی علاج ہے اس کا کہ تو دوا نہ کرے
وہ چاہتا ہے کہ حق چھین لے محبت کا
یہ جرم وہ ہے جو سب تو کریں ولاّ نہ کرے

☆☆☆☆

افروز عالم (جدہ؛ سعودی عرب)

ہم اور طرح کے ہیں صنم اور طرح کے
دل اور طرح کے ہیں تو غم اور طرح کے

کچھ اس کی ادائیں بھی ہیں سیماب کی صورت
کچھ ہم نے بھی پالے ہیں بھرم اور طرح کے

ہاں جس کو بھی جلنا ہے بڑے شوق سے جل جائے
ہم لوگ اٹھائیں گے قدم اور طرح کے

ہر گام پہ روشن ہیں ضرورت کے ستارے
دنیا نے تراشے ہیں صنم اور طرح کے

کشمیر کو روؤں کہ میں اب شام کو روؤں
ڈھائے ہیں ستمگر نے ستم اور طرح کے

اوروں کی طرح بات بناتا نہیں عالمؔ
ہر اک پہ وہ کرتا ہے کرم اور طرح کے

☆☆☆☆

فیروزہ مجید (پلوامہ؛ جموں کشمیر)

پوری شب اور آدھا دل
دھڑکے اور بھی زیادہ دل

ماں دونوں کی ایک ہی تھی
بانٹا آدھا آدھا دل

کرشن کے آنگن میں ناچے
جیسے کوئی رادھا دل

بیٹے ذرا آہستہ چل
بولے ماں کا آدھا دل

میرؔ کا دل بھی بجھتا تھا
ہے کیسی مریادا دل

خود غرضی کی دنیا میں
بھول گیا ہر وعدہ دل

☆☆☆☆

ریحانہ قمر (کیلیفورنیا؛ امریکہ)

مرنا پڑتا ہے بار بار مجھے
یوں نہ اے زندگی! گزار مجھے

جانے کیوں دیر سے میں بیٹھی ہوں
جانے کس کا ہے انتظار مجھے

وہ برا ہی سہی مگر اس نے
کر دیا مجھ پہ آشکار مجھے

دیکھ کر اک ستارۂ تنہا
یاد آیا وہ بے شمار مجھے

وہ مرے ساتھ ہو تو صحرا بھی
نظر آتا ہے لالہ زار مجھے

کیسے سمجھاؤں میں قمر! اس کو
ہے کہاں دل پہ اختیار مجھے

☆☆☆☆

سلیم محی الدین (بھارت)

داستاں مختصر ہماری ہے
عمر گزری نہیں گزاری ہے

دن ہتھیلی میں ڈوب جاتا ہے
ان لکیروں پہ رات بھاری ہے

اب دعا ہے کہ جان پڑ جائے
میں نے تصویر تو اتاری ہے

مجھ کو لگتا ہے میں پرندہ ہوں
اور مجھ پر اڑان طاری ہے

ہر طرف ہی کتاب چہرے ہیں
اب مگر آئینوں کی باری ہے

وہ تو ایسے قریب ہے دل کے
جیسے سینے میں بے قراری ہے

اپنی مٹی سنبھالتا ہوں میں
لوگ کہتے ہیں خاکساری ہے

بینا گوئندی (امریکہ)

بے وفا سے وفا نبھائی تھی
زندگی کی یہی کمائی تھی

وہ تو گرویدہ ہو گیا تھا مرا
میں نے بھی اس سے لو لگائی تھی

میں ترے ہجر کے حصار میں تھی
کب ترے وصل تک رسائی تھی

اور تو کچھ نہیں تھا اس میں مگر
اس کے دامن میں پارسائی تھی

وہ بگولا سرشت تھا بینا
اور مری ریت تک رسائی تھی

☆☆☆☆

باسط جلیلی (امریکہ)

وہ بازگشت جو صحرا میں گونجتی ہے ابھی
کسی کے رقصِ تمنا کو ڈھونڈتی ہے ابھی

نہ جانے کس کو ستاروں سے ایسی نسبت ہے
کہ بجھ گئے ہیں دیے پھر بھی روشنی ہے ابھی

بھٹک رہی ہے جو ویرانیوں کی وسعت میں
وہ اک صدائے قلندر جو ان کہی ہے ابھی

ہزرا شکر سجایا ہے میں نے گلدستہ
ہزرا شکر بہاروں سے دوستی ہے ابھی

ابھی تو ترکِ تعلق کی رسم ہے باقی
کہ گفتگو بھی اشاروں میں ہو رہی ہے ابھی

سوال یہ ہے شرارہ نہ بن سکا شعلہ
جواب یہ ہے کہ جذبے میں کچھ کمی ہے ابھی

کسی کے ذکر سے ماحول گنگنانے لگے
کسی کی یاد میں اس درجہ تازگی ہے ابھی

ناہید ورک (مشی گن؛ امریکہ)

یہ کیسا اشارہ دکھایا گیا تھا
ہمیں خواب میں کیوں مِلایا گیا تھا
اگر مشورہ کرتے تو رائے دیتے
ہمیں فیصلہ ہی سُنایا گیا تھا
کہاں چھوٹنے والا تھا ساتھ اپنا
عجب ہاتھ کر کے چُھڑایا گیا تھا
کہیں تو سبھی خواب نوچے گئے تھے
طلب کو کہیں تو سُلایا گیا تھا
کوئی اور کیسے تجھے راس آئے
ہمارے لیے تُو بنایا گیا تھا
ترے بعد کا گریہ کم کیسے ہو گا
ہمیں تُو مسیحا بتایا گیا تھا
ترے نام کے درد پہ صبر کیسا
اسی پہ تو سب رنج اُٹھایا گیا تھا
جو اک نظم تیرے لیے میں نے لکھی
اُسے آئینے میں سُنایا گیا تھا
اور اب آئینہ ساتھ روتا ہے میرے
کبھی اس کو آنسو دکھایا گیا تھا

☆☆☆☆

جوادشیخ (ڈبلن؛ آئرلینڈ)

ایسا مت کہہ کہ یہاں تُو غلطی سے آیا
دل وہ حجرہ ہے جہاں غم بھی خوشی سے آیا
خامشی آئی دریدہ دہنی سے تیری
دیکھنا مجھ کو تری کم نظری سے آیا
فتح مندی کا جو اک رنگ ہے اس چہرے پہ
سرخروئی سے نہیں۔۔۔۔ دل شکنی سے آیا
ورنہ راہیں تو مری سمت کئی آتی تھیں
اس کو عجلت تھی سو بے راہ روی سے آیا
نئے ملبوس میں وہ جچ تو رہا ہے لیکن
کوئی پوچھے کہ یہ کس آمدنی سے آیا
اِس کہانی میں ترا ذکر بھی آیا تو سہی
کیا ہوا جو مری کردار کشی سے آیا
آزماتا ہوں مگر اور کسی پہ۔۔۔ افسوس!!
یہ ہنر جبکہ مجھے اور کسی سے آیا
اب کوئی روک رہا ہو تو میں رک جاتا ہوں
مجھ میں یہ وصف غریب الوطنی سے آیا
موت کا خوف بڑا خوف ہے لیکن جوادؔ
جو مجھے اس کی توجہ میں کمی سے آیا

☆☆☆☆

تبسم انوار (کینیڈا)

مری چشم تحیر کی نگہبانی میں رہتا ہے
وہ حیراں کرنے آتا ہے پہ حیرانی میں رہتا ہے

رہے صحرا میں جا کر تو سرابوں میں رہے گھر کر
مکیں ہو میری آنکھوں کا تو طغیانی میں رہتا ہے

اگر وہ جا چکا دل سے تو پھر یہ آہٹیں کیا ہیں
کوئی تو شخص ہے جو میری ویرانی میں رہتا ہے

بہت خوش رہ لیے لیکن کھلا ہم پر یہ آخر میں
پریشاں جو نہیں ہوتا پریشانی میں رہتا ہے

تغافل ہنس کے سہہ لیتی ہوں میں جب اس ستم گر کا
وہ کیوں اپنے رویے پر پشیمانی میں رہتا ہے

ترا احسان کہ رنج و الم سے بھر دیا دامن
کہ جی اب خوش بہت غم کی فراوانی میں رہتا ہے

ستارہ سا ٹھہرتا ہے کبھی وہ نوکِ مژگاں پر
کبھی مہتاب بن کر جھیل کے پانی میں رہتا ہے

محبت کی تجارت میں بہت چالاک ہے یہ دل
گرانی جب نہیں ہوتی تو ارزانی میں رہتا ہے

سمجھتا ہے وہی یہ بات جس کو عشق ہو جائے
کہ مفلس کو بھی ہو جائے تو سلطانی میں رہتا ہے

تبسم سخت مشکل ہے خوشی سے دل کو خوش کرنا
اسے غمگین رکھتی ہوں تو آسانی میں رہتا ہے

☆☆☆☆

شہباز خواجہ (برطانیہ)

خواب اور خواہشات بہم ہو نہیں رہے
دنیا! ہم ایک دُوجے میں ضم ہو نہیں رہے

ہونا تو چاہتے ہیں سرِ بزمِ ہست و بُود
اے مالکِ وجود و عدم! ہو نہیں رہے

اپنا مکالمہ بھی کسی غیر سے نہیں
او خود سے ہم کلام بھی ہم ہو نہیں رہے

سینہ بہ سینہ ہوتے رہیں گے بیان ہم
وہ حادثات ہیں کہ رقم ہو نہیں رہے

آنکھیں ہماری دیکھیے روشن ازل سے ہیں
شانے ہمارے دیکھیے خم ہو نہیں رہے

اک آگ میں ہیں آگ بھی یعنی فنا کی آگ
اس آگ میں بھی سوختہ دم ہو نہیں رہے

ہم کون نقش ہیں؟ یہ ہوا پوچھتی پھرے
ہم کس دیے کی لو ہیں جو کم ہو نہیں رہے؟

عشرت معین سیما (برلن؛ جرمنی)

شوقِ پرواز میں کچھ پَر بھی وہیں کٹ کے گرے
پابہ گِل ہم تھے جہاں سَر بھی وہیں کٹ کے گرے

قریۂ سنگ سجاتے تھے جو دن بھر دل میں
رات بھر اس کے وہ پتھر بھی وہیں کٹ کے گرے

اس نے پتھرائی ہوئی آنکھ میں جھانکا تھا کہ بس
خونچکاں درد کے منظر بھی وہیں کٹ کے گرے

جس ہتھیلی پہ رواں اشک دعا بنتے ہیں
نوکِ مژگاں کے جواہر بھی وہیں کٹ کے گرے

جہاں کردار ترے کُھلنے لگے مردِ خلیق
صنفِ نازک کے وہ تیور بھی وہیں کٹ کے گرے

چشمِ نرگس میں سجائے ہوئے لذت سیما
خوابِ فردا کے وہ دلبر بھی وہیں کٹ کے گرے

☆☆☆☆

اشفاق کاشف (ہیوسٹن؛ امریکہ)

کاغذ ہیں سبھی میرے چراغ اور کسی کا
روشن ہے مرے گھر میں دماغ اور کسی کا

ابھری ترے کپڑوں سے کسی اور کی خوشبو
مہکا ترے صحراؤں میں باغ اور کسی کا

کرتا ہے مرے دل میں تلاش اور کسی کو
ملتا ہے اسے مجھ میں سراغ اور کسی کا

کس روز جدا ہو گی مرے دل سے امانت
کب تک میں سنبھالوں گا یہ داغ اور کسی کا

مدھم کبھی ہوتی نہیں لو اس کے نفس کی
بجھنے نہیں دیتا جو چراغ اور کسی کا

☆☆☆☆

نیلم بھٹی (مشی گن؛ امریکہ)

یادوں کی اک کتاب ہے تکیے پہ منتظر
یعنی کہ اک عذاب ہے تکیے پہ منتظر
مضراب جاں نے چھیڑ دیا نغمۂ حیات
صدیوں کا اضطراب ہے تکیے پہ منتظر
ٹھہرا ہوا ہے آنکھ میں صحرائے آرزو
دلکش سا اک سراب ہے تکیے پہ منتظر
رکھی ہوئی ہے آنچ پہ خوشبو کسی نے پھر
جلتا ہوا گلاب ہے تکیے پہ منتظر
بوسہ تمہارے نام کا لے کر جھکی ہے آنکھ
شیریں بیاں سا خواب ہے تکیے پہ منتظر
مفہوم کھو گیا ہے ترے التفات کا
لفظوں کا اک حجاب ہے تکیے پہ منتظر
آنکھیں چرا کے خواب سے بیٹھے ہوئے تو ہو
جاؤ کہ احتساب ہے تکیے پہ منتظر
تھکنے لگی ہے سانس کی پڑی پہ زندگی
ٹوٹی ہوئی رباب ہے تکیے پہ منتظر
نیلم ڈرا دیا تھا ہمیں جس سوال نے
اس بات کا جواب ہے تکیے پہ منتظر

☆☆☆☆

اشفاق حسین (کینیڈا)

کینیڈا میں الیکٹرانک میڈیا اور اردو زبان

۱۹۷۲ء کے موسم گرما کے کھیلوں کے مقابلے جرمنی کے شہر میونخ میں ہو رہے تھے۔ اس وقت تک فیلڈ ہاکی میں پاکستان اور بھارت کی ٹیمیں ہی سونے کا تمغا حاصل کیا کرتی تھیں۔ اس اولمپک میں یہ تاریخی روایت اور ایشیائی ہاکی کی اجارہ داری بھی ختم ہوگئی۔ بہرحال واقعہ یہ تھا کہ پورا ملک اس کھیل کے جنون میں مبتلا تھا اور ہر شخص چاہتا تھا کہ میچ کا رواں تبصرہ وہ ٹی وی پر ضرور دیکھ لے۔

ان دنوں میں کراچی کی ایک نواحی بستی کورنگی میں رہتا تھا جہاں میرے گھر تو کیا اس پورے محلے میں ایک آدھ گھر میں ہی ٹی وی تھا اور ان گھروں تک میری رسائی نہ تھی۔ چنانچہ دو آنے والی چائے کے ڈبل پیسے دے کر چند دوستوں کے ساتھ چھپر والے ایک ہوٹل میں یہ میچ دیکھا۔ میچ پورے زور و شور سے جاری تھا مگر اس کا فیصلہ ایک گھنٹے میں نہ ہوسکا۔ ادھر ٹیلی ویژن کی نشریات ایک گھنٹے کے خریدے ہوئے وقت کے بعد ختم ہو گئیں اور سب لوگ فوراً ریڈیو کی طرف دوڑے تاکہ بقیہ رواں تبصرہ وہاں سن سکیں۔

اس واقعے کو بیان کرنے کا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ اس زمانے میں سیٹلائٹ ٹیکنالوجی اس قدر مہنگی تھی کہ حکومتوں کے لیے بھی اس کا حصول آسان نہ تھا۔ مگر رفتہ رفتہ یہ صورتِ حال بالکل الٹ گئی اور آج دنیا بھر میں ہزاروں سیٹلائٹ اسٹیشن کام کر رہے ہیں۔ ٹیکنالوجی کی اس برق رفتار ترقی اور ارزانی کا فائدہ دور دراز کے ملکوں میں آباد چھوٹی چھوٹی کمیونٹی کے لوگوں کو بہت زیادہ ہوا۔

کینیڈا اور امریکہ میں آباد جنوبی ایشیائی تارکین وطن کے لیے الیکٹرانک میڈیا ایک نعمت سے کم نہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کے ذریعے وہ اپنی تہذیب اور اپنی زبان سے بے حد قریب ہو گئے ہیں۔ آج سے تیس چالیس سال قبل یہاں کے بڑے شہروں میں آدھے یا پون گھنٹے کے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے کچھ مشترکہ پروگرام ہوا کرتے تھے اور ان پروگراموں کو دیکھنے کے لیے بھی ہفتہ بھر انتظار کرنا پڑتا تھا۔

اگر اس پروگرام کا پروڈیوسر مسلمان ہوتا اور وہ لتا منگیشکر یا مکیش کا کوئی گیت پیش کرتا تو اسے اردو ٹی وی کہا جاتا اور اگر کوئی ہندو یا سکھ اپنے پروگرام میں محمد رفیع کا بھی کوئی گیت نشر کرتا تو اسے ہندی ٹی وی کہا جاتا۔ کم وقت میسر ہونے کی وجہ سے ان پروگراموں کو بڑی دلچسپی اور شوق سے دیکھا جاتا تھا۔

یہ دور ٹیلی وژن کی زبان میں Analog ٹرانسمیشن کا دور تھا لیکن جب سے Digital ٹیکنالوجی کا دور شروع ہوا ہے تب سے دنیا ہی بدل گئی ہے۔ اس بدلی ہوئی دنیا کا دوسرا قدم آج ہم سوشل میڈیا کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

بہرحال اس بدلی ہوئی دنیا نے تارکین وطن کی تہذیبی، سماجی اور لسانی زندگیوں میں ایک انقلاب سا برپا کر دیا ہے۔ آج سے تین چار دہائیوں قبل کینیڈا یا امریکہ جا کر آباد ہونے والے خاندانوں کو اپنے بچوں سے اردو زبان میں بات چیت کرنا خاصا دشوار تھا کیونکہ بچہ گھر سے باہر بھی انگریزی پڑھتا اور سنتا تھا اور گھر کے اندر جو وقت ٹی وی کی نذر ہوتا تھا وہ بھی انگریزی پروگراموں کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ چنانچہ ماں باپ کی زبانوں سے بچوں کا واسطہ ذرا کم ہی ہوتا تھا مگر جب سے ان دور دراز کے ملکوں میں الیکٹرانک میڈیا نے گھروں میں ڈیرے ڈالے ہیں تب سے بہت سے پاکستانی اور ہندوستانی گھروں میں بچے اب تو اکثر انگریزی زبان کے پروگرام دیکھنے کو ترستے ہیں۔

یہ اور بات کہ مقامی الیکٹرانک میڈیا میں جو زبان استعمال ہو رہی ہے اس میں کچھ اردو، کچھ ہندی اور تھوڑی بہت انگریزی کا چلن ہے۔ اگر ایک طرف ہندوستان سے ٹیلی کاسٹ کیے جانے والے پروگراموں میں عام بول چال کی ہندی کے ساتھ انگریزی الفاظ کا بے تحاشا استعمال عام ہے تو دوسری جانب پاکستان سے فیڈ کی جانے والی نشریات میں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے۔ یہاں پیدا ہونے والے بچے ان انگریزی الفاظ کے تلفظ پر اگر کھل کھلا کر نہیں ہنستے تو زیرلب ضرور مسکراتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ اس طرح اردو زبان کم از کم تارکین وطن کے گھروں میں چوبیس گھنٹے گونجتی رہتی ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ نسل جو آج سے چالیس پچاس سال پہلے اپنے وطن عزیز سے رخصت ہو کر یہاں مستقلاً آباد ہو گئی تھی اس کے کانوں میں ابھی تک وہی پرانا لہجہ اور پرانے الفاظ رس گھولتے ہیں۔ وہ لوگ جو آج کل ٹی وی کی نشریات سنتے ہیں تو ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ آخر یہ کون سی زبان بولی جا رہی ہے؟ ان لوگوں کے ذہنوں میں ابھی تک وہی پرانا ماحول، وہی پرانا منظر اور وہی پرانے معیار زندہ ہے جنھیں وہ چھوڑ کر آئے تھے۔ انھیں شاید پوری طرح اندازہ ہی نہیں کہ خود ان کے ملک میں بھی تہذیبی اور لسانی ریلا اتنی تیزی سے لوگوں کے سروں سے گزر چکا ہے کہ صورت جانی پہچانی بھی پہچانی نہیں جاتی۔

فطرت کے اصولوں کی روشنی میں بچے چونکہ زبان سیکھنے کے معاملے میں بوڑھوں یا بزرگوں سے زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں لہٰذا ان کے کان الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے اردو زبان کے لفظوں سے مسلسل آشنا

ہو رہے ہیں۔ لفظوں سے یہ آشنائی انہ مختلف ویب سائٹس یا آئی پوڈز پر فلمی گانوں کے سننے کی طرف راغب کرتی ہے۔ ڈرامے اور فلمیں دیکھنے کا شوق پیدا کرتی ہے۔ مذہبی پروگرام، نوحے، سلام اور نعت سننے کی طرف بھی اس سے رغبت پیدا ہوتی ہے۔ تو اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ غیر ممالک میں الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے زبان کو خاصی حد تک فروغ حاصل ہو رہا ہے۔

کینیڈا میں اس وقت اردو اور ہندی کے بہت سے ٹی وی چینلز ہیں جن کی نشریات پورے چوبیس گھنٹے جاری رہتی ہیں۔ کینیڈا میں ٹی وی کا لائسنس دیتے وقت انہیں پابند کیا جاتا ہے کہ وہ اس میں مقامی پروگراموں کو بھی جگہ دیں۔ اس طرح کینیڈا کے اسٹھنک میڈیا میں مقامی مسائل پر مذاکرے، انٹرویو اور مقامی تقریبات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ کینیڈا میں جب گذشتہ موسم سرما کا اولمپک منعقد ہوا تو اس میں حکومت نے کافی بڑی رقم انگریزی اور فرانسیسی کے علاوہ دوسری زبانوں کی نشریات پر بھی خرچ کی۔ اس سے فائدہ اٹھانے والی زبانوں میں اردو زبان بھی تھی۔ موسم سرما کے اولمپک کھیلوں کا پہلی بار اردو زبان میں رواں تبصرہ نشر ہوا جس کو نئی نسل کے علاوہ بزرگوں نے بھی بڑی توجہ اور شوق سے دیکھا۔

آخر میں ہزار بار کہی اور سنی ہوئی اس بات کو میں بھی دہرانا چاہتا ہوں کہ الیکٹرانک میڈیا ایک مضبوط اور طاقت ور میڈیم ہے اور اس سے زبان کے فروغ میں بڑی مدد لی جا سکتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو زبان میں اچھے، معیاری اور معلوماتی پروگرام کچھ اس طرح ترتیب دیے جائیں کہ ان پروگراموں کو دیکھنے والا دلچسپی کے ساتھ ساتھ الفاظ کے صحیح املا، تلفظ اور زبان کے درست لہجے سے بھی آگاہی حاصل کر سکے۔

☆☆☆☆

ابراہیم افسر (میرٹھ؛ بھارت)

علی سردار جعفری کی ذات وصفات خطوط کی روشنی میں

علی سردار جعفری ((1913-2000 ہمہ جہت شخصیت کے مالک ،ترقی پسند تحریک کے فعال رکن ،بیسویں صدی کے ممتاز شاعر ،اعلیٰ درجے کے نثار ،افسانہ نگار ،ناقد ،ادبی صحافی ،اسکرپٹ رائٹر ،ٹیلی ویژن کی دنیا کے رمز شناس ،ترجمہ نگار ،ڈرامہ نگار اور مقرر یکتا تھے۔علی سردار جعفری نے اپنی ابتدائی زندگی میں جوش ملیح آبادی ،جگر مراد آبادی ،اور فراق گورکھپوری کی شاعری کا خوب مطالعہ کیا۔لیکن انیس لکھنوی کی شاعری کا اثر ان کی شعری جہتوں میں سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ساتھ ہی علامہ اقبال کے فکری رجحانات ان کی شاعری میں نمایاں ہیں۔جب جعفری صاحب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں (1936 میں) زیر تعلیم تھے تو سیاسی اور نظریاتی اختلافات کی وجہ سے انھیں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کو خیر آباد کہنا پڑا اور 1938 میں ذاکر حسین کالج (دہلی کالج) سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔علی سردار جعفری نے ایم اے انگریزی ،لکھنؤ یونی ورسٹی سے سال اول تک ہی تعلیم حاصل کی۔لکھنؤ میں جنگ مخالف پروپیگنڈہ کرنے کی پاداش میں انھیں جیل جانا پڑا اور ایم اے سال دوم کے امتحان دینے کا موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ان کی زندگی میں یہ موقع بھی آیا کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے انھیں اپنے یہاں وزیٹنگ فیلو پروفیسر کی حیثیت سے مقرر کیا اور اہل لکھنؤ نے انھیں "شانِ اودھ" کے انعام سے نوازا۔

علی سردار جعفری مشہور شاعر اور دانش ور تھے۔ان کے نو شعری مجموعے شائع ہوئے جن میں "نئی دنیا کو سلام"،"ایک خواب اور"،"پتھر کی دیوار" اور "لہو پکارتا ہے" کو ادبی حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔"ترقی پسند ادب"،"لکھنؤ کی پانچ راتیں"،"اقبال شناسی"،"پیغمبرانِ سخن" اور "سرمایۂ سخن" ان کی اہم تصانیف ہیں۔سردار جعفری کئی ادبی رسالوں کے مدیر تھے۔ان کی زیر صدارت نکلنے والا رسالے "گفتگو" نے ترقی پسند ادب کو فروغ دینے کے ساتھ انھیں بھی ادبی صحافت میں بلند مقام ومرتبہ عطا کیا۔فلمی انڈسٹری سے منسلک ہو کر سردار جعفری نے اپنی فکری جہت کا لوہا منوایا۔اردو کے چھ ممتاز شعرا پر انھوں نے "کہکشاں" کے عنوان سے ڈاکومینٹری فلم بنائی۔ممبئی کے دفاتر میں کام کرنے والی خواتین پر "گیارہ ہزار لڑکیاں" نام سے فلم بھی بنائی۔سرادر جعفری کی جملہ ادبی خدمات کے عوض میں حکومتِ ہند نے پدم شری اور اقبال سمان کے علاوہ 1998 میں ادب کے سب سے بڑے انعام "گیان پیٹھ ایوارڈ" سے سرفراز کیا۔

سردار جعفری کی نجی زندگی کو سمجھنے کے لیے ان کے خطوط کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ناقدین ادب نے

ان کے شعری کمالات اور فن پر خوب خامہ فرسائی کی ہے۔ لیکن ابھی تک ان کی ادبی اور غیر ادبی زندگی کو خطوط کی روشنی میں نہیں پرکھا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کسی بھی ادیب کے خطوط اس کی ذاتی زندگی اور ادبی کاوشوں کے سچے ترجمان ہوتے ہیں۔ خط لکھنا اردو ادیبوں اور شاعروں کا محبوب ترین مشغلہ رہا ہے۔ ان خطوط سے ہمیں ادبا و شعرا کی ذات و صفات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ تو پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کس ادیب یا شاعر نے پہلا خط کب، کسے، کیوں اور کہاں سے تحریر کیا۔ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ خطوط نگاری میں مرزا اسد اللہ خاں غالب نے جتنی شہرت حاصل کی اس پر دوسرے ادیبوں کو رشک ہونا لازمی ہے۔ مرزا غالب سے پہلے لکھے گئے خطوط کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہے۔ مرزا غالب نے خطوط میں اپنے عہد کے سیاسی، سماجی معاشی اور ادبی حالات کے علاوہ روزمرہ زندگی کی ترجمانی طنز و مزاح کے انداز میں کی ہے۔ مرزا غالب کے علاوہ دیگر اردو ادبا و شعرا نے بھی اس میدان میں اپنے جوہر و کمالات دکھائے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی مکتوباتی ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ان کے مکتوبات "مکتوباتِ آزاد" کے نام سے شائع ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے فرزند ارجمند مولوی بشیر الدین کے لیے "موعظہ حسنہ" کے نام سے خطوط تحریر کیے۔ مولانا الطاف حسین حالی کے خطوط دو جلدوں میں "مکتوباتِ حالی" کے نام سے شائع ہوئے۔ حالی کے خطوط عالمانہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی کے خطوط "مکاتیب شبلی" اور "خطوطِ شبلی" کے نام سے منظرِ عام پر آئے۔ ان دونوں مجموعوں میں شعریت اور ادبیت کا عنصر غالب ہے۔ علامہ اقبال کے خطوط چار ضخیم جلدوں میں مظفر حسین برنی کی کاوشوں سے اردو اکادمی دہلی نے شائع کیے۔ ان خطوط میں سیاسی، سماجی اور ادبی مسائل کے علاوہ علامہ اقبال کی ذاتی باتیں بھی شامل ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے "غبارِ خاطر" میں اپنے دل کے جذباتوں کو قلم بند کیا ہے۔ خطوط نگاری کے حوالے سے اردو ادب میں جن ادبا و شعرا نے کما حقہ طور پر اپنی خدمات انجام دیں ان میں رجب علی بیگ سرور (انشائے سرور) غلام غوث بے خبر (انشائے بے خبر) صفیہ اختر (زیر لب) فیض احمد فیض (صلیبیں میرے دریچے میں) سجاد ظہیر (نقوشِ زنداں) فراق گورکھپوری (من آنم) رشید حسن خاں (خطوطِ رشید حسن خاں، مرتب ٹی۔ آر۔ رینا) مناظر عاشق ہرگانوی بنام سہیل عظیم آبادی اور سردار جعفری کے خطوط مرتب ڈاکٹر خلیق انجم وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ اس مضمون میں میرا مقصد سردار جعفری کی ادبی اور نجی زندگی میں در پیش آئے اہم واقعات کو منظرِ عام پر لانا اور ان پر تنقیدی گفتگو کرنا ہے۔ تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ ترقی پسند تحریک کے سرگرم کارکن اور ہندوستان کے اس مایہ ناز ادیب کے مراسم اپنے احباب و اقربا سے کس نوعیت کے تھے۔ نیز اردو ادب میں ہونے والی تبدیلیوں، جدیدیت کی تحریک سے وابستہ ادیبوں کے بارے میں یہ کیا سوچتے تھے۔ سردار جعفری کے خطوط کے غائر مطالعے سے یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ ایک ادیب اور شاعر ذاتی طور پر اپنی

زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کو کس طرح قلم بند کرتا ہے۔ سردار جعفری کے خطوط میں سے رسالہ "گفتگو" کے 'ترقی پسند ادیب نمبر' میں ان اقتباسات کو شامل کیا گیا جو موصوف نے زنداں سے اپنی شریک حیات سلطانہ جعفری کے نام تحریر کیے تھے۔ علی سردار جعفری کی وفات کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی نے ان کی گراں بہا ادبی اور علمی اہمیت کے اعتراف میں اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ہفت روزہ "ہماری زبان، یکم تا 21 اکتوبر 2000 شمارہ نمبر 37-38-39 جلد نمبر 59" کا سردار جعفری نمبر شائع کیا تھا۔ اس خاص شمارے میں علی سرادر جعفری کے حوالے سے مشاہیر ادب کے مضامین شامل تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے سب سے پہلے سردار جعفری کے خطوط کو سہ ماہی رسالہ "اردو ادب سردار جعفری نمبر" اشاعت اکتوبر تا دسمبر 2000 میں شائع کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے علی سردار جعفری کی وفات کے ایک سال بعد 2001 میں (انجمن ترقی ہند) نئی دہلی کی آرکیوز میں رکھے ہوئے ان کے 189 نادر خطوط کو یکجا کر کے 'سردار جعفری کے خطوط' کے نام سے شائع کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتب کردہ خطوط کے علاوہ ابھی بہت سے خطوط سردار جعفری کے ادب نواز دوستوں اور فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے فن کاروں کے پاس محفوظ ہیں؛ جنھیں منظرِ عام پر لایا جانا بے حد ضروری ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتب کردہ خطوط میں علی سردار جعفری نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے نام 10 خط، پروفیسر گیان چند جین کے نام 15، پروفیسر راج بہادر گوڑ کے نام 22، جناب شہاب الدین دسنوی کے نام 8، مظہر امام کے نام 6، پروفیسر زاہدہ زیدی کے نام 11، پروفیسر سید عقیل رضوی کے نام 38، پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے نام 7، پروفیسر علی احمد فاطمی کے نام 17 جناب محمد ایوب واقف کے نام 18، ڈاکٹر خلیق انجم کے نام 22، پروفیسر نیر مسعود اور عادل اسیر دہلوی کے نام دو دو خط، عمیق حنفی، معصوم مراد آبادی، سرور تونسوی، راج نرائن راز، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر اسد اللہ وانی، نامی انصاری، خواجہ احمد عباس، محترمہ سلطانہ جعفری اور محترمہ ستارہ جعفری کے نام ایک ایک مکتوب تحریر کیا ہے۔ سردار جعفری کے یہ خطوط اپنے ادبی، سماجی اور سیاسی حالات کا منظر نامہ ہیں۔ ساتھ ہی ان کی شخصیت، فن، تنقیدی نظریات اور اردو زبان و ادب سے ان کی وابستگی کے بارے میں اہم معلومات کا وسیلہ ہیں۔

سردار جعفری کے خطوط کے عمیق مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ اپنے ادب نواز دوستوں کو اس بات پر آمادہ کر رہے تھے کہ آپ سب لوگ دوسرے ترقی پسند ادیبوں بالخصوص ہندی ادیبوں کی اردو دشمنی پر طائرانہ نظر رکھیں۔ علی سردار جعفری کا ماننا تھا کہ ہندی کے ہر چھوٹے بڑے ادیب چاہے وہ رام لعل شنکر تیاگی ہوں یا امرت رائے ان سب نے ہمیشہ اردو کی مخالفت کی۔ لکھنؤ میں منعقدہ ترقی پسند مصنفین کانفرنس میں نیشنل فیڈریشن تشکیل دی گئی تو اس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے اردو ادیبوں کو خاطر خواہ توجہ نہیں

دی گئی۔علی سردار جعفری اس رویہ سے بہت پریشان تھے۔ان کی نظر میں فیڈریشن کے اس رویہ کا اثر اردو زبان کی ترقی پر ضرور نمودار ہوگا۔فیڈریشن کی میٹنگ میں اس بات پر زور دیا گیا کہ اردو زبان کو ہندوستان کی ہندی ریاستوں کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔لیکن فیڈریشن کے زیادہ تر عہدے داران نے اس تجویز کو کو مسترد کر دیا۔علی سردار جعفری نے ان تمام موضوعات پر اپنا ردِ عمل اور اردو مخالف سرگرمیوں سے باخبر کرتے ہوئے پروفیسر راج بہادر گوڑ کو ایک طویل خط 26 مئی 1986 کو رقم کیا۔جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ہندوستان میں زبان کی پالیسی ناقص ہے اور ہندوستان میں زبان کا مسئلہ فرقہ وارانہ رخ اختیار کر لیتا ہے۔علی سردار جعفری نے اس بات پر بھی تشویش ظاہر کی کہ اردو زبان آہستہ آہستہ مسلمانوں کی زبان بنتی جا رہی ہے۔انھوں نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ایک مضمون جس میں مولانا نے اردو زبان کو مسلمانوں سے منسوب کر دیا تھا پر بھی برہمی کا اظہار کیا۔ساتھ ہی اس بات پر بھی حیرانی اور افسوس کا مظاہرہ کیا کہ اردو کی مخالفت سب سے زیادہ اردو اخبارات میں ہی ہوتی ہے۔اس خط میں سردار جعفری نے یہ بھی لکھا کہ نیشنل فیڈرشن کو زبان سے متعلق ایک فیڈریشن بنا دیا جانا چاہیے۔ویسے سردار جعفری چاہتے تھے کہ اردو زبان کے علاوہ ہندوستان کی تمام زبانوں کو ایک ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔میں اس طویل خط سے ایک اقتباس نقل کر رہا ہوں تاکہ علی سردار جعفری کا نظریہ واضح ہو جائے:

> "یہ فیڈریشن مجھ سے باہر ہے۔انجمن ترقی پسند مصنفین کو ختم کر کے گیا میں فیڈریشن کی تشکیل کیوں کی گئی۔اب اس کو تیسری اور چوتھی کانفرنس کہا جاتا ہے گویا ترقی پسند تحریک کی پرانی تنظیم سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔اس کے علاوہ سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ فیڈریشن State Units پر مشتمل ہے۔اس طرح اردو خود بخود خارج ہو جاتی ہے۔کشمیر کے سوا اردو کسی اسٹیٹ کی زبان نہیں ہے اور کشمیر کے یونٹ کی رپورٹ میں فطری طور سے کشمیری زبان اور ادب پر زیادہ زور ہونا چاہیے۔اردو کے بڑے ادیب اور شاعر اور اردو کا کاروبار دوسری ریاستوں میں ہے۔یہ معاملہ اس وقت لکھنؤ میں پیش آیا جب مدھیہ پردیش کی رپورٹ پر اختر سعید خاں نے کہا کہ اس میں اردو کا کوئی ذکر نہیں ہے۔۔۔۔۔۔بمبئی میں مراٹھی کے علاوہ گجراتی، بنگالی، تیلگو، تامل وغیرہ کی فعال تنظیمیں ہیں۔اردو ہندی بھی مراٹھی سے الگ ہیں۔یہ سب زبانیں ایک یونٹ میں کیسے کام کر سکتی ہیں۔اب اس غلطی کی تلافی اور تدارک کی صرف یہ صورت ہے کہ ہندوستان بھر میں ترقی پسند ادب کی تنظیمیں زبانوں کی بنیاد پر ہونی چاہییں نہ کہ اسٹیٹ

یونٹ کی شکل میں۔اس طرح فیڈریشن سے سب زبانوں کا الحاق ہو جائے گا۔ یہ بہت ضروری بات ہے اور یہی صحیح طریقہ کار ہے۔"

(سردار جعفری کے خطوط، مرتب ڈاکٹر خلیق انجم، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، 2001، صفحہ 72 تا 73)

سردار جعفری کی دیرینہ خواہش تھی کہ اردو کی بقا، تشخص اور فروغ اسی انداز پر قائم ہو جیسا کہ اس زبان کا حق ہے۔انھوں نے اردو زبان سے والہانہ محبت اور عقیدت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے "ترانۂ اردو" نظم تخلیق کی۔اس نظم میں اردو زبان کی شیرنی اور نغمگی کا تذکرہ دل کش انداز میں کیا گیا ہے۔اس موقع پر اس نظم کا پیش کرنا ضروری ہے تاکہ آپ سب سردار جعفری کے دلی جذبات سے واقف ہو جائیں۔

ہماری پیاری زبان اردو
ہمارے نغموں کی جان اردو
حسین، دل کش جوان اردو

یہ وہ زباں ہے کہ جس کو گنگا کے جل سے پاکیزگی ملی ہے
اودھ کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں جس کے دل کی کلی کھلی ہے
جو شعر و نغمہ کے خلد زاروں میں آج کوئل سی کوکتی ہے

ہماری پیاری زبان اردو
ہمارے نغموں کی جان اردو
حسین، دل کش جوان اردو

اسی زباں میں ہمارے بچپن نے ماؤں سے لوریاں سنی ہیں
جوان ہو کر اسی زباں میں کہانیاں عشق نے کہی ہیں
اسی زباں کے چمکتے ہیروں سے علم کی جھولیاں بھری ہیں

ہماری پیاری زبان اردو
ہمارے نغموں کی جان اردو
حسین، دل کش جوان اردو

یہ وہ زباں ہے کہ جس نے زنداں کی تیرگی میں دیے جلائے
یہ وہ زباں ہے کہ جس کے شعلوں سے جل گئے پھانسیوں کے سائے
فراز دار و رسن سے بھی ہم نے سرفروشی کے گیت گائے

ہماری پیاری زبان اردو
ہمارے نغموں کی جان اردو
حسین، دل کش جوان اردو
چلے ہیں گنگ و جمن کی وادی سے ہم ہوائے بہار بن کر
ہمالیہ سے اتر رہے ہیں ترانہ آبشار بن کر
رواں ہیں ہندوستاں کی رگ رگ میں خون کی سرخ دھار بن کر
ہماری پیاری زبان اردو
ہمارے نغموں کی جان اردو
حسین، دل کش جوان اردو

1991 میں جب کانگریس کی جانب سے پی وی نرسمہا راؤ کو ہندوستان کا وزیر اعظم منتخب کیا گیا تو سردار جعفری سخت نالاں ہوئے۔ کیوں کہ نرسمہا راؤ، وزیر اعظم بننے سے پہلے مرکزی حکومت میں وزیر تعلیم تھے تو ان کا رویہ اردو زبان اور اردو والوں کے تئیں اچھا نہیں تھا۔ جب کہ نرسمہا راؤ کی تعلیم اردو میڈیم اسکول میں ہی ہوئی تھی۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں پر ان کو زبردست دسترس حاصل تھی۔ اس کے باوجود جب ڈاکٹر خلیق انجم اور آنند نارائن ملا کی قیادت میں ایک وفد ان سے اُردو کے مسائل پر غور وخوض اور تصفیہ کے لیے گیا تو انھوں نے آنند نارائن ملا سے بیٹھے بیٹھے ہاتھ ملایا۔ جب انھیں یاد دلایا گیا کہ آپ اُردو اور فارسی کے زبردست عالم ہیں تو انھوں نے برجستہ کہا کہ مجھے یہ زبانیں نظام حکومت کے دباؤ میں پڑھنا پڑی تھیں، میری مادری زبان تو تیلگو ہے۔ نرسمہا راؤ کی اُردو دشمنی کے بہت سارے واقعات حبیب الرحمن نے اپنی سوانح عمری ''چند یاد داشتیں'' میں تحریر کیے ہیں۔ نرسمہا راؤ نے 20 جون 1991 کو وزیر اعظم کے عہدے کا حلف اٹھایا تو اس موقع پر دور درشن سے ترانہ ہندی کے مصرعوں کو مسخ کرکے پڑھا گیا۔ جب سردار جعفری نے اس نازیبا حرکت کو خود دیکھا تو ان کو شدید دھچکا لگا۔ رات کو اپنے عزیز واقربا سے ٹیلی فون پر اس بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ڈاکٹر راج نرائن گوڑ اور ڈاکٹر خلیق انجم کے نام 21 جون 1991 کو خطوط ارسال کیے۔ ان خطوط میں واضح طور پر سوال قائم کیا کہ جو گستاخی علامہ اقبال کے ترانہ ہندی اور اُردو کے ساتھ کی گئی ہے کیا ویسی ہی گستاخی ٹیگور اور بھارتی کے کلام کے ساتھ بھی کی جاسکتی ہے؟ ڈاکٹر خلیق انجم کے نام لکھے خط میں سردار جعفری نے ترانہ ہندی کی عظمت اور اہمیت پر تاریخی باتیں رقم کیں۔ لکھتے ہیں:

''کل رات کو تم نے دور درشن پر وزیر اعظم کی تقریر سنی ہوگی۔ اس کے فوراً بعد اقبالؔ کے

انداز کا اور دھن بھی ترانے کی، ہندوستان کے نقشے پر بچوں کو آراستہ کیا گیا تھا اور لباس قومی پرچم کے رنگوں کا تھا۔ "ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا" اس طرح بدلا گیا "ہم ہیں بہاریں اس کی یہ گلستاں ہمارا"۔ "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" یا تو خارج کر دیا گیا تھا یا مسخ۔ "جن گن من" کی طرح نغمے میں گجرات اور مہاراشٹر کے نام ڈال دیے گئے تھے۔ یہ نظم دوردرشن سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ جس طرح یہ نظم پیش کی گئی ہے اسی طرح ترانہ ہندی کو پیش کیا جائے تو اس کا اثر بڑھ جائے گا۔

ہندوستان میں تین ترانے ہیں۔ ایک سرکاری ترانہ ہے "جن گن من"، دوسرا نیم سرکاری ترانہ ہے "وندے ماترم" اور تیسرا عوام کا مقبول ترانہ ہے سارے جہاں سے اچھا ۔۔۔۔۔" اس ترانے کا احترام اس لیے بھی کرنا چاہیے کہ جب Constituent Assembly میں ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں ہندوستان کا نیا قومی پرچم پیش کیا گیا تو سچیتا کرپلانی نے "وندے ماترم" اور "سارے جہاں سے اچھا" گایا تھا۔"

(سردار جعفری کے خطوط، مرتب ڈاکٹر خلیق انجم، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 2001، صفحہ 225 تا 226)

علی سردار جعفری علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کی شاعری دونوں کے دل دادہ و عقیدت مند تھے۔ اپنے ابتدائی زمانے میں جعفری صاحب اقبال کی شاعری کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے لیکن جیسے جیسے علمی شعور میں اضافہ ہوا وہ اقبال کی ہمہ جہت شخصیت اور شاعری میں دل چسپی لینے لگے۔ اس کی خاص وجہ سردار جعفری نے یہ بتائی کہ اقبال وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں لفظ "انقلاب" کا استعمال کیا۔ اقبال سے عقیدت اور محبت کی انتہا کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے خواجہ احمد عباس کے ساتھ مل کر فلم ڈویژن کے لیے ایک ڈوکومینٹری فلم بھی بنائی۔ اس فلم کے تمام مکالمے، اسکرپٹ، اور اسکرین پلے سردار جعفری کے تھے۔ ڈیڑھ سال کی محنت کے بعد یہ فلم منظر عام پر آئی اور 25 اگست 1978 کو اس فلم کی نمائش ہندوستان کے مختلف شہروں میں کی گئی۔ سردار جعفری چاہتے تھے کہ اقبال، وویکانند اور پنڈت نہرو کے افکار ونظریات سے ایک جدید ہندوستان کی تشکیل دی جائے۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ اقبال مسلم احیا پرستی کے علم بردار ہیں اور وویکانند ہندو احیا پرستی کے خیر خواہ۔ ان دونوں کا مقصد ایک ہی ہے۔ ہندوستان کی فلاح وبہبود اور قومی یکجہتی کو مستحکم کرنا۔

سردار جعفری تا عمر کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن بنے رہے۔ گھر کے اخراجات کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے انھوں نے رات دن کام کیا۔ ان کی کوئی مستقل آمدنی کا ذریعہ نہیں تھا۔ مشاعروں، سمیناروں اور اسکرپٹ لکھنے سے جو روپے ملتے تھے وہی ان کی جمع پونجی تھی۔ اسی کمائی سے ہی گھر چلتا تھا۔ زیادہ کام کرنے

کی پاداش میں انھیں طرح طرح کی بیماریوں نے اپنے آغوش میں لے لیا تھا۔سردار جعفری کو پہلا ہارٹ اٹیک1968 میں پڑا۔دوسرا دل کا دورا انھیں جولائی 1993 میں پڑا۔بیماریوں کے علاج کے لیے روپیوں کی ضرورت ہوتی ہے جو سردار جعفری کے پاس نہیں تھے۔اختر الایمان کی طرح وہ بھی اپنے عالی شان فلیٹ کو بیچ کر کہیں دوسری جگہ چھوٹا گھر خرید کر اپنی باقی زندگی آسانی سے گزارنا چاہتے تھے لیکن سردار جعفری اپنی کاوشوں میں کامیاب نہ ہوسکے۔1963 کے بعد فلموں سے ان کا رابطہ کم ہوتا گیا۔انھوں نے اپنا ذریعہ معاش صرف اپنے قلم کو بنایا۔دیر رات تک زیادہ کام اور لکھنے پڑھنے کے سبب ان کی بائیں آنکھ کی پتلی خراب ہوگئی۔زندگی کی بھاگ دوڑ میں اس قدر مصروف تھے کہ آنکھ کا آپریشن بھی وقت پر نہ ہوسکا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ دوسرے ادبا وشعرا کی کتابوں اور مسودوں پر اظہار خیال کرنا اور ان کتابوں پر لکھنے کے لیے، یاددہانی کے لیے دن میں کئی بار ٹیلی فون آنا ایک عام بات تھی۔اس وجہ سے سردار جعفری کے بہت سے ادبی کام پس پشت چلے گئے۔اس مصروف زندگی میں سردار جعفری نے اپنے لکھنے کا وقت جو مقرر کیا تھا وہ کسی مرد آہن کے لیے ہی ممکن تھا۔وہ رات کے دس بجے سو جاتے تھے رات کے دو بجے اُٹھ کر ادبی کاموں میں مصروف ہو جاتے، پھر صبح پانچ بجے سو جاتے اور صرف دو گھنٹے کے لیے آرام کرتے۔اس طرح ان بیش قیمتی اوقات میں سردار جعفری اپنی علمی وادبی کاوشوں کو صفحہ قرطاس پر لانے کے لیے جی توڑ محنت کرتے۔ان تمام امور پر سردار جعفری نے پروفیسر زاہدہ زیدی کے نام 19 اگست 1989 کو لکھے خط میں یوں تبادلہ خیال پیش کیا:

> "تمھاری کتاب پر جلد سے جلد لکھنے کی کوشش کروں گا لیکن میری بائیں آنکھ کی پتلی Cornea خراب ہوگئی ہے جو تبدیل کی جائے گی۔لیکن آپریشن کے لیے وقت نہیں نکال پا رہا ہوں اور روپے کا بھی انتظام کرنا ہے۔حیدرآباد میں آپریشن کرانے کا ارادہ ہے۔دل کی کیفیت کی وجہ سے صبح سے لے کر دو بجے تک کام کرتا ہوں۔اس کے بعد بے کار ہو جاتا ہوں۔تھوڑا سا کام شام کو کرتا ہوں۔اس میں سے تھوڑا سا وقت ان احباب کو نذر کرنا پڑتا ہے جو ملنے آجاتے ہیں۔بہت سے لوگ مسودے اور کتابیں لے کر آجاتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ ان کو پڑھو اور ان پر لکھو۔ان میں یاددہانی کے دس بارہ ٹیلی فون آتے ہیں،ان میں وقت خراب ہوتا ہے۔میں اُردو شاعروں پر ٹیلی ویژن کے لیے سیریل بنا رہا ہوں اس کے تیرہ (13 عدد Episode) لکھنے میں مصروف ہوں۔آنکھ کی تکلیف کی وجہ سے زیادہ لکھنا ممکن نہیں ہے۔12 ستمبر سے شوٹنگ شروع ہو رہی ہے۔اس کا بھی انتظام کرتا ہوں اور ڈائریکٹر، کیمرہ مین، آرٹ

ڈائریکٹر وغیرہ سے تبادلۂ خیال بھی جاری رہتا ہے۔ آنکھ میں پانچ چھ بار دوا ڈالتا ہوں اور دل کی دوا کھاتا رہتا ہوں۔

اس وقت تمہاری کتاب کے علاوہ سب سے زیادہ ضروری کام ایک ایسی کتاب پر دیباچہ لکھنا ہے جو ایک شاعر دوست ظفر گورکھپوری نے لکھی ہے۔ اپنے مرحوم بیٹے کی یاد میں جو جوانی میں داغ مفارقت دے گیا۔ انکار کے لیے دل کہاں سے لاؤں۔ دوسرا اہم مضمون کیفی اعظمی پر لکھنا ہے، جس میں دو سال کی تاخیر ہو چکی ہے۔

اس صورت میں میرا اپنا ادبی کام پس پشت پڑ گیا ہے رات کے دس بجے سوتا ہوں۔ دو بجے رات کو اٹھ جاتا ہوں۔ پانچ بجے تک جاگتا ہوں اور پھر دو گھنٹے کے لیے نیند آجاتی ہے۔ رات کے یہ تین گھنٹے بڑے قیمتی ہیں۔ انھیں میں کچھ اپنا کام کر لیتا ہوں۔ لیکن شعر کی دیوی روٹھی ہوئی ہے۔ آنکھ کے آپریشن سے پہلے بہت سے کاموں سے فارغ ہونا چاہتا ہوں۔ اکتوبر میں حیدرآباد جا کر آپریشن کرانا چاہتا ہوں تاکہ نومبر دسمبر میں زیادہ کام کر سکوں۔"

(سردار جعفری کے خطوط، مرتب ڈاکٹر خلیق انجم، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 2001، صفحہ 102 تا 103)

سردار جعفری ہندوستان میں اگر کہیں دور دراز کا سفر کرتے تو ہوائی جہاز کو ترجیح دیتے۔ اگر سفر مقامی ہے تو موٹر کار، اگر سفر ممبئی سے باہر ہوتا تو ٹرین کا سفر کرتے۔ خراب صحت ان سب کی وجہ تھی۔ سردار جعفری نے اپنی آپ بیتی "نومبر میرا گہوارہ" کے کچھ حصے منظوم انداز میں لکھے ہیں۔ جب فیض احمد فیض سے نصرت چودھری نے سوال کیا کہ سردار جعفری کی آج کی شاعری پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کے رنگ میں شاعری کر رہے ہیں" تو فیض نے اپنے انداز میں تصدیق کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ "آج کے دور میں سب شعرا انھی کے رنگ میں شاعری کر رہے ہیں۔" ان باتوں کو پڑھ کر سردار جعفری بہت خوش ہوئے۔ سردار جعفری اپنی انگریزی کتاب Progressive Movement and Urdu Poetry کو جلد از جلد مکمل کرنا چاہتے تھے لیکن زندگی میں فرصت کے اوقات کی قلت کے سبب اس کام میں بھی تاخیر ہوتی گئی۔ سردار جعفری کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنے ادب نواز دوستوں کی demand پر پرانے رسالوں کے خاص نمبر بھی ارسال کرتے تھے۔ کسی کے لیے "افکار" کسی کے لیے "نیا ادب" اور کسی کے لیے "گفتگو" کے خاص نمبر تلاش کر کے، ان کے عکس بنوا کر روانہ کرنا اپنے لیے ادب شناسی کا فریضہ سمجھتے تھے۔ سردار جعفری اپنے دوستوں کو ادبی رسالے نکالنے پر آمادہ کرتے اور جب رسالہ منظر عام پر آجاتا تو انھیں مبارک باد کے خطوط بھی ارسال کرتے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی

کی ادارت میں الہ آباد سے نکلنے والے رسالے "نیا سفر" پر سردار جعفری نے انھیں خوب مبارک باد پیش کی۔

بہرکیف! سردار جعفری کے یہ خطوط ترقی پسند ادیبوں کی ذہنیت اور ادب کو گہرائی اور گیرائی سے سمجھنے کا ذریعہ ہیں، ان خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سردار جعفری جتنے اچھے شاعر تھے اُس سے بھی زیادہ بہترین نثر نگار تھے، ان کے خطوط کو پڑھنے کے بعد یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے کمیونسٹ ادیبوں سے ان کے روابط تھے۔ رسالہ "گفتگو" کے "ترقی پسند ادیب نمبر" میں اشتراکی ادب کو خاص جگہ دی گئی۔ یہ خاص نمبر چار جلدوں پر مشتمل تھا۔ اپنے خطوط میں سردار جعفری نے کچھ رومانی باتیں بھی تحریر کی ہیں جو ان کی جمالیات سے دل چسپی کا مسلم ثبوت ہیں۔ سردار جعفری نے کبھی ہمت نہیں ہاری، نہ ہی اپنے اصولوں سے سمجھوتا کیا۔ اگر سردار جعفری کی زندگی کے مخفی گوشوں کو تلاش کرنا ہے تو ان خطوط کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ میں اپنی بات سردار جعفری کی نظم کے اس بند کے ساتھ ختم کرتا ہوں جس میں انھوں نے اپنے وجود اور اپنے زندہ ہونے کے احساس کو قاری کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ گویا سردار جعفری اس دارِ فانی سے کبھی گئے ہی نہیں بلکہ وہ تو اس جہان میں خوشبو بن کر ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہم سے محوِ گفتگو ہیں۔

☆☆☆☆

افروز عالم (جدہ؛ سعودی عرب)

ڈاکٹر زرینہ رحمان کی تنقیدی تصنیف: حفیظ جالندھری کا فن

اردو دنیا کے ہجوم میں کئی چہرے ایسے ہیں جو کسی بھیڑ میں گرد آلود نہیں ہوتے ہیں۔ اسی بھیڑ کو چیرتے ہوئے، بغل میں شاہ نامہ اسلام دبائے ہوئے ایک چہرہ نمودار ہوتا ہے، جسے لوگ نظم گو، غزل گو، اور گیتوں والا حفیظ کہہ کر پکارتے ہیں۔ اردو ادب کے باب میں محترم حفیظ جالندھری کا نام کئی حوالوں سے بہت ہی معتبر اور قد آور ہے۔ قریب قریب نصف صدی تک بنگال سے لے کر سندھ تک کے ادبی حلقوں میں دلار کی جانے والی شخصیت عظیم شاعر حفیظ جالندھری کے فن اور شخصیت پر یوں تو کئی رسالوں نے خصوصی نمبر شائع کیا بھی تحقیقی کتابیں بھی شائع ہوئیں، لیکن پھر بھی ادب کے سنجیدہ قارئین کی تشنگی میں کمی نہیں آئی۔ ایک حد تک ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ موصوف کے شایان شان کوئی تحقیقی یا تنقیدی کام ہوا ابھی نہیں ہے۔ پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے والے شاعر کے فن و شخصیت پر پاکستان کی یونیورسٹیز میں تو کچھ کچھ کام ہوئے بھی لیکن بھارت میں اس موضوع پر کوئی تحقیقی یا تنقیدی تصنیف میری نگاہ سے نہیں گزری۔ کل ملا کر یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ سارا کام حفیظ کے "قد کے برابر کا نہیں ہے۔"

پیش نظر تصنیف "حفیظ جالندھری کا فن (۲۰۰۷)" نہایت ہی قابل محقق ڈاکٹر زرینہ رحمان کی عرق ریزی اور تحقیق کا ثمرہ ہے۔ ڈاکٹر زرینہ رحمان ایک ہنر مند لکھاری ہیں۔ تحقیق اور تنقید کے قارئین آپ کے قلم اور مجاز سے بخوبی واقف ہیں۔ بابا بھیم راؤ امبیڈ کر یونیورسٹی کے لنگٹ سنگھ کالج مظفر پور (بہار) کے شعبہ اردو میں آپ پروفیسر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری انجام دے رہی ہیں۔ اس لیے آپ کی تحقیق، تنقید اور تحریر قابل تسلیم ہے۔

اس کتاب کا "پیش گفتار" معروف و قابل نقاد ڈاکٹر ابرار رحمانی نے تحریر فرمایا ہے، آپ اپنی تحریر میں رقم کرتے ہیں کہ

> "مجھے آج بھی پٹنہ کی ۱۹۷۷ کی وہ شام یاد ہے جب ۷۷ برس کی عمر میں حفیظ جالندھری نے لہک لہک کر "ابھی تو میں جوان ہوں" پڑھنا شروع کیا اور سامعین گویا وجد کی کیفیت میں جھومتے رہے۔"

پھر تیسرے پیراگراف میں آپ فرماتے ہیں کہ "حفیظ جالندھری کے ادبی کارناموں کی فہرست

بہت طویل ہے مگر اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ حفیظ جالندھری کو کافی حد تک نظرانداز کیا گیا ہے۔ یعنی کہ ان پر اس انداز اور اس رفتار سے کام نہیں ہوا ہے جیسا کہ ان کا حق ہے۔ یہاں یہ بات واقعی قابل اطمنان ہے کہ اس کتاب کی مصنفہ ڈاکٹر زرینہ رحمان نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے اور اچھا تحقیقی کام انجام دیا ہے۔"

کتاب کے پشت ورق پر معروف شاعر پروفیسر حفیظ بنارسی نے تحریر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"ڈاکٹر زرینہ رحمان صاحبہ نے حفیظ جالندھری کے عنوان سے جو گراں قدر تحقیقی کام سر انجام دیا ہے وہ واقعی لائق صد ستائش ہے، انھوں نے حفیظ مرحوم کے عہد اور ان کے معاصر حضرات پر بھی نظر رکھی ہے، اور مختلف اصنافِ سخن میں حفیظ صاحب نے جو دادِ سخن حاصل کی ہے اس پر بھی کھل کر لکھا ہے، صرف تعریف و تحسین ہی نہیں کی ہے بلکہ گہری تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے، اور تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ یہ ایک مشکل کام تھا اور بڑی جانفشانی اور عرق ریزی کا متقاضی۔"

غور سے مطالعہ کرنے سے صاحب تصنیف کی فکر، شعور اور شعری پرکھ میں باریکی نظر آتی ہے، کہیں جگہ پر موصوفہ نے پچھلے ان تنقید نگاروں کے ساتھ اسی سر میں الاپ لگایا ہے، جیسا کہ گئے دنوں کے نقطہ چیں نے لگایا تھے۔ مثلاً۔۔۔۔

"شاہ نامۂ اسلام پر فراق گورکھپوری نے جو تنقید کی ہے وہ اپنے اندر وزن رکھتی ہے۔ اگرچہ حفیظ نے الفاظ کے الٹ پھیر سے فراق کے اعتراضات کا جواب دیا ہے، مگر بات بنتی نظر نہیں آتی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ شاہ نامۂ اسلام میں فکر و فن کا امتزاج ہے یا نہیں، فکر کی روح فن کے قالب میں اتری ہے یا نہیں اور اگر اتری ہے تو پرسکون ہے یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ فکر کے خطوط فن سے جدا معلوم ہوتے ہیں۔

شاہ نامۂ اسلام کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں فکر و فن کا امتزاج نہیں ہے۔ فکر کی پیش کش میں شعری خوبیوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ اظہار و بیان کی وہ شادابی نظر نہیں آتی جو کسی شعری شاہ کار کے لیے ضروری تصور کیا جاتا ہے، انداز بیاں بالکل سپاٹ ہے، شعری حسن سے عاری ہے۔ ابتدا سے انتہا تک رہ گزر کا گمان ہوتا ہے۔ کہیں کوئی مرغزار نہیں ہے۔ اس لیے حفیظ کا یہ کہنا کہ "شاعر نے اپنے جذبۂ ملی کی تسکین کے لیے شعر سے کام لیا ہے" صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اس بات پہ اعتراض نہیں کہ جذبۂ ملی شعری جذبہ نہیں بن سکتا۔ جذبہ کوئی بھی ہو اگر وہ شعری جذبہ تجربہ بن جاتا ہے تو شاعری اور اچھی شاعری ہے مگر جذبہ کی بلندی و عظمت، شادابی و رنگینی اس کو شعری تجربہ نہیں بنا سکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پیرائے بیان میں شادابی و

رنگینی کا عکس ملے، جس سے جذبے کی شادابی و رنگینی عبارت ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی خوف نہیں معلوم ہوتا کہ شاہ نامۂ اسلام میں شعریت کی کمی ہے۔ اس لیے حفیظ جالندھری کا یہ کہنا کہ " کتنے بے شمار کام و دہن میں جو شاہ نامۂ اسلام کے اشعار سے لذت یاب ہیں۔" کوئی معنی نہیں رکھتا۔ فکر کی عظمت فن کو عظیم نہیں بنا سکتی۔ ممکن ہے کہ مذہب اسلام سے والہانہ لگاؤ رکھنے والے اس کے اشعار پر سر دھنتے ہوں، آٹھ آٹھ گھنٹہ یکسو ہو کر سنتے ہوں، اس درخت کی چھاؤں میں سکون پاتے ہوں، مگر یہ سب فنی طور پر اس کی بلندی میں اضافہ نہیں کرتے۔ یہ خیال صرف میرا یا فراق کا ہی نہیں بلکہ بہت سے دوسرے اہل قلم حضرات نے اسی قسم کے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ ملک اسمائیل حسن خان نے حفیظ کی شاعری کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے شاہ نامۂ اسلام پر سخت تنقید کی ہے۔" (صفحہ رقم ۶۵۔۶۶)

مجموعی طور پر کتاب حفیظ جالندھری کے فن و شخصیت کے ہر پہلو کو نمایاں کر رہی ہے۔ اس بات سے بالکل انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ محترمہ ڈاکٹر زرینہ رحمان کی عرق ریزی سے خاص طور پر بھارت میں اس کتاب کی بہت اہمیت ہے۔ حفیظ کے مداحوں کے لیے یہ کتاب چلچلاتی دھوپ میں ٹھنڈی بوندوں کا قطرہ ہی سہی، کیوں کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے۔ ۱۴۳ صفحات پر مشتمل یہ کتاب نہایت ہی مفید ہے۔ فن و شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیے پوری کتاب کو چھ حصے میں تقسیم کیا گیا ہے، جو یہ ہیں:۔

ا۔حفیظ جالندھری کا فن	۲۔نظم نگاری	۳۔مثنوی نگاری
۴۔غزل گوئی	۵۔گیت ۶	۔شاعرانہ عظمت

قارئین کی دلچسپی کے لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ حرفِ آغاز سے اقتباس نقل کر دیا جائے، جس کی قرأت سے کتاب کی روح تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

پہلا باب حفیظ جالندھری اور ان کے عہد سے متعلق ہے۔ اس میں حفیظ کی مختصر سوانح عمری ہے اور ان تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی تحریکات کو احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جنھوں نے شاعر کی فکر اور اس کے فن کو متاثر کیا ہے۔

دوسرا باب حفیظ جالندھری کی نظم نگاری کے متعلق ہے، ان کی نظموں کے مطالعہ سے یہ بات روشن ہوتی ہے کہ ان کی شاعری مقصدی ہے، وہ شاعری اور فنکار کے لیے کسی گروہ یا جماعت سے منسلک ہونا ضروری نہیں خیال کرتے۔ ان کی شاعری کا محرک ان کا مذہبی جذبہ ہے۔

تیسرے باب میں حفیظ جالندھری کی مثنوی نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کے مطالعہ سے یہ نتیجہ ظاہر ہوتا ہے کہ حفیظ کی شہرۂ آفاق تصنیف شاہ نامۂ اسلام مثنوی نا کام ہے۔

چوتھے باب میں حفیظ جالندھری کی غزل گوئی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان میں روانی، شگفتگی، اثر آفرینی، شیرینی اور موسیقی کا امنڈتا ہوا سیلاب ہے۔ نازک خیالات اور گہرے افکار ان میں پیش ہوئے ہیں لیکن ان کی زبان بہت ہی سادہ، سلیس اور شگفتہ ہے۔

پانچواں باب حفیظ کے گیتوں سے متعلق ہے۔ اس باب میں یہ روشن کیا گیا ہے کہ گیت حفیظ کے ہاتھوں اپنی بلندیوں تک پہنچا۔ ان میں ہندوستان کا دل دھڑکتا ہے۔ حفیظ کے گیت مختلف موضوعات کو اپنے احاطہ تحریر میں لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی خوبیوں کے پیش نظر اردو کے ناقدوں نے حفیظ کو اول درجے کا گیت نگار کہا ہے۔

چھٹا باب حفیظ کی شاعرانہ عظمت کو اجاگر کرتا ہے، اس باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ حفیظ نے حالی اور اقبال کے بعد اردو شاعری میں بعض مفید اضافے کیے ہیں۔ امید ہے آپ سب اس کتاب اور صاحب کتاب کے خد و خال سے واقف ہو چکے ہوں گے۔ حفیظ جالندھری کے ہی ایک شعر سے میں اپنی بات مکمل کرنے کی کوشش کروں گا۔

تشکیل و تکمیل فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

☆☆☆☆

احمد رشید (علی گڑھ؛ بھارت)

صنفِ افسانہ: ایک مکالمہ

افسانہ بھرپور زندگی کا تخلیقی استعارہ ہے۔ یہ استعارہ ہے انسانی نفسیات کے پیچ و خم کا، پیکار حیات کے رموز جاننے کا، حیاتِ انسانی اور کائنات کے مسلسل جنگ کی فتح و شکست کی روداد سنانے کا، حیات و ممات کی فلسفیانہ گرہیں کھولنے کا۔ انسان کے افعال و اعمال کے پس پشت جو عوامل کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کی نشاندہی کرنے کا۔ فرد اور گروہوں کے ذہنی اور جذباتی ردِ عمل پر روشنی ڈالنے کا، ساتھ ہی انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں جو سماجی مذہبی، نفسیاتی، تاریخی اور جغرافیائی عناصر کام کر رہے ہوتے ہیں ان پر غور و فکر کرنے کا رول افسانہ ادا کرتا ہے۔ انسان کی شخصیت سنوارنے اور بگاڑنے میں بیرونی اثرات کے علاوہ خود اس کو ورثہ میں ملی جبلت (تواتر سے یا قدرت کی جانب سے) کی تہہ داری میں پوشیدہ رموز کی نشاندہی افسانہ کرتا ہے۔ فرد کی زندگی میں جو کائنات چھپی ہوتی ہے اس کو اجاگر کرنے کے لیے افسانہ نگار اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر آزادانہ طور پر شعوری کوشش کرتا ہے۔ ڈرامہ صرف زندگی کا Action اسٹیج کرتا ہے اور افسانہ عمل اور ردِ عمل پر بھی غور و فکر کرتا ہے۔ انسان سے سرزد ہونے والا جو بظاہر عمل دکھائی دیتا ہے اس پر نگاہ ڈرامہ کی ہوتی ہے۔ دراصل وہ عمل شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک ردِ عمل ہوتا ہے اور افسانہ ان علل و اسباب کی جستجو کرتا ہے جہاں عام انسانوں کی نظر بغیر غور و فکر کے نہیں پہنچتی جب تک کہ افسانہ نگار کی عینک سے وہ نہ دیکھے۔ افسانہ، استعاروں اور علائم کے ذریعہ عمل (جو ردِ عمل ہے) ردِ عمل (جو بظاہر دکھائی دے) کی ایک انوکھی دنیا سے روشناس کراتا ہے۔ افسانہ "کیا" کے ساتھ "کیوں" کو بھی کھوجتا ہے۔ اور "کیا" کے بعد "کیسے" کی تلاش کرتا ہے۔

یہ بحث فضول ہے کہ 1960ء سے پہلے افسانہ لکھا گیا یا لکھا ہی نہیں گیا کیونکہ ادب ایک بہتا ہوا پانی ہے اس کے بہاؤ میں مختلف موڑ آتے ہیں کہیں سست رفتاری، تیز رفتاری کہیں رفتار طوفانی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس بہاؤ میں وسعت اور گہرائی بھی پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک تدریجی عمل ہے اس لیے یہ کہنا کہ فلاں دور میں ادب گھٹیا تخلیق ہوا بے معنی سی بات ہوگی۔ یہ کہیں کہ ترقی پسند تحریک کے دور میں سب ہی افسانے بہترین تخلیق ہوئے یہ بھی غلط ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ 1960 کے بعد لکھے گئے سبھی افسانے اچھے تخلیق ہوئے ہیں۔ چونکہ اردو کے نئے افسانے کی جڑیں تلاش کی جائیں گی تو ہمیں داستانیں پڑھنی ہوں گی۔ سرشار شرر کے

ناول، سجاد حیدر یلدرم اور سلطان حیدر جوش اور بعد میں مجنوں گورکھپوری کے افسانے پڑھنے پڑیں گے۔ ادب کے ہر دور کی اپنی ایک شناخت بھی ہوتی ہے اور اہمیت بھی۔ غالبؔ کی عظمت کے بعد یہ کہہ دینا کہ مومنؔ اور ذوقؔ کے پیدا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں غلط ہوگا۔ ہر دور میں ہر تخلیق کی اہمیت اور عظمت مسلم ہے، اگر اس نے تخلیقی اور فنی تقاضوں کو چھولیا ہے۔ سرسید کے بعد ادب سے زندگی کی ترجمانی اور اصلاحِ انسانیت کا تقاضہ کیا جاتا رہا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز میں بھی کچھ ایسے ہی عناصر Factors کام کر رہے تھے۔ مسئلہ صرف سماجی، تاریخی اور عصری پس منظر میں ان تخلیقات کی قدر تعین کرنے کا ہے۔ ساتھ ہی آئندہ وقت سے رشتہ قائم کرنے کا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ادب میں تصورات بدلتے ہیں اسی طرح تنقیدی اقدار اور نظریات میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ اسی روشنی میں اس کی جانچ پرکھ کی جاتی ہے چونکہ ہر تخلیق اپنا تنقیدی پیمانہ ساتھ لے کر آتی ہے۔ اگر ترقی پسند تحریک میں منصوبہ بند طریقے سے ادب تخلیق ہوا تو تنقید بھی آج تک منصوبہ بند اور گروہی عصبیت سے آگے نہیں نکلی ہے۔ اگر ہم کچھ اصول اور ضابطہ بنا کر یا کسی نظریہ کی پابندی کرتے ہوئے تنقید لکھیں گے تو کیا تنقید کا منصب پورا ہوگیا؟ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رائٹرس نے افراد کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اس کی Social Unity کو ختم کر دیا نتیجتاً افسانہ Total Life سے کٹ گیا اور ایک مخصوص طبقہ (کسان، مزدور، غریب، پیشہ ور) اور مخصوص نظریہ کی تبلیغ کرنے لگا۔ دوسرے محسوس کیا جانے لگا کہ سرمایہ داروں کے ذریعہ ان کا زبردست استحصال ہو رہا ہے۔ اگر کوئی تخلیق عصری آگہی کے ساتھ زماں و مکاں کی قید کو توڑتی ہوئی آگے نکل جائے تو وہ فنی معراج کو چھو لیتی ہے۔

1960ء کے بعد نئے نئے تجربے ہوئے۔ تکنیکی، اسلوبیاتی اعتبار سے اس میں تبدیلیاں آئیں، جہاں چونکا دینے والے تجربے ہوئے وہاں افسانہ نگار نے اپنی شناخت کھو دی۔ اس دہائی کے نئے افسانہ نگاروں کا رنگ ایک دوسرے سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ ان کے اسلوب کی پہچان کرنا مشکل ہوگئی۔ یہاں تک کہ اصناف ادب کی پہچان بھی کھونا شروع ہوگئی۔ فنکار کہنے لگا تخلیق صرف اظہار کی محتاج ہوتی ہے وہ اس کو فارم دینے کا گناہ بھی اپنے سر نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس لیے نثر اور غیر نثر شاعری اور غیر شاعری کی حدیں ٹوٹنے لگیں۔ افسانہ شاعری کے قریب اور شاعری افسانے کے قریب آنے لگی۔ یہ تسلیم کر پانا کہ کوئی تخلیق بغیر کسی شعوری کوشش کے صفحۂ قرطاس پہ بکھر جائے گی قابل یقین نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ فنکار میں ایک تخلیقی کرب جو شدتِ اظہار کے لیے بے چین رہتا ہے اس کے لیے کوئی اگر طویل فارم دینے کے لیے شعوری کوشش درکار ہوتی ہے۔ ورنہ نثر اور نظم کے درمیان حدِ امتیاز ٹوٹنے سے صنفی شناخت کے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ نثری نظم پہ فن کار ناول/ ناولٹ یا کوئی اور صنف کا لیبل لگا دے تو نثری صنف اور شعری صنف کا امتیاز ختم ہو جائے گا؟

افسانہ کے لیے یہ دور ہنگاموں اور شکست وریخت کا دور تھا۔ ظاہر ہے پرانی نسل کے افسانہ نگار نئی نسل کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ انتہا پسندی اور شدت پسندی کا زور دونوں ہی جانب بڑھا۔ سیدھی سادی صاف ستھری نظریاتی کہانیوں کو پڑھنے والا قاری جو ذہنی اعتبار سے علامتی، تجریدی، اساطیری کہانیوں کو پڑھنے کے لیے آمادہ نہیں تھا وہ افسانے سے کٹنے لگا۔ اور اس دور کے افسانے عدم مقبولیت کے شکار ہوئے۔ ظاہر ہے جس طرح ادب کی ہر صنف کے لیے قاری اہم ہے وہی حال افسانے کا ہے۔ میرے خیال میں فن کار اور قاری کے درمیان براہ راست رشتہ ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ فن کار لکھتا کس کے لیے ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ قارئین کے درمیان ذہنی سطحوں کی بنیاد پر تقسیم کی جا سکتی ہے۔ یوں تو ہر دور میں سنجیدہ قاری کا کال رہا ہے لیکن قلت میں اور اضافہ کیوں کیا جائے جب غالبؔ جیسا عظیم شاعر سہل پسندی پر آ گیا تو دیگر کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ مسئلہ قارئین کے علاوہ اردو مستقبل سے بھی جڑا ہے۔ جب کسی زبان کے لکھنے پڑھنے والے ہی نہیں ہوں گے تو زبان و ادب کی ترقی کیسے ممکن ہوگی، دوسرے سنجیدہ ادب کی کتابوں کی خرید و فروخت بھی مشکل ہو جائے گی۔

یوں تو ہر ادیب زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں اپنا مخصوص نظریہ رکھتا ہے۔ ذات، فرد، سماج، حیات و کائنات اور زماں و مکاں کے بارے میں اس کی اپنی سوچ اور ایک علیحدہ فکر ہوتی ہے لیکن تخلیق کے استعاراتی نظام میں حقائق سے متعلق اس کا نظریہ اس طرح ہم آہنگ ہونا چاہیے جس طرح شکر پانی میں حل ہو جاتی ہے۔ اگر قطرہ روغن کی طرح پانی پر نظر آئے تو وہ مکتب فکر کی تبلیغ تو ہو سکتی ہے تخلیق نہیں۔ اسی تناظر میں جدید افسانہ سمجھنا چاہیے۔ 1960 کے بعد جو افسانہ لکھا گیا وہ پیکار حیات، وسیع و عریض کائنات میں پھیلے کرداروں، دلربا زندگی کو اپنے وجود میں جذب کر کے افسانہ کی ترتیب و تعمیر کرنے کے بجائے افسانہ فرد کی زندگی کا المیہ بن گیا اور اس نے ابتدا ہی سے اپنے داخل کی طرف سفر کیا۔ خارج کو اس نے بالکل چھوڑ دیا۔ یعنی یہ کہ وہ صرف اپنی ذات کے محور پر گردش کرتی رہا۔ زماں و مکاں کی جبریت کے نتیجہ میں غیر محفوظ ہونے کا احساس بے یقینی، بے نام خوف، تنہائی اور اجنبیت کا احساس افسانے کے موضوع بنے۔ فنکارانہ امکانات کے مابین انتخاب کی عدم موجودگی کا احساس بڑھنے لگا۔ تہذیبی اور ثقافتی بنیادوں پر ہم آہنگی قائم نہ رہ سکی۔ پیچیدگی اور ابہام کی طرف افسانہ مسائل بہ سفر ہو گیا۔ افسانہ نگار استعاراتی، علامتی اور اساطیری نظام کو وسعت اور گہرائی دینے کے بجائے علامت صرف، علامت تجرید صرف تجرید کے لیے لکھنے لگے اور افسانہ خلاؤں میں سفر کرنے لگا۔ یہاں یہ اور قابل ذکر ہے۔ افسانے کے لیے علامتی اظہار کی جب ضرورت ہو تو اس کا تخلیقی استعمال مناسب ہے لیکن صرف فیشن کے طور پر علامتوں، استعاروں، تمثیلوں کا استعمال غیر مناسب ہوگا۔ 1980ء کے بعد کہانی کو کہانی سے جوڑنے کا اہتمام کیا گیا۔ پیچیدگی، ابہام دھندلکی، اینٹی اسٹوری میں اسٹوری ہو۔ اینٹی کرداروں میں کردار ہو، کہانی بہر حال کہانی

رہے جب اس نہج پر سوچا گیا تو نیا تخلیقی بیانیہ افسانہ سامنے آیا اور افسانہ کو اعتبار حاصل ہوا۔ اب نیا افسانہ کسی نظریہ کا تابع نہیں نہ کسی دباؤ کا مظہر ہے۔ نیا افسانہ غیر مشروط ذہن کا اظہار کرتا ہے۔ کسی خارجی قید و بند کو تسلیم نہیں کرتا۔ پورے طرز حیات کی نمائندگی کرتا ہے جنسی یا سیاسی مسائل کا اظہار تلذذ یا اصلاح کی غرض سے۔ تقلید یا پروپیگنڈہ کی بنیاد پر نہیں کیا جاتا بلکہ اپنے مخصوص اظہار خیال کے لیے، نہایت فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ افسانہ نگار اپنے احساس اور تجربات کے وسیلے سے افسانہ کی ترتیب و تعمیر کرتا ہے۔ حقیقت اور علامت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرکے بین الاقوامی ثقافتی نظام کے تناظر میں افسانہ تخلیق کرتا ہے۔ علامت نگاری کی شدید مخالفت کے باوجود اس نے وسیلۂ اظہار بنایا۔ آسمانی صحائف، اساطیر، مذہبی واقعات اور داستانوں کے کرداروں کو ہم عصر ماحول سے جوڑنے کی کوشش کرتا ہے اور ان کو نئی معنویت دے کر نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ ساتھ ہی پرانے واقعات کو اپنے زمانہ سے رابطہ قائم کرکے افسانے کی ترتیب و تعمیر کی گئی۔ مظاہر فطرت، اشیاء چرند پرند، سائنسی آلات کو علامتی شکل دے کر ان کو نئے معنی پہنائے گئے۔

اردو افسانے پر لکھی گئی تنقید غیر اطمینان بخش ہے لیکن فن تنقید کا مخالف بھی نہیں ہوں۔ 1960ء کے بعد جدید افسانہ پیچیدگی، ابہام اور خود ساختہ "میں" کے حصار میں قید ہوا۔ علامت اور تجرید کے بہاؤ میں بہہ گیا اور قارئین سے براہ راست اس کا راستہ منقطع ہو گیا تو تنقید کے ذریعہ افسانہ کو سمجھنے کی کوشش کی گئی مگر تنقید خود افسانہ سے زیادہ پیچیدگی اور دھندلے پن کا شکار ہو گئی۔ دوسرے نظریہ کی مخالفت کرنے والے نقاد خود کسی نئے نظریہ کے پابند ہو گئے اور گروہ بندی، پروپیگنڈہ اور فارمولا بندی کے جال میں پھانسنے لگے۔ حالیہ سے آج تک اردو تنقید کا یہ حال ہے کہ وہ تخلیق کو مشروط اور پابند کرنا چاہتے ہیں۔ تخلیق سے کچھ تقاضے پورا کرانا چاہتے ہیں۔ جو افسانہ "سب خوں" میں بھیجا جائے اس کی رسید بھی نہ ملے اور وہی افسانہ "شاعر" میں چھپ جائے اور "شاعر" سے واپس آجائے تو "شب خوں" میں شائع ہو جائے۔ تخلیق کے ساتھ ایسا گروہ بندی کی بنیاد پر ہی ممکن ہے ورنہ بظاہر کوئی دیگر وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ادب میں اشتراکی تنقید، سائنٹفک تنقید، جمالیاتی تنقید، جدید تنقید الگ الگ مکتب فکر ہیں۔ ان سے تعلق رکھنے والے نقادین اپنے اصول و نظریہ کی بنیاد پر تخلیق کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں اگر کسی تخلیق میں ان کے نظریہ کی ترجمانی ہو جائے تو وہ فنکار بہت عظیم ہو جاتا ہے۔ نہ جانے کتنے فنکار اس گروہ بندی کا شکار ہو کر دوئم درجہ کے نام و نشان ہو گئے۔ ان کے اوپر کسی نے ایک لفظ لکھنا گوارہ نہیں کیا۔ کتنے ہی فنکار اپنی سیاست، اثر و رسوخ کی بنیادوں پر اپنے دور کے جغادری ادیب بن گئے۔ ہر تخلیق اپنے تنقیدی پیمانے اپنے ساتھ لاتی ہے۔ نقاد صرف فنکار کو اس کی تخلیق کے حوالے سے مطالعہ کرے اور فن پارے کی وسیع و عریض کائنات میں سفر کرے؟

جہاں تک تخلیق و تنقید سے حیات و کائنات کے باہمی تعلق کا معاملہ ہے تو کائنات اپنے تمام تنوع کے ساتھ ایک اکائی ہے اور فرد اس کل کا ایک جز ہوتے ہوئے بھی اپنی ذات میں اکیلا نہیں ہے بلکہ اس کی شخصیت کے پس منظر میں کل کائنات اپنے تدریجی ارتقائی سفر میں پوشیدہ ہے۔ فرد کے نظریات، خیالات، سوچ و فکر اور مزاج کی تہوں میں جغرافیائی، تاریخی، سماجی، معاشی اور ماحولیاتی عوامل اپنا کام شعوری اور غیر شعوری طور پر انجام دیتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کوئی بھی شہ پارہ اسی کائنات میں انسانوں کے درمیان اور انسانوں کے ذریعہ جنم لیتا ہے تو اس کا تجزیاتی یا تنقیدی مطالعہ اس کی عضویاتی تقسیم کر کے کیسے کیا جا سکتا ہے؟ کیونکہ کوئی بھی تخلیق اپنی کل عناصر ترکیبی کے ساتھ فنکاری کا خوبصورت نمونہ ہوتی ہے۔ ایک فرد کی ایک ناک، دو آنکھیں اپنی الگ الگ حیثیت سے خوبصورت نہیں ہوتیں بلکہ کل چہرہ مع جسمانی ساخت کے نظام و ترتیب کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

اسی انداز میں کسی بھی ناول، افسانہ غزل یا فن پارہ کو کسوٹی پہ رکھ کر اس کی فنی قدر و قیمت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ تنقید کا مختلف مکتبۂ فکر میں تقسیم ہونے میں جہاں ضمنی اسباب ہیں وہاں ایسے بھی امکانات ہیں کہ نقاد اپنی شخصیت کی نمود و نمائش اور اپنی بے معنی شناخت منوانے کے زعم میں بعضوں نے سر کے بل چلنا شروع کر دیا اور کچھ دراز قد کرنے کے چکر میں نٹ بن گئے اور ادیب و فن کار بونے ہو گئے۔ فنکاروں کو اپنی نجی ملکیت بنانے کے لیے گروہی دائرے وسیع کیے گئے کیونکہ جمہوری نظام میں اکثریت کو فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ بات وہی ہے کہ راستہ صحیح ہو یا غلط اس کے پس منظر میں زماں و مکاں کے مختلف عوامل شعوری یا غیر شعوری طور پہ کام کر رہے ہوتے ہیں۔ پیٹ و دولت کی بات کہنے والا ایک گروہ، پیٹ کے نیچے کی بات کہنے والا ایک گروہ، اپنے اندر سمٹنے کی بات کہنے والا ایک گروہ، اندر سے باہر سفر کرنے کی بات کہنے والا ایک گروہ، عمل اور رد عمل کی بات کہنے والا ایک گروہ، اس گروہی تقسیم کے اسباب تلاش کیے جائیں تو پس منظر میں کہیں نہ کہیں صرف سیاسی یا تاریخی اسباب ہی نہیں بلکہ نفسیاتی، معاشی، جدلیاتی، جغرافیائی، ماحولیاتی اور ادیب کے ماحولی عوامل بھی کارفرما نظر آئیں گے۔ مگر اس مختلف مکتبۂ فکری تقسیم نے زبان و ادب کا بہت نقصان کیا ہے۔ کیونکہ وہ نہ قارئین کا ہو سکا اور نہ ادیبوں کا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ادیب اور غیر ادیب اکثریت میں آ گئے اور قارئین اقلیت میں رہ گئے۔ قارئین کے اس مختصر حلقہ میں زیادہ تر سنجیدہ قارئین نقادین کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ اب ظاہر ہے جو نقادین چاہیں گے ویسا ہی ادیب تخلیق کرے گا اور قارئین کے ہاتھ میں صفر رہ گیا۔ یہاں غلطی یہ ہوئی کہ نقادین نے تخلیقات کو گروہی تقسیم میں بانٹ دیا۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ تخلیقات نقادین کو گروہوں میں غیر شعوری طور سے تقسیم کرتیں کیونکہ ہر تخلیق اپنے تنقیدی پیمانے لے کر صفحۂ قرطاس پہ بکھرتی ہے۔

☆☆☆☆

نضیراالعظم (امریکہ)

نذرانۂ عقیدت: شہیرِ قلم سعادت حسن منٹو کے لیے

یہ گزرے بدھ کا واقعہ ہے، Pen State University سے نکلی تو ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ میں واشنگٹن سے فلاڈلفیا اپنی ایک دوست سے ملنے آئی تھی جو پاکستان سے کسی سیمینار میں شرکت کے لیے امریکہ آئی ہوئی تھی۔

ہائی وے پر ابھی آدھ گھنٹہ ہی چلی تھی کہ بارش تیز ہو گئی، ذہن ویسے ہی خیالات کا جنگل بنا ہوا تھا۔ گھنا جنگل۔۔۔۔جہاں ایک ننھا سا جگنو جیسے راہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اندھیرے میں دراڑ ڈالنے کی کوشش میں تھا۔ بارش چھاجوں برسنے لگی۔ جنگل مزید گہرا اور اندھیرا ہو گیا اور جگنو کہیں معدوم سا ہو گیا تھا۔ میں نے فوراً ہی ایک ایگزٹ لے لیا، ریمپ پر پہنچی تو دائیں طرف ایک بوسیدہ تختے پر Pen Garden لکھا نظر آیا۔ کیا خوب! بہت ذو معنی۔ میں بھی تو ایک شہیرِ قلم کے بارے میں کچھ لکھنا چاہ رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یونیورسٹی میں اپنی دوست کو بتا رہی تھی کہ مجھے سعادت حسن منٹو پر ایک مضمون لکھنا ہے لیکن ذہن بہت گنجلک ہو رہا ہے، کہاں سے شروع کروں اور کیسے ختم کروں؟ اس پر وہ زور سے ہنسی تھی، یہ کیا مشکل ہے۔ انٹرنیٹ پر بہت کچھ مواد مل جائے گا بس پڑھو اور لکھ ڈالو! مگر بات صرف مضمون لکھنے کی نہیں تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ منٹو کی تحریر کے ہر زاویے کو جانچا اور پرکھا جا چکا تھا۔ ہزاروں صفحات، لاکھوں الفاظ اردو، انگریزی اور دیگر زبانوں میں احاطۂ تحریر میں آ چکے تھے۔ میں ان سے مختلف کیا لکھ سکوں گی؟ اور یہی خیال مجھے الجھائے ہوئے تھا۔

گاڑی باغ میں داخل ہو چکی تھی، سڑک کے کنارے گھنے روییہ دار درخت رحمتِ خداوندی پر شاداں وفرحاں نظر آ رہے تھے۔ ابھی دم لینے کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈ رہی تھی کہ اچانک تھوڑی دور بنے ایک پکنک شیڈ پر نظر پڑی، کچھ دیسی قسم کے لوگ نظر آ رہے تھے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ماحول پکنک کا نہیں لگ رہا تھا، نہ رنگ برنگے میز پوش، نہ کھانے کا سامان نہ پکنک والی ہلچل۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لوگ بھی بارش سے بچنے کے لیے اس شیڈ کے نیچے آ گئے تھے۔ میں نے گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر دی اور بارش رکنے کا انتظار کرنے لگی۔ اپنی سوچوں میں گم میں اس وقت اسلام آباد کے اپنے پسندیدہ گلزار گلاب اور یاسمین باغ کو یاد کر رہی تھی کہ اچانک بند شیشے پر دستک سے چونک پڑی۔۔۔آ یئے، ادھر شیڈ میں آ جایئے۔۔۔ایک صاحب نے استقبال کیا۔ اپنے دیس کے لوگ کتنے پرتپاک ہوتے ہیں، ہر جانے انجانے کے لیے ان کے پاس جگہ ہوتی ہے

۔میں دل ہی دل میں اپنے لوگوں کی مدح سرائی کرتی شیڈ میں داخل ہوگئی۔ ایک طائرانہ نظر لوگوں پر ڈالی، ہر عمر اور طبقے کے افراد نظر آ رہے تھے نوجوانوں سے لے کر سائیں بابا تک۔ سب جیسے کسی خاص کام میں محو تھے کہ انھیں میری آمد کا احساس تک نہ تھا۔ پھر اچانک خیال آیا کہ شاید کسی فلم کی عکس بندی کا سیٹ ہے۔ سب اپنے مکالمے یاد کر رہے ہیں۔

میں ایک بنچ پر بیٹھ گئی اور دلچسپی سے لوگوں کا مشاہدہ کرنے لگی۔ تو آپ خاصی الجھن میں ہیں، کیوں؟ میرے میزبان نے اپنا چوڑے فریم کا چشمہ کرتے کے دامن سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ اور گھنے جنگل میں اچانک جگنو پھر کہیں سے چمکا۔ ارے آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ کیا آپ اور ہم پہلے کہیں ملے ہیں؟ میں نے حیرت زدہ لہجے میں سوال کیا۔ تن۔۔۔ نہیں مگر ہم جسے چاہتے ہیں جان لیتے ہیں، ان کی مدھم، مضبوط آواز کے ساتھ ہی میں جیسے دم بخود رہ گئی، یہ انداز، سفید کرتا پاجامہ، صدری اور چوڑے فریم کا چشمہ اور دھیما لہجہ۔۔۔۔ منٹو صاحب! میری آواز میں بے یقینی کی گونج تھی۔ وہ مسکرا دیے، میں سب کو بتاں گی کہ میری آپ سے ملاقات ہوئی، تھوڑی دیر بعد جب کچھ حالت سنبھلی تو میں نے کہا: کون یقین کرے گا؟؟ وہ مسکرائے۔ سب کریں گے! ایک ایسا مصنف جس نے فرد کے شر میں خیر سے پرانسان کی دریافت کی، جس نے انسانی نفسیات کی گرہوں کو الفاظ کے نشتر سے نہیں بلکہ لفظوں کی نرمی سے کھولا اور جس کے قلم کی موشگافیوں پر آج بھی لوگ حیران ہیں اور۔۔۔۔ دنیا میں لوگ آتے ہیں، کام کرتے ہیں، اعتراضات، تنقید، دشمنی، مقدمے سہتے ہیں اور جب دنیا سے چلے جاتے ہیں تو یہی لوگ مشاہیر، نابغہ روزگار، شہپر اور عالم ہستیوں کے زمرے میں گنے جانے لگتے ہیں۔ اتنا یاد رکھو کہ نارسائی میں بڑا حسن، بڑی کشش ہے۔ ان کے لہجے نے میرے جوش کو ہوش کی سرحدوں پر لا کھڑا کیا تھا۔

آؤ میں اپنے لوگوں سے تمھارا تعارف کراؤں۔ وہ کھڑے ہو گئے، بارش تھم چکی تھی اور موسم اچانک خوش گوار ہو گیا تھا۔ میں نے بغور شیڈ میں بکھرے لوگوں کو دیکھا۔ ایک نوخیز لڑکا ہاتھ میں سائن کا اودا بلاؤز لیے اسے الٹ پلٹ رہا تھا جیسے اس میں کچھ تلاش کر رہا ہو۔ ایک داڑھی والا گندا سا فقیر گلے میں موٹے دانوں کی مالا پہنے روپے گن رہا تھا، اس کے چہرے پر پھیلی بے یقینی اس کے لالچی ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔ ابھی میں جائزہ لے ہی رہی تھی کہ منٹو صاحب کی آواز نے یہ تسلسل توڑ دیا۔ یہ ہیں صفیہ میری اہلیہ۔ انھوں نے ایک سادہ سی خاتون کی طرف اشارہ کیا جو چائے بنا رہی تھیں، وہ مسکرا دیں، شکر ختم ہو چکی ہے کب چھپے گا تمھارا افسانہ اور کب پیسے ملیں گے انھوں نے ہم دونوں کو چائے کی پیالیاں تھماتے ہوئے کہا۔

کیا ہمیں بھی چائے ملے گی؟؟ سیاہ لباس میں ملبوس ایک درمیانے قد کی عورت ان کے قریب آ کر بولی۔ میں نے غور سے دیکھا اس کی کالی شلوار اس کی ٹانگوں سے لمبی تھی کہ اس کے جوتے تک چھپ

گئے تھے۔ ہاں سلطانہ کیوں نہیں، مگر پھیکی پینا پڑے گی، صفیہ نے کہا۔ آپ لوگوں کا حال بھی ہمارے ہی جیسا ہے، گھر کی ہر چیز بک گئی، کوئی کا بک نہیں اور۔۔۔اور ہمارے افسانے کی اجرت نہیں ملتی کیوں؟؟ منٹو صاحب حسب عادت مسکرا کر بولے؛ لو مختار بھی آ گئیں۔ صفیہ بولیں، مختار ایک طویل القامت عورت تھی، سیاہ لباس کے ساتھ جھولتے ہوئے چاندی کے بندے اچھے لگ رہے تھے، اس نے ایک استغنا سے ہم پر نظر ڈالی اور سلطانہ کا ہاتھ پکڑ کر چلی گئی۔

اچھا ادھر آؤ، ان سے ملو اور پہچانو۔۔ منٹو صاحب تھوڑی دور بیٹھی ایک عورت کے پاس رک گئے۔ وہ مجھے ایک خوفناک دیوانی سی عورت لگی، کٹے ہوئے بھورے بال جو پریشان، بے حد پریشان تھے، ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں جمی جیسے گاڑھا خون، وہ بھی کہیں کہیں سے چٹخی ہوئی، ڈھیلا ڈھالا لمبا سفید چغہ، کھلا گریبان اور پاؤں میں لکڑی کی کھڑاؤں جسے وہ گاہے بگاہے زمین پر دھیمے دھیمے دھمک رہی تھی۔
یہ۔۔۔یہ۔۔موذیل ہے ناں؟ میں نے پوچھا، بالکل وہی ہے! انھوں نے تصدیق کی۔
موذیل، جس نے ترلوچن سے شادی کا وعدہ کیا اور عین شادی والے دن غائب ہوگئی..... کیوں؟؟ اس نے میری سوچ پڑھ لی تھی۔ اس نے اپنی موٹی موٹی یہودی آنکھیں اوپر اٹھائیں چند لمحے سوچتی رہی، اب بھلا میں سکھ سے شادی کیسے کر سکتی تھی؟؟ وہ بولی۔ مگر وہ تو گوڈے گوڈے تمہارے عشق میں دھنسا تھا، میری سوچ نے تنبیہ کی، خاک! اس کے سارے ولولے سارا عشق تو اس کی داڑھی مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے، یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوئی اور کھٹ کھٹ کرتی ترلوچن کو آوازیں دیتی وہاں سے اٹھ گئی۔

اور یہ ہیں بابو گوپی ناتھ، معصوم سادہ سا آدمی، میں ان کا شجرہ تو نہیں جانتا لیکن اتنا معلوم ہے کہ یہ ایک بہت بڑے کنجوس بنیے کا بیٹا ہے، باپ کے مرنے کے بعد جو جائیداد اسے ملی سب اپنی خواہش کے مطابق اڑانا شروع کر دی۔ اور ان کے ساتھ غفار سائیں ہیں، تہمد پوش، پنجاب کا ٹھیٹ سائیں، یہ بابو گوپی ناتھ کے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ میرا مطلب سمجھ جائیے کہ آپ ہر آدمی جس کی ناک بہتی ہو، جس کے منہ سے لعاب نکلتا ہو، پنجاب میں خدا کا پہنچا ہوا درویش بن جاتا ہے۔ یہ بھی بس پہنچے ہوئے ہیں یا پھر پہنچنے والے ہیں۔ منٹو صاحب رک گئے، یہ دونوں افراد مجھے خاصے دلچسپ لگے اور اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے کسی سے بات کروں، ایک خوبصورت جوان عورت نے بابو گوپی ناتھ کو پکارا۔ اوہ، یہ زینت ہے نا، وہی کشمیری کبوتری؟ میں نے سرگوشی میں منٹو صاحب سے سوال کیا، انھوں نے اثبات میں گردن ہلا دی، زینت قریب آ گئی تھی۔ منٹو صاحب میں ان سے کہہ رہی تھی کہ چل کر تھوڑا آرام کر لیں مگر....... بابو گوپی ناتھ نے اس کا جملہ کاٹ دیا، بھئی مجھے دو جگہ سکون ملتا ہے۔ رنڈی کے کوٹھے پر اور پیر کے تکیے پر، پیسہ ختم ہو جائے گا تو کسی پیر کے تکیے پر چلا جاؤں گا، مگر ان دونوں

جگہ ایسی کیا بات ہے؟؟؟؟؟ میں نے منٹو صاحب کا سوال دہرا دیا۔ کچھ سوچ کر بولے ان دونوں جگہوں پر فرش سے چھت تک دھوکا ہی دھوکا ہے جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے اس کے لیے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے، گوپی ناتھ نے کہا اور جیسے جامد ہو گئے۔

ادھر آؤ ان سے ملو، انھوں نے لوگوں کے ایک مختصر گروہ کی طرف اشارہ کیا، میں ایک لمحے کو ٹھٹک گئی، چند غنڈے اور بدمعاشوں کے حلیے والے لوگ آپس میں کسی بات پر بحث کر رہے تھے لیکن ان کا شائستہ انداز ان کے حلیوں کی نفی کر رہا تھا۔ یہ غنڈوں، لچوں، جیب کتروں کی انجمن کے ارکان ہیں، منٹو صاحب نے بتایا۔ اوہ.... جھوٹی کہانی۔۔۔ حالانکہ وہی سب سے بڑا سچ تھا اور ہمیں منٹو صاحب سے یہی شکایت ہے کہ......ان میں سے ایک نے کہا جو ایک سادہ اور خوش وضع لباس میں تھے، اپنی جیب سے ایک سفید رومال نکالا اور منہ صاف کر کے پھر بولے..... کہ ملک وملت کا ادنی سا خادم۔ ہم انسان پہلے چور، رہزن اور ڈاکو بعد میں ہیں، جیسے آپ لوگ پہلے انسان پھر سیٹھ صاحب کمشنر وزیر وغیرہ۔ ہم چوری کرتے ہیں ڈاکے ڈالتے ہیں مگر اسے کوئی نام نہیں دیتے۔ لیکن معزز ہستیاں بدترین قسم کی ڈاکہ زنی کرتی ہیں مگر یہ جائز سمجھی جاتی ہیں۔ وزیر صاحبان اپنی مسند وزارت کی سان پر استرا تیز کر کے ملک کی ہر روز حجامت کرتے ہیں اور یہ کوئی جرم نہیں، لیکن کسی کی جیب سے بڑی صفائی سے بٹوہ چرانے والا قابل تعزیر ٹھہرا، تعزیر کو چھوڑیے قابل گردن زدنی گردانا جاتا ہے۔ تمام محکموں میں اوپر سے لے کر نیچے تک رشوت ستانی کا سلسلہ قائم ہے کسے نہیں معلوم؟؟ کیا یہ بھی کوئی راز ہے جس کے انکشاف کی ضرورت ہے؟ خویش پروری اور کنبہ نوازی کی بدولت سخت نا اہل، خرد ماغ اور بدقماش بڑے بڑے عہدے سنبھالے بیٹھے ہیں.....ارے، یہ تو آج کے پاکستان کے نظام کی نقشہ کشی کر رہے ہیں۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔ ہمارے یہاں کوئی سفارش کام نہیں آتی۔۔۔ اور اس نے اپنی تقریر جاری رکھی۔

گہرے اندھیرے جنگل میں سینکڑوں جگنو چمکنے لگے تھے، راستے واضح ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان جگنوؤں کی روشنی میں مجھے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا بشن سنگھ نظر آیا جو پاگل ہونے کے باوجود اپنی مٹی کے عشق سے بھرا ہوا تھا اور جس نے اپنی جان اس مٹی پر قربان کر دی تھی۔ میں نے ممی کو بھی دیکھا جو سوگندھی سے اس کی ہتک پر بات کر رہی تھی، پریشان حال ایشر سنگھ بھی نظر آیا جو ٹھنڈے گوشت کی آگ میں بھسم ہو رہا تھا۔ لوگ بہت تھے لیکن اب میرے لیے یہاں رکنا ممکن نہ تھا، سیل فون پر تواتر کے ساتھ شوہر کے پیغامات ان کی پریشانی ظاہر کر رہے تھے، راستے کی طوالت کا احساس بھی تھا، گھر پہنچی تو چمکدار دھوپ ڈھلنے کی تیاری کر رہی تھی، بھیگے درختوں کے چنچل پتے خوشگوار ہوا سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔۔۔۔ اور جنگل کے اندھیرے پر جگنوؤں کی روشنی پوری طرح چھا چکی تھی!!!

ڈاکٹر علی محمد خاں (؟؟؟؟؟)

کیسا کیسا دیکھا چاند

ابن انشا نے کیا خوب کہا ہے:

ملکوں ملکوں، شہروں شہروں، کیسا کیسا دیکھا چاند
ہر اک چاند کی اپنی دھج تھی، ہر اک چاند کا اپنا روپ

ملکوں ملکوں دیکھا چاند ہمارے عزیز مکرم طارق محمود مرزا کا چوتھا سفرنامہ ہے۔ اس سے قبل وہ سفر عشق، خوشبو کا سفر اور دنیا رنگ رنگیلی جیسے تین اچھوتے سفرناموں کی بدولت اردو میں سفرنامے لکھنے والوں کے قبیلے کے جھرمٹ میں اپنی دل آویز تحریر کی بنا پر خاص شناخت رکھتے اور دور ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے متذکرہ سفرناموں پر پاکستان کی کئی یونیورسٹیوں میں تجزیاتی اور تحقیقاتی مقالے لکھے جا چکے ہیں جو اس امر کا بین ثبوت ہے کہ انھیں عام قارئین کے علاوہ اردو زبان و ادب کے اساتذہ کرام اور کالج اور یونیورسٹی کے طالب علموں نے بھی پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔

ملکوں ملکوں دیکھا چاند شمالی یورپ کے چار ملکوں، ڈنمارک، سویڈن، ناروے اور فن لینڈ اور پانچویں مشرق وسطیٰ میں جداگانہ خدوخال کے حامل عرب ملک، قطر کی سیر و سیاحت کا چشم دید احوال ہے جسے انھوں نے دنیا بھر میں کووِڈ کی عفریت کے پنجے گاڑنے سے پہلے بسلامت روی و باز آئی کے مصداق بخیر و خوبی انجام دے لیا تھا۔

وہ جو کہتے ہیں کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ یعنی سنی ہوئی بات دیکھی ہوئی بات کے برابر کیسے ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں نے ان ملکوں کے بارے میں صرف سنا ہے، طارق محمود مرزا نے انھیں نہ صرف دیکھا ہے بلکہ اپنے زاویۂ نگاہ سے خوب دیکھا بھالا ہے۔ پھر جس طرح انھوں نے اپنے سیر و سیاحت کے حالات کی لفظی مرقع کاری ہے، اس پر میرا جی چاہتا ہے کہ انھیں شاباش دوں۔ مصور رنگوں سے تصویر بناتا ہے لیکن بعض اوقات رنگوں کی کمی بیشی سے تصویر میں کوئی خامی رہ جاتی ہے مگر طارق مرزا نے ایسی لفظی مرقع کاری کی ہے کہ قاری اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتا محسوس کرتا اور وہ پورا منظر متحرک ہو کر قاری سے ہم کلام ہو جاتا ہے۔ ہمارے اس خیال کی تائید معروف ماہر تعلیم پروفیسر رئیس علوی بھی کرتے ہیں۔ وہ طارق مرزا کے ایک سفرنامے کی بابت لکھتے ہیں:

طارق مرزا لفظوں میں منظر کشی کا فن جانتے ہیں۔ وہ چلتے پھرتے لوگوں، بہتے ہوئے دریا، ٹھہری

ہوئی جھیلوں، بلند و بالا عمارتوں، گنگناتی ہوئی آبشاروں، مہکتے ہوئے سبزہ زاروں اور گھومتی ہوئی پیچیدہ شاہراہوں کی رنگارنگ تصویر کشی اس کمال کے ساتھ کرتے ہیں کہ قاری دیر تک ان کے لفظوں کی پہنائیوں میں کھو جاتا ہے۔

مصنف طارق مرزا کی ایک عمر سڈنی (آسٹریلیا) جیسے پرکشش شہر میں گزری ہے اور انھوں نے نیوزی لینڈ، جاپان اور سوئزر لینڈ جیسے خوبصورت ملکوں کی بھی سیاحت کی ہے مگر جب وہ پہلی بار ڈنمارک پہنچے اور وہاں قدرت کے نظارے دیکھے جن میں رہی سہی کسر حضرتِ انسان نے پوری کر دی ہے تو ان میں مبہوت و مسحور ہو کر رہ گئے۔ مثلاً جب وہ اپنے ایک دوست کے ہمراہ کوپن ہیگن کے مضافات میں پہنچے تو تا حد نگاہ رشکِ خلد قطعات دیکھ کر حیران رہ گئے۔ حیرانی کی مرقع کاری دیکھیے کن لفظوں میں کرتے ہیں:

"اس سارے منظر پہ چیری بلاسم کے پھولوں کی بہار اس طرح حاوی تھی کہ ان سے نظر نہیں ہٹتی تھی۔ یہ درخت پتوں سے خالی مگر گلابی پھولوں سے لدے تھے۔ یہ گلابی پھول تیزی سے جھڑ رہے تھے اور سڑک اور گھاس پر گلابی چادر کی طرح پھیلے تھے۔ انھوں نے پورے ماحول کو گلابی اور مہک آور بنا دیا تھا۔ اس کی دلفریب رنگت، اس کی سوندھی خوشبو اور پھولوں میں سے چھن کر آنے والی روپہلی دھوپ، رنگ و نور کی بارش برسا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ آسمان سے گلابی رنگ برس رہے ہیں، خوشبوئیں اتر رہی ہیں۔ یہ گلابی رنگت، یہ نکہت دیکھ کر سیاحوں کے چہرے بھی پھولوں کی طرح کھلے تھے۔ میں ان پیڑوں کے نیچے کھڑا گلابی منظر دیکھنے میں منہمک تھا کہ ایک گلابی تتلی میری آنکھوں کے سامنے اڑنے لگی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے مٹھی میں بند کر لیا۔ ذرا دیر کے بعد مٹھی کھولی تو وہ پھول کی پتی تھی، جس نے میری ہتھیلی بھی رنگ دی تھی۔"

طارق محمود مرزا جب محیر العقول اشیا یا جگہوں کو دیکھتے ہیں تو اس شے یا مقام کی لفظی عکاسی کے ساتھ ساتھ اپنے احساسات بھی بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی یہ خوبی ہے وہ قاری کو سوچنے پر اکساتے ہیں۔ وہ ڈنمارک کی سیاحت کے بعد سٹاک ہوم (سویڈن) پہنچتے ہیں اور بادشاہ اور ملکہ کی سرکاری رہائش گاہ دیکھتے ہیں جو بارھویں صدی عیسوی سے سینہ زمین پر اپنے پنجے گاڑے مضبوط کھڑی ہے تو اپنے احساسات کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

مجھے ڈنمارک، برطانیہ اور تھائی لینڈ کے محلات یاد آ گئے۔ ان کے اندر بھی ایسی ہی نادر و نایاب شاہی اشیا اور سجاوٹ میں نے دیکھی تھی۔ جس طرح مفلس کسی خطے کا بھی ہو، ان کے حالات و مسائل یکساں ہوتے ہیں، اسی طرح بادشاہ کہیں کا بھی ہو، اس کو حاصل نعمتیں بہترین سے کم نہیں ہوتیں۔ آخر وہ بادشاہ ہوتا ہے۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ساری بادشاہوں کے ارد گرد گھومتی ہے۔ کوئی اچھا ہوتا تھا اور کوئی برا۔ کوئی عوام دوست تھا اور

کوئی عوام دشمن ۔کوئی جنگوں کا شوقین ہوتا اور کوئی بیویوں کا ۔کسی کو ملک فتح کرنے کا شوق تھا اور کسی کو اولاد پیدا کرنے کا ۔کوئی محلات کا شائق تھا اور کوئی قلعے تعمیر کرتا تھا ۔کوئی فاتح تھا اور کوئی مفتوح ہو کر بھی بادشاہوں جیسے سلوک کی توقع رکھتا تھا ۔تاریخ صرف بادشاہوں کے حالاتِ زندگی کا نام ہے ،اس کے سوا کچھ نہیں ۔تاریخ میں عوام کا ذکر کہیں نہیں ملتا ،سوائے اس تعداد کے جو ان بادشاہوں کی بادشاہت قائم رکھنے کے لیے جنگوں میں مرتے تھے ۔ان کے رہن سہن ،ان کے مسائل ،ان کی خانگی زندگی ،ان کی افلاس اور ان کی نفسیات کا ذکر تاریخ کے صفحوں سے ایسے غائب ہے جیسے وہ ہو کر بھی نہیں تھے ۔کیا وقت بدل گیا ہے ۔کیا آج کے جمہوری دور میں عام انسانوں کو وہ وقعت اور توقیر مل گئی ہے ،جس کے وہ حق دار ہیں ۔

سویڈن کی سیر و سیاحت کے بعد طارق محمود مرزا نے ،جو بجا طور پر زمین کا گز کے لقب کے مستحق ہیں ،سکنڈے نیویا کے تیسرے ملک ناروے ،جو روئے زمین پر بجانب شمال بعید ترین جزیرہ نما ہے ،کا رخ کیا ۔جب ہمارا یہ سفر نامہ نگار ناروے پہنچا تو اس نے اس ملک کے بارے میں معلومات حاصل کیں جنھیں اس نے بغیر کسی لگی لپٹی کے بڑے خلوص کے ساتھ اپنے قارئین کو بھی منتقل کیا تاکہ وہ بھی اپنی معلومات میں معتد بہ اضافہ کرلیں ۔یہ انتہائی دلچسپ معلومات ہیں جس میں پاکستانی کمیونٹی کا بھی تذکرہ ہے ۔

ہمارے سفر نامہ نگار طارق محمود مرزا کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ جب کسی دیارِ غیر کے لوگوں کو اس ملک کے آئین اور یقینِ محکم کے تحت شاداں و فرحاں زندگی بسر کرتے دیکھتے ہیں تو اس کا موازنہ و مقابلہ اپنے وطنِ عزیز پاکستان کے ساتھ ضرور کرتے ہیں جس کے پس منظر میں ان کی شدید خواہش موجود ہے کہ اے کاش ! میرا ملک بھی خوشحال ہو جائے اور پاکستان کا نام بھی دنیا بھر میں عزت و وقار کے ساتھ لیا جائے ۔مثلا ایک جگہ رقم طراز ہیں :

تفنن برطرف مگر آبادی کے اس عظیم فرق کے ساتھ پاکستان اور ناروے میں جو غربت اور امارت کا فرق ہے ،اس کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے ۔کہاں ترپن لاکھ اور کہاں بائیس کروڑ ۔اگر پاکستان کے وسائل یہی رہیں اور آبادی ترپن لاکھ ہو تو ملک میں کوئی غریب نہیں ہوگا ۔بہر کیف ہمارا زیرک سیاح اور سفر نامہ نگار سکنڈے نیویا کے ٹھنڈے ٹھار ملکوں کی سیاحت کے بعد جب قطر جیسے گرم مرطوب ملک میں پہنچتا ہے تو ہر گل را رنگ و بوئے دیگر است کے مصداق وہ قطر کو دیکھ دیکھ کر زیادہ خوش ہوتا اور ہمیں شاداں و فرحاں نظر آتا ہے ۔شاید اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ رہی تھی کہ انھیں یہاں جگہ جگہ نہ صرف خوشنما و دل کش مسجدیں نظر آئیں بلکہ یہ مسجدیں وقتِ نماز نمازیوں سے پر ہو جاتی تھیں ۔دوحہ کے قیام کے دوران میں قدیم روایتی بازار سوق الوقف میں جا کر مختلف اشیا اور حشرات بکتے دیکھے ۔رنگ رنگ چڑیاں دیکھ کر یوں گل افشانی کی :

"آگے چل کر ہم نے جیتے جاگتے، بولتے اور چہکتے ہوئے رنگوں کی دنیا دیکھی۔ یہ انواع و اقسام کی رنگین چڑیاں تھیں۔ سیکڑوں، ہزاروں چڑیاں پنجروں میں بند اس طرح چہک رہی تھیں کہ طیور سے بھرے جنگل کا گمان ہوتا تھا۔ ان پنجروں میں نیلا، سبز، جامنی، سفید، خاکستری، نقرئی، سیاہ، بھورا، نارنجی، سرخ، پیلا، سنہرا ہر رنگ نظر آتا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ قدرت نے اپنی اس ننھی اور نازک مخلوق کے ذریعے کارخانہ قدرت کے تمام رنگ فضا میں بکھیر دیے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ حضرت انسان نے فضا میں بکھرے اور گلشن میں ترنم ریز ننھی جانوں کو پابندِ قفس کر دیا ہے۔ یوں کانوں میں رس گھولنے والی ان کی میٹھی چہکار نغمۂ قفس بن کر رہ گئی ہے۔"

سوق الوقف میں ہی مصنف کی چائے نوشی کا احوال پڑھیے اور ان کی انشا پردازی پر سر دھنیے۔:

"دن بھر کی گرمی اور تھکاوٹ کے بعد سہ پہر کے ان خوشگوار لمحات میں اور اس دلکش سیاحتی مقام پر چائے جب پیالی میں انڈیلی تو اس کی بھاپ اور خوشبو سارے صحن میں پھیل گئی۔ ہمارے ارد گرد بیٹھے یورپی سیاح یہ خوشبو سونگھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ستائش و طلب تھی۔ چائے کا ایک ایک جرعہ جسم و روح کو فرحت پہنچا رہا تھا۔ گرم اور شیریں سیال دہن سے حلق میں اترتا اور ایک انوکھے ذائقے سے آشنا کرتا جاتا تھا۔ ایک ایک گھونٹ سے حرارت، خوشبو اور توانائی کی لہری جسم و جاں میں اٹھتی محسوس ہوتی۔"

قطر کے عرصۂ قیام میں ایک بار جب وہ دوحہ کے مضافات میں گئے اور وہاں انھوں نے دل کش پارک اور سرسبز و شاداب قطعات دیکھے جن میں ہر چہار جانب بھانت بھانت کے خوشنما پودے اور رنگ رنگ کے پھول کھلے تھے تو وہ سبحان تیری قدرت کہتے ہوئے حیران و ششدر رہ گئے۔ لکھتے ہیں:

"یہ اہلِ قطر کا کمال تھا کہ سخت گرم اور خشک موسم میں بھی انھوں نے ہر طرف سبز گھاس اور پھول اگا رکھے تھے۔ میں نے جتنے رنگوں کے پھول قطر میں دیکھے اتنے سکنڈے نیویا کے ملکوں میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ دوحہ میں بڑے بڑے پارک ہیں۔ ان پارکوں کے لیے مٹی، گھاس اور پودے سب باہر سے منگوائے جاتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہاں کی جھلسا دینے والی گرمی میں بھی پھول پودے تر و تازہ نظر آتے تھے۔

مصنف نے اپنے سفرنامے میں موقع محل کی مناسبت سے نہ صرف بہترین شعر شامل کیے ہیں بلکہ چند ایک نثری نظمیں بھی لکھی ہیں جو ان کے عمدہ ذوقِ سخن کی غماز ہیں۔ بہرکیف طارق محمود مرزا کا سفرنامہ ملکوں ملکوں دیکھا چاند منظر کشی، لفظی مرقع کاری، برمحل موازنہ و مقابلہ، عمدہ زبان و بیان، نادر تشبیہات و استعارات اور دل کش اسلوب بیان کا ایسا دل آویز مرقع ہے جو اردو سفرناموں میں ممتاز و مشرف مقام و مرتبے کا حق دار ہے۔

☆☆☆☆

شاہین کاظمی (سوئٹزرلینڈ)

بلیک ہول

ہفت رنگ پرندوں کی ڈار
سیاہ آسمان کی وسعتوں سے
زمین کی جانب دیکھتی ہے
اس زمین کی جانب جو اپنے ہی بیٹوں کے
لہو میں بھیگی ہوئی ہے
جس کی بیٹیاں زندان کی موٹی دیواروں
کے اس طرف
ان لمحوں کو جمع کرنے میں مصروف ہیں
جو دعائیں آسمان تک لے جاتے ہیں
مگر بوسیدہ اوڑھنیاں جمع شدہ لمحوں کو
زمین برد کر دیتی ہیں
منڈیر پر بیٹھے امن کبوتروں کے پروں سے
لہو ٹپکتا ہے
کائی لگی دیواروں سے لگ کر بیٹھے قابل وجود
تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ایک کر کے
اس بلیک ہول کی طرف دھکیل دیے جاتے ہیں
جو ہماری نسلوں کی کھوپڑیوں سے بھیجہ چاٹ کر
انھیں شارٹ کٹ کے سارے راز سمجھاتا ہے

ہفت رنگ پرندے چونچوں میں تھامی کنکریاں
بلیک ہول کی طرف اچھالتے ہیں
مگر بوسیدہ اور تعفن زدہ اوڑھنیاں
جمع شدہ سارے لمحے یک دم ہی زمین برد کر کے
پاؤں پسارتی رات پر تبرہ کرنے لگتی ہیں

☆☆☆☆

یشب تمنا (برطانیہ)

ایک دن سردیوں کا۔۔۔!

شام بھاگی جا رہی تھی اور میں
سردیوں کا اک فسردہ، بور دن
اس کے پیچھے لڑکھڑاتا تھا
کہ اس کو روک لوں
مجھ کو کافی کی طلب تھی
اور اُس کو
رات کے کھانے کی تیاری کی سوچ!

ملگجے ہی میں اسے
میں نے نحیف آواز دی
وہ رکی بس لمحہ بھر کو اور کہا:
"کل ملیں گے!"
اور پھر گویا ہوئی
"میں نے سورج سے کہا ہے
وہ بھی کل نکلے گا عجلت سے ذرا
تم بھی جلدی جاگ جانا صبح میں
وقت کے کیفے میں بیٹھیں گے
ذرا گپ شپ رہے گی"

یہ کہا اور تیز بھاگی
اپنی گاڑی کی طرف

سرخی بڑھتی جارہی تھی آسماں پر
میں بھی اپنا سر جھکائے
گھر کو واپس آگیا!

□□□□

گلناز کوثر (برطانیہ)

دل کے اندر اور اک دل ہے

کیا یہ میں ہوں؟
یہ جو گردو پیش سے غافل، دُکھتے دل پہ
اور اک دن کا بوجھ اٹھائے،
خواب کے تانے بانے بُنتے
دو ہاتھوں کو
جیون ساہوکار کے آگے گروی رکھ کے،
دل جذبوں سے خالی کر کے
آنکھوں کو بے جان سی میز پہ
دھر دیتی ہے
اپنے وقت کا لمحہ لمحہ
دُکھتے جسم کا ریشہ ریشہ
بھڑ بھڑ جلتی آگ کا
ایندھن کر لیتی ہے
تب کہیں جا کے عمر کی جھیل میں
کھَن کھَن کرتا
شام کا سکہ گرتا ہے۔۔۔ یا۔۔۔
پھر میں وہ ہوں؟
وہ جو اپنی چاپ سے بھی گھبراتی ہے

پر دن ڈھلنے سے پہلے
گھر کی دیواروں سے
سرخ، گلابی کرنیں چن کے
ننھے دیپ بنا لیتی ہے
بہتے دریا کی موجوں سے
نظم کا جادو سیکھتی ہے
اور دور دیس کے روشن دن کی چاندی بُن کے
سُونے غرفوں کو خوابوں سے بھر لیتی ہے
بول مداری
یا پھر میں کوئی اور ہوں
اور جو۔۔۔۔
ندیا، بادل کی بولی پہچانتی ہے
اور کوئی جو۔۔۔۔پچھلی رات میں
"یہ" اور "وہ" کو سوتا چھوڑ کے
وقت کے دروازے سے باہر
گلیوں گلیوں گھومتی ہے
دھک دھک کرتے شہر کے دل میں
اور اک دھڑکن ڈھونڈتی ہے
جن کو دن کا دیوتا
چھونے بھی نہیں دیتا
ان پیڑوں کا
پتا پتا چُومتی ہے

افروز عالم (جدہ؛ سعودی عرب)

تغیر

زمانہ جب خموشی سے نئے تیور میں ڈھلتا ہے
تو موسم خشک ہوتا ہے شجر کپڑے بدلتا ہے
کبھی تو بھیگی شاخیں آگ کے گولے اگلتی ہیں
کبھی تو برگ و گل تریاق کے اسباب بنتے ہیں

شجر کی مختلف شاخیں ہمیشہ ساتھ رہتی ہیں
ثمر بھی ساتھ دیتی ہیں، وہی سائے کی ضامن ہیں
شجر کی شاخوں کی ہے اہمیت موسم بدلنے میں

یہی شاخیں
جو اکثر موسموں کا رخ بدلتی ہیں
اگر چہ سوکھ جائیں تو یہی ایندھن بھی ہوتی ہیں

یہ شاخیں جو کبھی آپس میں لڑنے پر اتر آئیں
کبھی دست و گریباں ہوں تو اکثر اپنی الجھن سے
نیا ماحول دیتی ہیں

ضروری یہ نہیں کہ

وہ نیا ماحول سب کے من موافق ہو
سبھی کو راس آجائے

نہ جانے کیوں مجھے کچھ عرصے سے اب ایسا لگتا ہے
نیا موسم لہو کی جھیل میں غوطے لگائے گا!!!

☆☆☆☆

شہلا نقوی (امریکہ)

اخبار کی سرخی

ہاتھوں میں اخبار کا کاغذ
کانپ رہا تھا
سیہ حروف تڑپتے
جلتی دھات پہ کیڑے

سرخی
متن کے بوجھ سے
نیچے سرک رہی تھی

صفحے کے اوپر والا حصہ
کالے حرفوں سے خالی ہے

سرخ لہو کی لہریں
اس پہ پھیل رہی ہیں
کاغذ ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے
میری پوریں، تازہ خون سے چپک رہی ہیں
☆☆☆☆

سید الطاف بخاری (ہیوسٹن؛ امریکہ)

رقصِ آوارگی

ریگِ ساحل کو منجدھار کی جستجو
جب چکوری کرے چاند سے گفتگو
بامِ دل پہ گرے خواہشوں کا لہو
اپنی ہستی کو ڈھونڈے نظر چار سُو
جذب وحشت، تحیر یا دیوانگی
رقصِ آوارگی، رقصِ آوارگی

لامکاں سے مکاں اذنِ تقدیر سے
واپسی ہے مگر، حسنِ تدبیر سے
حکمِ پرواز سے پہلے پر چھن گئے
جرم ثابت مرا تیری تحریر سے
زیرِ خنجر صدا ہے یا ہے بندگی
رقصِ آوارگی، رقصِ آوارگی

عشق نے جب بھی ترتیب دی کربلا
کارواں کوئی کوئے حرم سے چلا
توڑ ڈالا بھرم پیاس نے آب کا
اپنے لشکر سے "حرؒ" جو روانہ ہوا
موت کیسے بنی اس گھڑی زندگی
رقصِ آوارگی، رقصِ آوارگی

ایک سندیسہ لائی فلک سے ہوا
تیرا نہ ہونا ہونے سے اچھا لگا
عقدہ سارا طلب کا عطا کا کھلا
جب فنا ہو کے قطرہ سمندر بنا
نہ کوئی آرزو، نہ ہی خواہش رہی
رقص آوارگی، رقص آوارگی

یہ سرِ شام جو نغمۂ ساز ہے
گنبدِ شب سے یہ صبح کی آواز ہے
دل کی دھڑکن پکارے صدا "اللہ ہُو"
"تو نہیں ہے" یہی تیرا اعزاز ہے
شاعرِ بے نوا اور کیا چاہیے؟
جا تجھے بخش دی، عشق اور شاعری
رقص آوارگی، رقص آوارگی

☆☆☆☆

جیم جاذل (برطانیہ)

I Object

مجھے اعتراض ہے ان ضرورتوں پر
جو بچھا دیتی ہیں درختوں کے جسم
آرام گاہوں میں
اور ٹانگ دیتی ہیں
بے نور آنکھوں والے بارہ سنگوں کے سر
دیواروں پر
ایسی آرام گاہیں جہاں بھیڑیے
سرد خون سے بھرے گلاس ہاتھوں میں لیے
شیر کی کھال سے ڈھکے فرش پر ٹہلتے ٹہلتے
اپنے بچوں کو
سفید ہرن کے شکار کی داستان سناتے ہیں
اور پرندے ماتم کرتے رہتے ہیں
اپنی یادداشتوں پر
جب نہیں ملتے وہ درخت
جن پر بنے گھونسلوں میں
بچوں کو چھوڑ کر
وہ تلاشِ رزق میں نکلے تھے
مجھے اعتراض ہے ان ماؤں پر

جن کے پاؤں گھروں میں نہیں ٹکتے
اوران کے جنے ہوئے
بارودی جیکٹیں پہن کر
نکل پڑتے ہیں جنت کی تلاش میں
اوردھرتی ماں کو بھرنے پڑتے ہیں اپنی کوکھ میں
ادھڑے ہوئے جسم
جن پر جنت ڈھونڈنے والوں کے ٹکڑے
چپکے ہوتے ہیں
مجھے اعتراض ہے ان پر
جواعتراض نہیں کرتے
اورجھونک دیتے ہیں ساری توانائی
ایساخزانہ جمع کرنے میں
جس کا کوئی مصرف نہیں
کوئی مصرف نہیں سوائے اس کے
کہ کاغذی صندوقوں میں بھر کر
اوپر لکھ دیے جائیں
شاعروں اورادیبوں کے نام
I object

☆☆☆☆

توقیر رضا (فرانس)

ملکِ خداد

خدا گلی سے گزر رہا ہے
خدا چھتوں پر سے اُڑ رہا ہے
خدا کے سب بال و پر کھلے ہیں
خدا کی مسجد، خدا کا مندر، خدا کا گرجا
(خدا کا بستی)
خدا کے سب بام و دَر کھلے ہیں
ہم اپنے پنجرے میں قید پنچھی
ہم اپنی بستی میں اجنبی ہیں
ہمارے رستوں پہ خونی باڑ یں
(لگانے والے)
بھی سب خدا کے ہی آدمی ہیں
وہ چاہے جس بھی گلی سے گزرے
خدا کے سب راستے کھلے ہیں

☆☆☆☆

سعید نقوی (امریکہ)

درخت

پتوں کے ملبوس کی اب صرف افسردہ مہک ہی باقی تھی۔ ورنہ پت جھڑ کے بعد برہنہ درخت سردی سے کانپ رہا تھا۔ آسمان سے اترتی سفید روئی سردی میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔ جو چیز سینکڑوں کے لیے تسکین وتفریح کا باعث بنتی، اس کا اثر ہر ایک پر یکساں نہیں ہوتا تھا۔ وہ درخت اپنا سر بلند کیے، اپنے تن کی کپکپاہٹ چھپائے مضبوطی سے ایستادہ تھا۔ اگر جڑیں گہرائی میں پیوست ہوں تو سر بلندی دشوار نہیں ہوتی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ یہاں بھی تھا۔ برف سے فرار اس کے بس میں نہیں تھا۔ یہ آسمان کی کارستانی تھی۔ اور آسمان کی کارستانی کا علاج صرف آسمان کے پاس ہی ہے۔ اگر کوئی اس کے تنے پر ہاتھ رکھتا تو یقیناً تنے کی خفیف سی سرسراہٹ ضرور محسوس کر لیتا۔ یہ سرسراہٹ شاید صرف خارجی برف کی وجہ سے ہی نہیں تھی، یہ اندر سے اٹھتی خنکی تھی۔ بخار کی تپش بھی وہی کپکپی طاری کر سکتی ہے جو برف کی خنکی۔ وہ اس کی نچلی شاخیں کاٹ کر لے گئے تھے۔ سردی جو اتنی زیادہ تھی۔ وہ جانتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ برف گرنے کے بعد شاخیں کاٹیں تو گیلی ہوں گی، دھواں دیں گی، شعلے پیدا نہیں کر سکیں گی۔ اس لیے انھوں نے برف گرنے سے پہلے ہی سردی سے بچاؤ کا انتظام کر لیا تھا۔ اپنی گرمی کے لیے اسے برہنہ کر دیا تھا۔ یوں یہ کپکپاہٹ صرف سردی ہی سے نہیں تھی، یہ اس کے اندر سے کہیں اٹھتی مایوسی تھی۔ وہ اس کی نچلی شاخیں کاٹ کر لے گئے تھے۔ وہ سردی برداشت بھی کر سکتے تھے، بند گھر میں رہتے تھے۔ انھیں یہ خیال کیوں نہ آیا کہ یہ شاخیں اس کے تن سے کسی وجہ سے لگی ہوئی ہیں۔ یہ درخت پھل دار نہیں تھا، ان کے لیے بیکار تھا۔ شکر ہے ان کی پہنچ اور ضرورت صرف نچلی شاخوں سے ہی پوری ہو گئی تھی۔ کیا معلوم یہ ختم ہونے پر وہ اونچی شاخوں کی طرف۔۔۔ اور پھر ان کے ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ جاتے۔ ضرورت اشد ہو تو پہنچ کے دست بھی دراز ہو جاتے ہیں۔

یہ درخت بہت پرانا نہیں تھا۔ لوگوں کو یاد ہے کہ ابھی دو، تین سال پہلے ہی کی بات تھی جب کریم بابو کی نوکری کی معیاد ختم ہوئی تھی۔ جہاں تک لوگ یاد کرتے یہ درخت اس کے بعد ہی نمودار ہوا تھا۔ ساٹھ برس کی عمر میں ریلوے کے سپاہی کی ملازمت کی مدت پوری ہو گئی۔ مٹھی بھر تنخواہ ایک ہفتہ چلتی، مہینے کے باقی تین ہفتوں کے لیے اوپر کی آمدنی کام آتی۔ کریم بابو ہمیشہ رات کی ڈیوٹی لگواتے۔ مال گاڑیوں میں رات کی حفاظتی نوکری ان کے خاندان کے تحفظ کے امکانات پیدا کرتی۔ گھر سے نکلتے تو نیک بخت ایک تھیلے میں دو چپاتیاں

اور کچھ سالن ایک ٹفن میں رکھ کر ان کے ساتھ کر دیتی۔ محلے سے نکل کر بڑی سڑک تک آتے، راہ میں بچے بڑے سب ہی سلام کرتے۔ کریم بابو اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ سب سے اچھی طرح ملتے تھے۔ کسی طرح انھوں نے سفید پوشی کا بھرم رکھا ہوا تھا۔ بڑی سڑک سے ایک بس انھیں ریلوے اسٹیشن تک لے جاتی۔ ایک چھوٹے ٹفن کے لیے بھلا اتنے بڑے تھیلے کی کیا ضرورت تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ اس محلے میں تقریباً سب ہی بڑے تھیلوں میں چھوٹے ٹفن کے ضرورت مند تھے۔ تھیلے کی ہیئت بدل جاتی لیکن فلسفہ وہی رہتا، تو کوئی کیا پوچھتا۔ جس بات کا علم ہو اسے دریافت کرنا محض مخاطب کو شرمندہ کرنے کا امکان پیدا کرنا ہے۔ واپسی میں کریم بابو کا تھیلا زیادہ بھرا ہوتا۔ ان کی ڈیوٹی ہفتے کے پانچ دن ہوتی۔ یوں ہفتے کے پانچوں دن اس تھیلے میں کچھ نہ کچھ بھرا رہتا۔ اناج، غلہ، ضروریاتِ زندگی کا دوسرا سامان جو مال گاڑی کے ڈبے میں ایک قصبے سے دوسرے میں منتقل ہو رہا ہوتا۔ ورنہ کبھی تو تھیلے کی جگہ ان کی خاکی وردی کی جیب پھولی ہوتی۔ ضرورت مند تھے، لالچی نہیں، بس اتنا کہ گھر میں چولہا جلتا رہے اور بچے پڑھتے رہیں۔ کبھی گھر میں شادی غمی کا موقع بھی آ جاتا۔ اوپر تلے کے پانچ بچے تھے، تین لڑکے اور دو بیٹیاں۔ جب وہ نیک بخت پورے پیٹ سے ہسپتال جاتی تو ان دنوں کریم بابو کے تھیلے کا وزن اور بڑھ جاتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک بیٹا اب میٹر ریڈر تھا، اور دوسرا انجینیرنگ کا ڈپلومہ کر رہا تھا۔ بیٹیوں کے ہاتھ پیلے ہو چکے تھے۔ سب سے چھوٹا بیٹا مرگی کا مریض، کسی کام کا نہیں تھا۔ ان کے ٹفن کے تھیلے کا وزن اتنا بھی نہیں تھا کہ مرگی کے کسی ماہر ڈاکٹر سے باقاعدہ علاج کراتے۔ ایک بار دکھایا بھی تو اس نے اتنی مہنگی دوائیں لکھ دیں جو ان کے ٹفن کے پیٹ سے زیادہ تھیں۔ سو اب یہ لڑکا کبھی گھر میں اور کبھی باہر اماں کہہ کر چیختا، اپنی گدی پکڑ لیتا، پورے بدن سے زمین پر گرتا اور تشنج کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ گھر والے تو کیا اب محلے والے بھی عادی ہو گئے تھے۔ اگر وہ باہر ہوتا تو کوئی بھاگ کر کریم بابو کے گھر پہ اطلاع کر دیتا، کوئی چپل لے کر اس کی ناک کی جانب لپکتا۔ کوئی آدھے گھنٹے کی غشی کے بعد، بیٹا بیدار ہو کے کپڑے جھاڑتا اور زندگی پھر اپنے ڈگر پہ چل نکلتی۔

میٹر ریڈر بیٹا ٹفن تو نہ لے جاتا۔ اس کے کام میں اناج کے بجائے نقد کا زیادہ دخل تھا۔ نہ اس نے کبھی باپ سے پوچھا کہ سپاہی کی تنخواہ میں سات افراد کا اپنا کنبہ کیسے پال لیا، اور نہ ہی کریم بابو نے اس سے کبھی میٹر ریڈر کی نوکری کے بارے میں سوال کیا۔ ناگزیر ضروریات معاشرے کی پابندیوں کی خلاف ورزی کا معقول عذر تھیں۔ گھر ایک خاموش سمجھوتے کے تحت چل رہا تھا۔ جس میں مالیات کے علاوہ ہر بات موضوع گفتگو بنتی سیاست، مذہب، سماجیات، حکومت، تعلقات، لیکن آمدنی اور اخراجات کے بارے میں ایک سوچی سمجھی خاموشی اختیار کی جاتی۔ یعنی سب ہی یہ کرتے ہیں کہہ کر ہر فرد خود کو سمجھا لیتا۔ یہ ایک خوش و خرم گھرانا تھا جو جرم زندگی کی سزا

ہنس کر جھیل رہا تھا۔

ریٹائرمنٹ کی عمر ہونے تک بڑا بیٹا باقاعدگی سے کمانے لگا تھا، درمیانہ بیٹا بھی انجینئرنگ ڈپلومہ کے درمیان جز وقتی ملازمت کر رہا تھا۔ بیٹیوں کی شادی سے دو منہ گھر میں کم ہوئے اور بڑی بہو گھر آ گئی۔ میٹر ریڈر کی اگر صنعتی علاقوں میں تعیناتی ہوتی، تو وہ شاید اپنا ایک الگ گھر لے لیتا، لیکن شہری صارفین کی تجاوزات میں محض بغیر کنکشن کا ایئر کنڈیشنر، یا آہستہ چلتا میٹر ہی شامل ہوتا، جس سے اتنی آمدنی نہ ہو پاتی کہ وہ الگ گھر لے سکے۔ لہٰذا بیٹا بہو فی الحال کریم بابو کے ساتھ ہی رہ رہے تھے۔

ریٹائرمنٹ پر سب ہی عزیز و اقارب نے مبارک باد دی کہ چلیے عزت سے ایک دور ختم ہوا، کریم بابو نے دل لگا کر محنت سے نوکری کی، کبھی بلا ضرورت چھٹی نہیں کی، اور ایمانداری سے مدت ملازمت مکمل کی۔ یہ بات ان کے ادراک سے اوجھل نہیں تھی کہ جس دن چھٹی لیتے اس دن ٹفن کا خالی تھیلا باورچی خانے کے کونے میں ایک دیوار سے ٹنگا نیک بخت کا منہ چڑا رہا ہوتا۔ سب کو معلوم ہو جاتا کہ آج غالباً گھر میں دال یا سبزی پکے گی۔ کئی دن کی متواتر تعطیل سے گھر کے اقتصادی نظام میں ایک بھونچال آ جاتا۔ نئے پرانے ٹوٹکے اور نسخے آزمائے جاتے۔ اس بات کو یقینی بنایا جاتا کہ کریم بابو واقعی ملازمت پر جانے کے لائق نہیں، اور محض کسل مندی یا تھکاوٹ ہی انھیں نہیں روک رہی۔ کیا عجب ہے کہ کئی بار کریم بابو ہلکے بخار میں بھی ملازمت پر حاضر ہوئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد بھی زندگی کی رفتار وہی رہی، صرف رخ بدل گیا۔ جیسے کسی بیل کو رہٹ کی مشقت سے نکال کر مل یا بیل گاڑی کے سامنے جوت دیا جائے۔ کریم بابو گھر کے کاموں میں دفتری کاموں سے زیادہ مصروف ہو گئے۔ اب وہ گویا ان کاموں کے لیے مہیا تھے۔ گھر میں بلا وجہ کام نکلنے لگے۔ بابو یہ کر لیجیے گا، بابو وہ لے آئیے گا۔ ابھی تک بڑے بیٹے کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی، لہٰذا پوتے پوتیوں کی خدمت کی ذمہ داری سے آزاد تھے۔ گھر کے کچھ کام جو پہلے دوسرے کرتے وہ اب ان کی ذمہ داری ہو گئے۔ اب غیر محسوس طریقے سے گھر میں حاکمیت بھی بدل رہی تھی۔ بیٹوں کے لہجے میں زیادہ بے باکی آ گئی تھی۔ آئینی طور پر وہ اب بھی گھر کے سربراہ تھے، لیکن اب آئین کے نفاذ میں اتنی سختی نہ برتی جاتی۔ انھیں لگتا اب وہ کسی شاہی جمہوریت میں نام کے بادشاہ ہیں۔ تقریبات میں معزز نظر آنا بھی ان کی ذمہ داریوں میں سے ایک تھا۔ نیک بخت انھیں دیکھتی تو انھیں لگتا جیسے اس کی نگاہوں میں کچھ تھا۔ انھیں وہ کچھ پسند نہیں آتا تھا؛ کیا یہ ترحم تھا؟ جو بھی تھا انھیں نامنظور تھا۔ نیک بخت کے روز و شب میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ان کے درمیان بھی اب نئے اصول وضع ہو گئے تھے، نئے خاموش معاہدے۔ یہ زندگی اپنے اطراف میں لوگوں سے خاموش معاہدوں ہی سے تو گزرتی ہے۔۔ یہ معاہدے خود بخود ہی مرتب ہو جاتے ہیں، سرحدیں متعین ہو جاتی ہیں، کس کو کہاں تک جانے کی اجازت ہے،

کون سے فقرے منع ہیں اور کون سے ادا کیے جا سکتے ہیں۔ کبھی بیٹا کوئی ایسا فقرہ کہہ دیتا جس کی گونج کئی دنوں تک گھر میں سنائی دیتی۔ بڑھتی عمر اور گھٹتے اقتدار کے ساتھ ان تعلقات کی روز نئی حدود متعین ہو رہی تھیں، جن میں کریم بابو کی زمین تنگ اور باقی افراد کا رقبہ بڑھ رہا تھا۔ جیسے کوئی ہمسایہ غیر محسوس طریقے سے آپ کے علاقے میں تجاوز کرنے لگے، ایک اینٹ یہاں ایک پودا وہاں۔

گھر میں تین کمرے تھے۔ سب سے بڑے اور زیادہ آرام دہ کمرے میں کریم بابو اور ان کی نیک بخت رہتے۔ یہ بھی ایسی باتوں کی مانند ہوتا ہے جو خود بخود تسلیم کی جاتی ہیں۔ ویسے بھی اس وقت وہ گھر میں واحد شادی شدہ جوڑا تھے۔ ایک کمرے میں لڑکے اور تیسرے میں دونوں بیٹیاں۔ پھر بیٹیاں بیاہ کر اپنے سسرال میں خود اپنے نئے کمروں میں چلی گئیں تو بڑے بیٹے کو شادی کے بعد ان کا کمرہ مل گیا اور باقی دونوں بیٹے سب سے چھوٹے کمرے میں رہتے رہے۔

وہ بھی ایسا ہی خنک دن تھا، سرد، بے رحم۔ شاید کریم بابو کے ریٹائر ہونے کے ایک سال بعد کی بات ہوگی جب بڑے بیٹے نے انھیں یاد دلایا کہ اس کے کمرے میں سردی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

حیرت ہے، بیٹیوں نے کبھی بتایا بھی نہیں؟ کریم بابو خالی الذہنی سے بولے۔ یہ ایک فطری ردعمل تھا۔ بہو جو بہت کم گو اور خاموش طبع تھی، اس نے یاد دلا یا کہ خود بابو جی کے کمرے میں تو شدید سردیوں میں بھی اتنی خنکی نہیں ہوتی۔ اگر وہ کبھی کسی کام سے ان کے کمرے میں جاتی تھی، تو سردی اسے اذیت نہ دیتی۔

کیا ہو سکتا ہے؟ بڑے بیٹے نے تاسف سے کہا۔ یہ کیا ہو سکتا ہو جیسے فضا میں ٹھہر گیا، ایک لحظہ اس نے انتظار کیا کہ کوئی اس کا جواب دے پھر یہ تبصرہ تیرتا ہوا زمین پر اتر گیا۔ جو موجود ہے اسی میں گزارا کرو، بیٹے نے اپنی بیوی کو سمجھایا۔ اس رات واقعی بہت سردی تھی، کریم بابو کو بھی اپنے کمرے میں بجلی کا ہیٹر جلانا پڑا تھا۔

میرے خیال میں کسی طرح بیٹے کے کمرے کے لیے بھی ایک اضافی ہیٹر لے لیا جائے، کریم بابو نے کمرے کی تنہائی میں نیک بخت سے کہا۔

ہمیں اپنا یہ کمرہ بیٹے بہو کو دے کر چھوٹے کمرے میں منتقل ہو جانا چاہیے، یہ مشورہ دیتے ہوئے نیک بخت کی آواز سرگوشی میں بدل گئی تھی۔

ارے ہم اپنا کمرہ کیوں تبدیل کریں؟ کریم بابو بولے۔ کچھ جوڑ کر ان کے لیے بھی بجلی کا ایک اور ہیٹر منگوا لو، اس کے ہوتے ہوئے بجلی کے بل میں اضافہ تو ہونے سے رہا، انھوں نے بات میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ہیٹر لگانے سے تو صرف کمرے کا درجہ حرارت ہی بڑھ سکے گا، نیک بخت کو بعض اوقات کریم بابو پر

بہت غصہ آتا۔ یہ یقیناان ہی لمحات میں سے ایک تھا۔ وہ مضطرب تھی،شوہر کا مزاج سمجھتی تھی۔ وہ کسی آنے والے طوفان سے پہلے فضا میں تعطل دیکھ رہی تھی، جیسے فضا خود بے یقین ہو کہ کس کا ساتھ دے۔ کریم بابو شاید یہ نہیں دیکھ رہے تھے۔ انھیں یہ احساس ضرور ہو رہا تھا کہ کچھ بدل رہا ہے۔ اس رات وہ دیر سے سوئے۔ انھوں نے خواب میں خود کو ایک صحرا میں بھٹکتے پایا۔ ان کا قطب نما کھو چکا تھا، اور راستہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ بس منہ اٹھائے صحرا میں کبھی اس طرف چل دیتے، کبھی اس طرف۔ سمت کے تعین کے بغیر صحرا کا یہ سفر انھیں جان لیوا لگ رہا تھا۔ اچانک ان کا پاؤں ریت کے ایک بھنور میں پڑا، پھر وہ اس سے نکل نہ سکے۔ اس نے ان کے دونوں پاؤں جکڑ لیے۔ ان کے پاؤں سے جڑیں نیچے کی جانب بڑھنے لگیں۔ ان کا بدن ایک تناور درخت بن گیا۔ اب وہ اپنی جگہ بدلنے سے قاصر تھے۔ شب گزر گئی لیکن ان کا خواب ختم نہ ہوا۔ اب وہ گھر میں صبح سے منسوب آوازیں سن رہے تھے۔ پتیلی میں چائے ابلنے کی آواز، توے پر چپڑی پلٹے جانے کی آواز، انڈا تلے جانے کی خوشبو۔ انھوں نے آواز دے کر نیک بخت کو پکارنا چاہا، مگر ناکام رہے۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں، کچھ بھی تو نہیں ہلا پا رہے تھے۔ وہ محض خواب ہی نہیں تھا، جاگنے پر وہ اس کی تعبیر بن گئے تھے، ایک اندوہناک بات ہو گئی تھی، خواب میں بھٹکتے جانے کس وقت وہ کمرے سے باہر آ گئے تھے، وہ ایک درخت بن گئے تھے۔ اگر سوچو تو اس میں بہت زیادہ حیرت کی کوئی بات ہے بھی نہیں۔ حیوانات و نباتات دونوں ہی جاندار ہیں۔ سانس لیتے ہیں، بڑھتے ہیں، لباس بدلتے ہیں، غذا استعمال کرتے ہیں، بڑھاپا آتا ہے اور مر بھی جاتے ہیں۔ تو یہاں حیات نے محض اپنا روپ بدل لیا تھا۔ کریم بابو درخت بن گئے تھے۔ تصویر کا فریم اسی دیوار پر ٹنگا تھا لیکن اس میں لگی تصویر بدل گئی تھی۔

نیک بخت نے اپنے کمرے کی کھڑکی کے باہر یہ نیا قد آور درخت دیکھا، پھر کریم بابو کی غیر موجودگی، درخت سے بہت مانوس خوش بو آ رہی تھی، جس سے صرف وہی واقف تھی۔ ہر آدمی کی اپنی مخصوص بو ہوتی ہے، لیکن یہ اس سے مختلف ہوتی ہے جو صرف اس کے ہم سفر کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ یہ اتنی خفیف ہوتی ہے کہ صرف لپٹنے والے کے مشام جاں کو ہی معطر کر سکے، ایک دوسرے کو شناخت کرنے کی خوشبو۔ اس درخت سے وہی مانوس خوش بو اٹھ رہی تھی۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ گھر میں ہونے والی کوئی تبدیلی اس سے پوشیدہ نہیں رہتی تھی۔ وہ یک بارگی بے ساختہ درخت سے لپٹ گئی، پھر چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھا کہ کسی نے دیکھا تو نہیں۔

اگر کسی نے محسوس بھی کیا کہ کل تک تو یہ درخت موجود نہیں تھا، اب اچانک یہ کہاں سے نمودار ہو گیا تو وہ بولا نہیں۔ ایسا اکثر ہو جاتا ہے۔ ہم مانوس منظر میں نئی چیز دیکھیں تو بے یقینی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کوئی پودا ہوتا تو شاید سوال اٹھتا۔ مگر پورا درخت، یہ کیسے ممکن ہے، یقیناً یہ یہیں موجود رہا ہوگا، میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ اگر کسی کو

الجھن ہوئی بھی تب بھی وہ نہیں بولا کہ کہیں اس کا مذاق ہی نہ اڑایا جائے۔ بہت ہاہاکار مچی، اخباروں میں اشتہار دیے گئے۔ سب سے چھوٹے بیٹے نے سب سے زیادہ اثر لیا۔ دور دراز محلوں اور علاقوں میں نکل جاتا۔ جیسے اسے امید ہو کہ باپ کسی فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا مل جائے گا۔ رفتہ رفتہ اس سرگرمی میں کمی آگئی، لوگوں نے صبر کرلیا، اب بھی نجی گفتگو میں حیرت سے سر ہلاتے: اتنا بڑا آدمی کیسے اچانک غائب ہوگیا!

سردیوں کے دنوں میں کھڑکی عموماً بند رہتی، درخت تنہا باہر کھڑا رہتا، گھر کے انتظامی دائرے سے باہر۔ وہ سب سن سکتا تھا، دیکھ سکتا تھا، اور سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ کہ سوچ بھی سکتا تھا۔ مگر نہ ہی وہ بول سکتا تھا اور نہ ہی اپنی مرضی سے جگہ بدل لینا اس کے بس میں تھا۔

جب نیک بخت نے دانت میں درد کی شکایت کی تو بہو نے تجویز کیا کہ درخت کی ایک چھوٹی ٹہنی توڑ کر اس سے مسواک کیا کریں، خود اس کی خالہ کو یہی بیماری تھی، جو دن میں دو بار مسواک سے دور ہوگئی تھی۔ اسے حیرت ہوئی جب اس کی ساس نے وہ مسواک توڑنے سے اتنی سختی سے منع کیا۔ کریم بابو کے اچانک غائب ہوجانے کے بعد سے اس کے اپنی ساس سے تعلقات عجیب سے ہوگئے تھے۔ اسے لگتا جیسے اس کی ساس کوشش کرتی کہ اس کی راہ میں نہ آئے۔ ان کے درمیان خاموش معاہدے میں کچھ یک طرفہ ترمیمات ہوگئی تھیں۔

شام میں چھوٹا بیٹا مسواک توڑ لایا تو نیک بخت کا رنگ زرد پڑ گیا۔

اماں، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ وہ تشویش سے بولا۔

وہ جواب نہ دے سکیں، بس پھٹی آنکھوں سے مسواک کو دیکھتی رہیں۔ انھوں نے اسے ایسی احتیاط سے تھام رکھا تھا جیسے مسواک زمین پر گرگئی تو کوئی قیمتی چیز ٹوٹ جائے گی۔ انھوں نے اسے، بہت احتیاط سے اپنے غسل خانے میں رکھ لیا، اور اس کے بعد کبھی دانت کے درد کی شکایت نہیں کی۔

موسم بدل گیا، کھڑکی سے لگا یہ بے ثمر درخت ان کے کسی کام کا نہیں تھا۔

اماں تو اس کی ایسی نگہداشت کرتی ہیں کہ بابو جی ہوتے تو حسد کرتے، بہو نے ایک دن ہنس کر کہا۔

بابو کی اچانک گمشدگی نے انھیں ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اگر درخت میں دل لگ رہا ہے تو لگا رہنے دو، شوہر نے اسے سمجھایا۔

آم کے درختوں پہ بور آیا تو جیسے پورے خاندان کی اجتماعی رال بہنے لگی۔ یہ پھل ہے بھی تو ایسا شاہانہ، گھر کے ہر فرد کو پسند تھا۔ تنگ دستی میں اس کی گٹھلی تک ایسے چوس لی جاتی کہ پہچانی نہیں جاتی۔ آم آنے سے پہلے ہی اس کے بور کی تیکھی مہک آنے والے اچھے دنوں کا اعلان کرنے لگی۔ درخت کی جڑوں سے

ایک ہوک سی اٹھی، اور حسرت بن کر اس کی شاخوں میں کہیں دم توڑ گئی۔ نیک بخت نے کھانے کے بعد سب میں ایک ایک آم تقسیم کیا تھا۔ شاید چار ہی آم تھے۔ درخت کے پتوں نے دم سادھ لیا جب بڑا بیٹا ایک پلیٹ میں تین آم اور چھری لیے دبے پاؤں بیوی کی طرف گیا۔

مجھے معلوم ہے کہ تم نے دل بھر کر نہیں کھایا تھا، اس نے ایک آم کاٹ کر بیوی کی طرف بڑھایا۔

چھپا کر لائے ہو؟

ارے کم تھے، پہلے نکالتا تو وہیں سب میں تقسیم ہو جاتے۔

ہاں یہ تو ہے، لیکن اگر تم مجھے وہاں سب کے سامنے ایک زیادہ آم دیتے تب بات تھی! بہو اٹھلا کر بولی۔

تمھارے لیے آم کھانا زیادہ ضروری ہے، یا سب کے سامنے زیادہ وصول کرنا؟ بڑے بیٹے نے چڑ کر پوچھا تھا۔

دونوں! وہ بے تکلفانہ بولی تھی۔

یہ منظر نیا نہیں تھا، صرف کردار اور ڈائیلاگ بدل گئے تھے۔ نیک بخت کو یاد تھا جب کریم بابو اور وہ جلدی جلدی گھر سے باہر آم ختم کر کے پھر گھر میں داخل ہوئے تھے۔

گرمیوں میں کھڑکی کھل جاتی تو درخت کا بس نہ چلتا کہ اپنی شاخیں کمرے کے اندر بھیج دے۔ ایک بار پانی کی بالٹی اٹھائے، نیک بخت کا پاؤں ایسا رپٹا کہ گر ہی پڑی۔ درخت کو ایسا لگا جیسے وہ خود ہی گر پڑا ہو۔ اسے یقین تھا کہ وہ چیخا تھا، ارے کوئی دیکھو نیک بخت کو لیکن خود اس کے علاوہ اور کسی نے اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس نے جو دیکھا تھا اس پر یقین نہیں کر پایا تھا۔ اپنے قد کی اونچائی سے وہ کھڑکی کے بالائی حصے سے اندر بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے بہو کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ شاید بالٹی کی سمت ہی آ رہی تھی۔ اس نے ساس کو گرا دیکھا تو ٹھٹکی اور پھر الٹے قدموں بے آواز واپس ہو گئی۔ یہ بہت حیرت کی بات تھی کیوں کہ اس چھوٹے سے گھر میں تو افراد ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی نیک بخت نے بھی گردن گھما کر بہو کو جاتے دیکھ لیا تھا! اس نے بہو کو نہیں پکارا تھا۔ وہیں زمین پر پڑی رہی اور کچھ دیر بعد بدقت اپنے آپ کو اٹھایا۔ واقعی، کیا اس کی آنکھیں دھوکہ دے رہی تھیں، کیا نیک بخت نے بہو سے مدد لینے کے بجائے زمین پر گرے رہنے کو ترجیح دی تھی۔ یہ اس کے گھر کا ماحول تھا؟ اتنا اجنبی، وہ اس سے کیوں کر اتنا بے خبر تھا؟ کیا درخت انسانی رویوں کے بہتر گواہ ہوتے ہیں؟ خاموش ناظر، تمام خامیوں پر نظر رہتی ہے مگر منہ کچھ نہیں کہتے۔ بے بسی سے اس کے آنسو نکلے بھی ہوں گے تو کہیں چھال میں ہی جذب

ہو گئے ہوں گے۔

چیز کا حال اس کے ماضی کا آئنہ ہوتا ہے۔ اس درخت کے موجود کا اس کے ماضی سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ کاش اس کے ماضی و حال باہم کوئی ربط پیدا کر سکتے۔ لیکن وہ تو دو مختلف زبانیں بول رہے تھے، حال ماضی سے بے خبر تھا، اور ماضی آئندہ کے ممکنات و حادثات سے بے پرواہ۔ اب وہ بڑا بیٹا اپنی تنخواہ سے زیادہ آمدنی لاکر بیوی کے ہاتھ پر رکھتا تو درخت کی سرسراہٹ بڑھ جاتی، لگتا جیسے کوئی شاخ بڑھ کر اس تجاوز کو روک دے گی۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

پت جھڑ کا موسم بہت دشوار ہوتا۔ اس کے تن کے سارے پتے جھڑ جاتے۔ نیک بخت انھیں پیار سے سمیٹتی، تھیلے میں جمع کر دیتی۔ ایک بار بہو نے اسے جمع کیے ہوئے پتے دفناتے دیکھا تو رات ایک خوف زدہ سرگوشی میں شوہر سے بولی، اماں کا توازن جا رہا ہے۔

ایک بار اماں پتے سمیٹتے ہوئے ان پر پھسل کر گریں تو طے ہو گیا کہ اب وہ پتے جمع نہیں کریں گی۔ بیٹے کی آواز میں ایسی قطعیت تھی کہ انھیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔ بیٹے نے کچھ دن تو پتے اکٹھے کیے، مگر نوکری کے بعد آکر پتے اکٹھے کرنا بہت دشوار تھا۔

یہ بے ثمر کا درخت ہمارے کس کام کا ہے، میں نے طے کر لیا ہے کہ اسے کٹوا دیں، اس نے اعلان کیا۔

نہیں، میں اسے نہیں کٹنے دوں گی، اب ان کی آواز میں ایسا استحکام تھا کہ بچے چونک اٹھے۔

نہیں اماں، میں بھائی کو اسے نہیں کٹوانے دوں گا۔ میں اٹھا لیا کروں گا پتے، چھوٹے بیٹے نے ماں کا زرد چہرا دیکھ کر اسے لپٹا لیا۔ ماں کے لہجے کی شدت تو وہ بھی نہیں سمجھ سکا تھا، لیکن اس شدت سے وہ ڈر گیا تھا، اس نے اسے خبردار کر دیا تھا۔ باہر درخت سر اٹھائے اس تمام ماجرے کو دیکھ رہا تھا، بن رہا تھا، کوئی اس سے بھی پوچھ لے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ یوں درخت کٹنے سے تو بچ گیا، مگر اب سردی سے بچاؤ کے لیے انھوں نے اس کی نچلی شاخیں کاٹ لی تھیں۔ اماں کو اس وقت ادراک ہوا جب وہ سوکھی ٹہنیاں اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ وہ بے تابانہ باہر گئیں اور تنے کے گرد ایک کمبل لپیٹ دیا۔

بالکل سٹھیا گئی ہیں بے چاری، گھر کے اندر سے بہو کی تیز سرگوشی سنائی دی۔

درخت نے ایک جھرجھری لی، اب بنا پتوں کے اس میں کوئی سرسراہٹ بھی پیدا نہیں ہوئی۔ پتے گرنے کے بعد سے تو پرندوں نے بھی اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ صبح کے سورج نے شب کی مسافت ختم کی اور اپنے مقررہ استھان کی جانب بلند ہونے لگا۔ ستارے تیزی سے چھپنے لگے، لیکن اس تیزی میں بھی ذرا دیر کو ٹھٹک گئے۔

ایک چھوٹے سے مکان کے باہر ایک بڑا سا درخت اپنی جڑ سے اکھڑ کے زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ کچا ہوا تھا، صرف اوپر ہی چند بنا پتوں کی شاخیں باقی تھیں۔

اب اس درخت کو ہٹوانے میں مزید خرچہ آئے گا، بڑے بیٹے کی بڑبڑاہٹ میں درخت گرنے کا کوئی تاسف نہیں تھا۔

☆☆☆☆

نجمہ عثمان (لندن؛ برطانیہ)

زخمی پھول

بے موسم کی بارش مسلسل برسے جا رہی ہے۔ مارچ کا مہینہ تو بہار کی آمد کا مژدہ سناتا ہے لیکن اس سال فروری نسبتاً خشک اور گرم رہا اور مارچ اپریل میں کھلنے والے پھول جلدی کھل گئے۔ لیکن اس مسلسل بارش نے اوائل بہار میں کھلے ہوئے نرگس اور لالے کے پھولوں کو کس بیدردی سے بھگو بھگو کر بکھیر کر رکھ دیا ہے۔

میں ہمیشہ تجسس میں رہتا ہوں ان پھولوں کے بارے میں جو ٹھنڈی برفیلی زمین سے نمو پا کر کھلتے ہیں۔ کہر آلود صبحوں میں ٹھٹھرتے ہوئے پتوں کے بیچ میں سے ڈھیرے ڈھیرے یوں سر ابھارتے ہیں۔۔ یوں رنگوں کی قوس وقزح بکھیرتے ہیں جیسے سردی کے موسم میں الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے کانپتے ہوئے جسموں کے چہروں پر ہولے ہولے آگ کی تپش سے سرخی سی بکھر جائے۔ پھولوں کے بارے میں یہ تجسس کب سے ہے یاد نہیں۔ البتہ پھولوں کے مختلف رنگوں کے حوالے سے تمہارا خوبصورت چہرہ ایک عرصے تک مجھے محصور کیے رہا۔ گہرے گلابی اور سرخ پھول اس زمانے کی یاد دلاتے ہیں جب تم خوشی سے تمتمایا چہرہ لیے خوشبوئیں بکھیرتی میرے اردگرد رہا کرتی تھیں۔

اس شام دو اتفاقات ساتھ ساتھ نہ ہوتے تو شاید میرا تم سے اچانک یوں ملنا نہ ہوتا۔ آکسفورڈ اسٹریٹ کی پچھلی گلی میں ایک کلائنٹ سے چار بجے ملنا تھا جلدی فراغت ہوئی تو سوچا 'جان لوئیس' کا چکر لگا لوں۔ رفیعہ کے لیے پرفیوم خریدنی تھی۔ اسٹور تک پہنچتے پہنچتے موسلا دھار بارش نے آلیا۔ اندر گھسا تو سامنے ہی تم کھڑی نظر آئیں۔ اپنے چہرے اور بالوں کو رومال سے صاف کر رہی تھیں۔ بہت سے لوگ بارش سے بچنے کے لیے اسٹور میں آگئے تھے اور وقت گزاری کے لیے گراؤنڈ فلور کے مختلف حصوں میں پھیل گئے تھے۔

تم سے بچھڑے اتنا عرصہ بیت گیا تھا۔ دس یا شاید بارہ برس۔۔ کہ اب تم سے ملنے کے امکان کے بارے میں سوچنا بیکار سا لگتا تھا۔ ملنا اور بچھڑنا تو مقدر کی بات ہے اور بچھڑنے کے بعد ملنے کی خواہش شاید اپنی موت آپ مرگئی تھی۔ تمہیں دیکھا تو دل میں کسی پرانے درد نے جاگ کر انگڑائی لی۔ نہ چوٹ لگی نہ کسک اٹھی مگر ایک ان جانی سی بے چینی رگ و جاں میں پھیل گئی۔ مجھے لگتا تھا کہ ساری دنیا میں میرے سوا کوئی تمہیں اتنا نہیں چاہ سکتا۔

کیسی انوکھی چاہت تھی۔۔ کیسی محبت تھی۔۔۔ میں ہر گھڑی تمہارے ساتھ۔۔ تمہارے سامنے رہتے

ہوئے بھی تشنگی محسوس کرتا تھا۔بچپن سے جوانی کی سرحدوں کو چھونے تک ہم ایک جان دو قالب رہے۔گھر میں سب چھیڑتے تھے ۔۔فراز کی شادی شنا سے کردیں۔ہر وقت دونوں ساتھ رہتے ہیں اور یہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ ہمارے خاندان کے بزرگوں نے ہماری نسبت کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔ابو اور تایا اس فیصلے پر بہت مطمئن تھے۔میری اس چاہت اور دیوانگی کا تم نے ہمیشہ مذاق اڑایا۔جہاں میں نے ذرا سا رومانٹک ہونے کی کوشش کی وہیں تم نے لا ابالی پن سے ہنسنا شروع کر دیا۔میں چڑ کر کہتا 'پلیز شنا! کبھی تو سیریس ہو جایا کرو'۔تم خوش دلی سے جواب دیتیں 'جناب آپ بھی تو یہ بچوں جیسی باتیں نہ کیا کریں'۔تمھیں شاید ان جذبوں کی صداقت کی پہچان تھی جو میری خاموشی اور آنکھیں کہہ دیا کرتی تھیں۔لیکن اس پہچان کا تم نے کبھی اعتراف نہیں کیا۔ہم اچھے دوستوں کی طرح گھنٹوں باتیں کرتے۔ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے رشتے ناطوں کی ان گنت گتھیاں تھیں جنھیں سلجھانے کا نہ ہمیں شعور تھا نہ احساس۔تم پڑھائی میں بہت تیز تھیں اور بی اے آنرز تک پہنچ گئیں۔۔میری ہر پڑھائی کی کتاب میں اور حروف کی جگہ تمھارا نام لکھا نظر آتا تھا۔نتیجتاً میں انٹر میں دو بار فیل ہوا تو ابو اور تایا کے چہروں پر سوچ کی لکیریں پھیلتی چلی گئیں۔ان لکیروں میں، میرے اور تمھارے مستقبل کے لیے جگہ جگہ سوالیہ نشان تھے۔

میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ رہا کہ جہاں میں تمھارے سامنے بڑھ چڑھ کے اپنی محبت کا اعتراف کرتا رہا وہیں ابو اور تایا کے آگے میری زبان پر تالے لگ جاتے۔ان ہی دنوں تمھارے لیے رشتوں کی لائن سی لگ گئی۔کنبے والے، ملنے جلنے والے اپنے اپنے ہونہار کماؤ پوت، تایا کی فرزندی کے لیے پیش کرنے لگے۔اس دن بھی ایک نیا رشتہ آیا تھا اور لڑکا امریکہ میں ڈاکٹر تھا۔تم مجھ سے پوچھنے لگیں۔

'کیا خیال ہے فراز! امریکہ چلی جاؤں؟'۔میں تڑپ اٹھا۔

'کیا واقعی تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔۔اور میری محبت۔۔۔؟'میں جملہ پورا نہ کر سکا۔گلے میں جیسے کچھ اٹکنے لگا۔

'تو تم مجھے روک لو۔۔۔نہیں جاؤں گی'۔تم رسانیت سے مسکرا کر بولیں۔

میرے اختیار میں کیا تھا سوائے لفظوں کے گٹھ جوڑ کے۔اور میرے یوں جذباتی ہونے پر تم اپنے ہلکے پھلکے موڈ میں آ گئیں۔

'بس دیکھ لی تمھاری چاہت۔۔تمھارے سامنے ہی سب کچھ ہو گا۔اور تم مزے سے تماشا دیکھو گے کیونکہ تم صرف لفظوں کے بادشاہ ہو۔اور لفظ صرف جذبوں کو تسکین دے سکتے ہیں'۔

'لفظ سچے جذبات کا اظہار بھی تو ہیں'۔میں الجھنے لگا۔

'مگر میرا اور تمھارا مستقبل تو نہیں سنوار سکتے'۔تم نے یہ کہہ کر میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں واقعی لفظوں کے گٹھ جوڑ میں مصروف رہا اور تایا کے اچانک ہارٹ فیل نے ہم دونوں کے مستقبل کے دروازے پر ایک ایسے فیصلے کی صلیب گاڑ دی جس پر ہم دونوں کے ارمانوں کا خون جما ہوا تھا۔

تم شادی کر کے امریکہ چلی گئیں۔جاتے جاتے بھی تمھاری خوش دلی اسی طرح قائم تھی۔اندر سے تم کتنی اداس تھیں میں اس کا اندازہ نہیں لگا سکا۔میں یہ بھی فیصلہ نہیں کر سکا کہ اتنے برسوں میں۔۔تم میری محبت اور چاہت کو کتنا سمجھ پائی تھیں۔میں تو بس دیوانہ وار تمھیں اپنی اٹوٹ محبت کا یقین دلاتا رہا۔۔شاید میں نے خودکشی کی بھی دھمکی دی تھی۔

اس دن تمھاری آنکھوں میں اداسی تھی۔۔کہ شکایت تھی۔۔۔یا صرف آنے والی جدائی کا کرب۔۔۔ تمھاری آنکھوں کا رنگ ان تمام جذبات سے گھل مل کے عجیب سا ہو گیا تھا۔۔اور ان میں نمی اور سرخی کا انوکھا حسین امتزاج تھا۔

تم سے بچھڑے ہوئے اتنے برس بیت گئے۔میں نے خودکشی تو نہیں کی۔دل لگا کر پڑھا۔تمھارے عشق کو بھلانے کے لیے ایک اور عشق کر بیٹھا۔رفیعہ سے محبت اور شادی جلدی جلدی ہوئے۔ میں دوبئی چلا آیا۔۔اچھی نوکری۔۔خوبصورت بیوی۔۔دو پیارے پیارے بچے۔میرا مستقبل تابناک ہی تابناک تھا۔بزنس کے سلسلے میں امریکہ اور لندن کا چکر بھی لگتا تھا۔اس دفعہ خاص طور سے رفیعہ اور بچوں کو لے کر لندن آیا تھا تا کہ گھومنا پھرنا اور شاپنگ ہو سکے۔

تم سے اچانک اس طرح ملاقات ہو گی۔میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھا۔اب جان لوئیس کے گراؤنڈ فلور پر تمھیں سامنے پایا۔تم اپنے چہرے سے پانی پونچھ رہی تھیں۔مجھے لگا جیسے یادوں کی حسین تصویر پر سے برسوں کی پڑی ہوئی گرد صاف ہو رہی ہو۔تم نے مجھے دیکھ لیا تھا۔مسکرا کر آگے بڑھیں۔

'فراز!یہاں کہاں؟ کیسے ہو۔۔بیوی بچے کہاں ہیں؟'۔تم نے ایک ہی سانس میں سوال کر ڈالے۔

میں نے بتایا۔کام کے سلسلے میں آیا ہوں اور فیملی بھی ساتھ ہے۔ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے مین انٹرنس کے سامنے آ گئے۔

مجھے خیال آیا تمھارے بارے میں بھی تو پوچھوں۔کیونکہ تمھاری شادی کے بعد میں تمھاری طرف سے بالکل انجان بن گیا تھا۔کوئی تمھارا ذکر بھی کرتا تو میں کان بند کر لیتا تھا۔اب میں بڑے مہذب طریقے سے تمھارا حال احوال پوچھ رہا تھا۔

'اور سناؤ ثنا! تمھارے ڈاکٹر صاحب کا کیا حال ہے۔ بچے کتنے ہیں؟'

تمھارے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔'سب اچھے ہیں۔۔ٹھیک ہیں۔۔ہم آج کل لندن آئے ہوئے ہیں۔ان کو کسی کانفرنس میں شرکت کرنی ہے۔

ایک ہفتے میں واپس چلے جائیں گے'۔

مجھے لگا تم اپنے بارے میں تفصیل بتانے سے ہچکچا رہی ہو۔میں نے تمھارے چہرے کو غور سے دیکھا۔وہ چہرہ۔۔۔وہ آنکھیں۔۔جنھیں میں دیوانہ وار چاہتا تھا۔

گزرے ہوئے وقت کی سنگین چھاپ سے کتنے بدل گئے تھے۔چہرے کی رنگت جل گئی تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔وہ سرخ گلاب جیسا چہرہ حالات کی تپتی دھوپ میں کملا کر رہ گیا تھا۔آج جب میں تیار ہو کر نکل رہا تھا تو رفیعہ نے میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا تھا'اس کالے سوٹ میں تم کتنے ہینڈسم اور ینگ لگ رہے ہو بچ کے رہنا کسی میم کی نظر نہ لگ جائے'۔میں نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تھا۔اور اترا سا گیا تھا۔

پھر تمھارے روشن مستقبل کو کس کی نظر لگ گئی۔مجھے اچانک محسوس ہوا تم دکھی ہو۔بے حد دکھی۔۔۔

'تم۔۔تم خوش ہو نا!! اپنی زندگی میں۔۔۔۔۔؟'میں نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

'مطمئن ہونے کی حد تک خوش'۔تمھارا مختصر جواب مجھے اور وسوسوں میں مبتلا کر گیا۔

تم مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔'اور تم؟ مجھے تو خوش ہی نظر آ رہے ہو۔دیکھ لو۔خود کشی نہیں کی تو فائدے ہی میں رہے۔۔'

مجھے اپنی دیوانگی۔۔محبت۔۔خودکشی کی دھمکی۔۔سب باتیں یاد آنے لگیں۔

'بس زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔سو گزار رہا ہوں۔۔'مجھے خود اپنے کہے ہوئے الفاظ پر یقین نہیں آ رہا تھا'بیوی۔۔بچے۔۔نوکری۔سب کچھ ہے۔۔پھر بھی زندگی گھٹ رہی ہے۔۔میں نے خودکشی تو نہیں کی مگر خوشی کے ہر جذبے کا وقت سے پہلے ہی گلا گھونٹ دیا۔تمھارے بغیر۔

ثنا! یہ زندگی۔۔زندگی نہیں رہی۔۔۔سب بیکار ہے'میں اپنی جذباتی تقریر پر خود بھی حیران تھا۔

تمھاری آنکھوں میں اچانک وحشت سی عود کر آئی۔۔اور تم لڑکھڑا کر گرنے سی لگیں۔۔میں نے سہارے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔تو تم نے قریبی دیوار کے ساتھ ٹکتے ہوئے مجھے اشارے سے منع کر دیا۔

'تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔چلو میں تمھیں تمھارے گھر چھوڑ دوں'۔

'نو۔۔نو۔۔۔نو۔۔!'تم اتنی زور سے چلائیں کہ آس پاس کے لوگ مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔

'کیا بات ہے ثنا؟ اپنے آپ کو سنبھالو'۔میں اور زیادہ پریشان ہو گیا۔

'سوری فراز!' تم نے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔' آئی ایم سوسوری۔۔مجھ سے وعدہ کرو تم نہ تو میرے گھر آؤ گے اور نہ مجھ سے
ملنے کی کوشش کرو گے۔'

'مگر کیوں؟' میں اب بھی حیران تھا۔' آخر میں تمھارا کزن ہوں۔رشتہ دار ہوں۔'

'او میرے خدا! میں تمھیں کیسے سمجھاؤں' تم نے باہر نظر ڈالی۔بارش اب بھی تواتر سے ہو رہی تھی۔

'اگر تم جلدی میں نہیں ہو تو یہاں کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔مجھ سے اب کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔'

ہم جان لوئیس کے ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھ گئے۔میں چائے لے آیا۔تم چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ پیتی رہیں اور میں تمھیں دیکھتا رہا۔ہم چائے پر کتنا شور مچاتے تھے۔بے سرو پا باتیں۔لڑائی جھگڑے۔۔روٹھنا۔منانا۔چائے کی پیالی سے اٹھتی ہوئی بھاپ میں یادیں ہلکورے لینے لگیں۔

پھر تم نے خاموشی کا قفل توڑا۔' ڈاکٹر رفیق بہت اچھے انسان ہیں۔لیکن ان کی شخصیت کے دو رخ ہیں۔۔شادی کے شروع کے تین سالوں میں ان کی زندگی کا اچھا رخ دیکھا۔نیک۔۔پرخلوص بے انتہا considerate۔انھوں نے مجھے اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔امریکہ میں ان کے کئی ناکام معاشقے رہے۔ایک لڑکی سے تو منگنی تک ہوگئی تھی لیکن کسی وجہ سے ٹوٹ گئی۔کیا وجہ تھی نہ انھوں نے بتایا نہ میں نے پوچھا۔میں بھی تو بچپن سے تمھاری مانگ تھی اور گھر والوں نے انھیں سب کچھ بتا دیا تھا۔میں نے بھی اپنی زندگی کی سچی کہانی انھیں سنادی۔ہماری بچپن کی انسیت۔تم پڑھ لکھ جاتے ابا جان کا یوں اچانک انتقال نہ ہوتا تو ہماری شادی ہو جاتی۔اس وقت رفیق مجھے بہت liberal آدمی لگے۔کبھی تمھارا ذکر ہوتا تو چھیڑتے۔' نہ جانے فراز صاحب کا کیا حال ہوگا۔'

'اور ان کی شخصیت کا دوسرا پہلو؟' میری بے چینی میرے سوال میں مترشح تھی۔

تم جواب دینے کے بجائے مجھ سے پوچھنے لگیں۔' فراز! تمھیں فجو ماما کا بڑا لڑکا شاہد تو یاد ہوگا؟'

'ہاں۔وہ اچکا سا بدتمیز لونڈا۔۔جس نے خاندان کی ہر لڑکی کو چھیڑنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔بس تم سے بہت ڈرتا تھا'۔

'وہ۔امریکہ گرین کارڈ کے چکر میں آیا تھا۔کاش وہ ہمارے گھر نہ آتا۔اس نے رفیق سے میرے اور تمھارے لیے ایسی ایسی من گھڑت باتیں کہیں کہ انھیں دہراتے ہوئے بھی مجھے گھن اور شرم آتی ہے۔وہ چند روز رہا اور ہماری زندگی میں زہر گھول کے چلا گیا۔۔پھر۔۔۔میں نے رفیق کی شخصیت کا دوسرا اور بھیانک روپ دیکھا۔شک۔۔حسد۔۔اور جلن یکجا ہو جائیں تو انسان کے سوچنے کی صلاحتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔۔۔

'سوری فراز!' تم نے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔' آئی ایم سو سوری۔۔ مجھ سے وعدہ کرو تم نہ تو میرے گھر آؤ گے اور نہ مجھ سے
ملنے کی کوشش کرو گے۔'

'مگر کیوں؟' میں اب بھی حیران تھا۔' آخر میں تمھارا کزن ہوں۔ رشتہ دار ہوں۔'

'او میرے خدا! میں تمھیں کیسے سمجھاؤں' تم نے باہر نظر ڈالی۔ بارش اب بھی تواتر سے ہو رہی تھی۔

'اگر تم جلدی میں نہیں ہو تو یہاں کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ مجھ سے اب کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔'

ہم جان لوئیس کے ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں چائے لے آیا۔ تم چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ پیتی رہیں اور میں تمھیں دیکھتا رہا۔ ہم چائے پر کتنا شور مچاتے تھے۔ بے سرو پا باتیں۔ لڑائی جھگڑے۔۔ روٹھنا۔ منانا۔ چائے کی پیالی سے اٹھتی ہوئی بھاپ میں یادیں ہلکورے لینے لگیں۔

پھر تم نے خاموشی کا قفل توڑا۔' ڈاکٹر رفیق بہت اچھے انسان ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت کے دو رخ ہیں۔۔ شادی کے شروع کے تین سالوں میں ان کی زندگی کا اچھا رخ دیکھا۔ نیک۔۔ پرخلوص بے انتہا considerate۔ انھوں نے مجھے اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ امریکہ میں ان کے کئی ناکام معاشقے رہے۔ ایک لڑکی سے تو منگنی تک ہوگئی تھی لیکن کسی وجہ سے ٹوٹ گئی۔ کیا وجہ تھی نہ انھوں نے بتایا نہ میں نے پوچھا۔ میں بھی تو بچپن سے تمھاری مانگ تھی اور گھر والوں نے انھیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں نے بھی اپنی زندگی کی سچی کہانی انھیں سنادی۔ ہماری بچپن کی انسیت۔ تم پڑھ لکھ جاتے ابا جان کا یوں اچانک انتقال نہ ہوتا تو ہماری شادی ہو جاتی۔ اس وقت رفیق مجھے بہت liberal آدمی لگے۔ کبھی تمھارا ذکر ہوتا تو چھیڑتے۔' نہ جانے فراز صاحب کا کیا حال ہوگا۔'

'اور ان کی شخصیت کا دوسرا پہلو؟' میری بے چینی میرے سوال میں مترشح تھی۔

تم جواب دینے کے بجائے مجھ سے پوچھنے لگیں۔' فراز! تمھیں فجو ماما کا بڑا لڑکا شاہد تو یاد ہوگا؟'

'ہاں۔ وہ اچکا سا بدتمیز لونڈا۔۔ جس نے خاندان کی ہر لڑکی کو چھیڑنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ بس تم سے بہت ڈرتا تھا۔'

'وہ۔ امریکہ گرین کارڈ کے چکر میں آیا تھا۔ کاش وہ ہمارے گھر نہ آتا۔ اس نے رفیق سے میرے اور تمھارے لیے ایسی ایسی من گھڑت باتیں کہیں کہ انھیں دہراتے ہوئے بھی مجھے گھن اور شرم آتی ہے۔ وہ چند روز رہا اور ہماری زندگی میں زہر گھول کے چلا گیا۔۔ پھر۔۔۔ میں نے رفیق کی شخصیت کا دوسرا اور بھیانک روپ دیکھا۔ شک۔۔ حسد۔۔ اور جلن یکجا ہو جائیں تو انسان کے سوچنے کی صلاحتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔۔۔

اس روز انھوں نے بے تحاشہ شراب پی رکھی تھی حالانکہ وہ صرف پارٹی وغیرہ میں ڈرنک کرتے ہیں۔ وہ شاہد کی کہی ہوئی باتیں دہراتے رہے۔ میں کبھی ہنس کر۔۔ کبھی غصے سے ان باتوں کو ٹالتی رہی۔ پھر اچانک ان پر جنون کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اور۔۔اور۔۔۔' تم نے بات ادھوری چھوڑ کر اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

'اس نے تم پر ہاتھ اٹھایا؟۔۔' میں ساری جان سے لرز اٹھا۔

'میں تو پہلے ہی ادھ موئی ہو چکی تھی۔ الفاظ کے برچھے۔۔الزامات کے تیر میرے ذہن و دل اور جسم کو چھلنی کر چکے تھے۔ میں اب سوچتی ہوں۔ کاش! اس دن وہ میرا گلا گھونٹ دیتے۔ لیکن موت کا خوف انسان کو بہت کمزور اور ڈرپوک بنا دیتا ہے۔۔ میری آنکھیں حلقوں سے نکلی پڑ رہی تھیں۔

ان کے ہر الزام کے جواب پر "نہیں۔ نہیں" کے بجائے "ہاں۔ ہاں" نکلنے لگا۔۔ وہ رات میری زندگی کی سیاہ ترین رات تھی۔ میں نے زخموں سے چور بدن کو گھسیٹا اور بھاگ کر نخی بچی کے کمرے میں پناہ لی۔ وہ شاید اس کا بھی گلا گھونٹ دیتے اگر میں اندر سے دروازہ لاک نہ کر لیتی۔'

میں غصے سے کانپنے لگا۔' تم پر اتنی قیامت گزر گئی اور تم نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔۔ چلو میرے ساتھ ۔۔ابھی لے چلو۔ اس ڈاکٹر کے پاس۔'

میں کھڑا ہو گیا۔

'پھر وہی جذباتیت۔۔ بچوں والی باتیں۔۔۔ بیٹھ جاؤ فراز۔' تم اب خاصی نارمل نظر آ رہی تھیں۔

'رفیق کی لغت میں محبت کے ہر جذبے کی ابتدا جسمانی تشنگی سے شروع ہوتی ہے اور اس کا اختتام جسمانی آسودگی پر ہوتا ہے۔ روحانی جذبے، پاک محبت ان کے نزدیک بے معنی الفاظ ہیں کیونکہ ان کا اپنا مشاہدہ اور تجربہ کچھ اور کہتا ہے۔ ہم جسے وحشت اور بربریت کا نام دیتے ہیں وہ ان کے نزدیک زندگی کا فطری تقاضہ ہے۔'

'محبت کی اتنی تذلیل۔۔ ایسا گھناؤنا الزام۔۔۔' میں تڑپ کر رہ گیا۔' شاید سب تم نے کیوں برداشت کیا؟ اور تمھاری بیٹی؟'۔

'فرح بہت پیاری بچی ہے۔ مغربی ممالک میں طلاق یافتہ ایشین عورت اور ایک بچی کی ماں کو سو طرح کے مسئلے ہیں۔ تنہا زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔ پھر فرح کے مستقبل کا بھی سوال ہے۔'

'کیا اب بھی مار پیٹ کرتا ہے؟' میرے ہونٹوں پر یہ سوال دیر سے مچل رہا تھا۔

'اس سیاہ رات کے بعد انھوں نے کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ میں نے طلاق نہیں لی لیکن ان کو اپنی دنیا سے بے دخل ضرور کر دیا۔ ہمارے درمیان ایک سرد جنگ جاری ہے۔ ایک خاموش سمجھوتہ ہے۔ وہ اپنے

ہوسپٹل، مریضوں اور کلب کی دنیا میں مگن رہتے ہیں اور میری توجہ کا مرکز فرح ہے۔'
تم بولتے بولتے رک گئیں۔

'ارے فراز! تم رو رہے ہو؟ مرد ہو کر۔۔؟ مرے ہوؤں کا ماتم کرتے ہیں ابھی تو میں زندہ ہوں۔۔'
اچانک تمہارے لہجے میں تلخی آ گئی 'یہی تو میری زندگی کا المیہ ہے۔تم نے اپنی بزدلی اور کمزوری کا یوں مظاہرہ کیا کہ مجھے اور میری محبت کو کسی اور کے حوالے کر دیا۔رفیق کی بزدلی کی انتہا یہ ہے کہ ایک بے بس اور کمزور عورت کو جبر و تشدد کی اس منزل تک پہنچا دیا جہاں سچ بھی خوف زدہ ہو کر جھوٹ بن جاتا ہے۔۔تم دو بزدلوں کے بیچ میری بے لوث اور سچی محبت کا دم گھٹ گیا۔

اور تم اب بھی میرے ساتھ جانا چاہتے ہو۔

تم نے اسٹور سے باہر نظر دوڑائی 'دیکھو۔۔! کتنی موسلا دھار بارش ہوئی تھی۔گہرے بادل آئے جی کھول کر برسے اور نہ جانے کس سمت اڑ گئے۔

تم نے جان لوئیس سے باہر نکل کر اپنی چھتری کھول لی۔بارش اب ہلکی ہو چلی تھی۔
'مجھے اب گھر جانا چاہیے۔سب انتظار کر رہے ہوں گے۔اب تم بھی جاؤ۔'
تم تیزی سے آگے بڑھیں اور بہتے ہوئے لوگوں کے ہجوم میں کھو گئیں۔

میں تیز بارش کے شور میں اپنے اندر کے شور کو دبانے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔آج مجھے معلوم ہوا۔تمہارے دل میں میرے لیے محبت کا جذبہ کتنا گہرا تھا۔اور میں نے اس جذبے کو خود بھی مجروح کیا اور دوسرے بھی اسے لہولہان کرتے رہے۔۔ہم دونوں کے پیار کی پیمائش کو میں نے خود پر شروع کیا اور خود پر ہی ختم کر دیا۔اور اس پیمائش کے جھوٹ سچ کے میزان پر صرف تمہاری محبت تولی گئی اور جانتے بوجھتے ہوئے جھوٹ کے بھاری وزن کے نیچے کچلی گئی۔۔۔کیا یہ سب باتیں میں رفیعہ کو بتا سکوں گا۔۔؟ کیا میں تمہاری طرح سچ بولنے کی ہمت رکھتا ہوں۔؟

میری بزدلی کا المیہ تو یہ ہے کہ جب میں واقعی محبت کے جذبوں میں محصور تمہارا دیوانہ تھا تو تم میرے سچ کو جھوٹ سمجھتی رہیں۔۔اور آج نہ جانے کس جذبے کے تحت میں نے تم سے جھوٹ کہا اور تم نے اسے سچ سمجھ لیا۔

بارش تیز ہو چلی ہے۔نرگس اور لالے کے پھولوں کی نرم و نازک پتیاں بھیگی ہوئی زمین پر بکھری پڑی ہیں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر مجاہد مرزا (ماسکو: روس)

افسانے ہی رہ گئے ہیں کہنے کو

اس کی بیوی سامنے ہی فرش پر بچھے گدے پر لیٹی لحاف کے اندر کسمسا رہی تھی اور وہ کچھ دور دور پلنگ پر ٹیک لگائے، ٹیبل لیمپ کی روشنی میں ادق سی کتاب پڑھتے، باوجود اس کی قربت پانے کی اپنی خواہش پر، اس کی کل کی تلملاہٹ کو یاد کر کے، جب اس نے اسے اپنے قریب ہونے کا مدرجہ برامناتے ہوئے چلانا شروع کر دیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے اس کے من میں بھی اس کے قریب آنے کی خواہش کلبلا رہی ہو۔ تبھی کسمسا رہی ہے لیکن وہ چند منٹ بعد ساکت ہو گئی تھی اور اس کی لمبی سانسیں بتا رہی تھیں کہ وہ تو واقعی سو گئی۔

اگر اس کی زندگی گزارنے کا عام سا سچ بھی کسی کو بتا دیا جاتا اور اسے پتا چل جاتا جو وہ اپنی عادت کے تحت اسے عام سی بات سمجھ کے خود ہی بتا دیا کرتا تو وہ اسے دروغ گو کہتی اور اسے اپنی توہین خیال کرتی، چیخ چیخ کے کہتی، میں آپ سے نفرت کرتی ہوں۔ کس قدر نفرت کرتی ہوں، اس کا آپ کو اندازہ ہی نہیں۔ جب وہ کہتا کہ بھئی یہ کوئی ایسی بات ہی نہیں جس پر یخ پا ہوا جائے، پرسکون ہو جاؤ تو وہ اسی لہجے اور اسی اونچی آواز میں کہتی کہ جب تک آپ یہاں ہیں کوئی سکون ہو ہی نہیں سکتا۔ بچے بھی یہی کہتے ہیں کہ جب پاپا نہیں ہوتے آپ کا ہم سے سلوک اچھا ہوتا ہے۔ پاپا آتے ہیں تو آپ ہمیں ڈانٹنے اور پیٹنے لگتی ہیں۔ اس لیے کہ آپ اپنے رویوں سے میرا دماغ خراب کر دیتے ہیں۔ وہ حیران ہوتا کہ کیا اس کا ہی دماغ خراب ہوتا ہے؟ کیا دوسروں پر اس کے یک دم بدل جانے والے رویے کا اثر نہیں ہوتا؟ وہ اپنی کہے جاتی دوسرے کی سنتی تک نہ۔ اس کی نفسیات کا کوئی معاملہ تھا جس کے سبب اسے حاکمیت کی نہ صرف عادت تھی بلکہ ایسا کرنے کا چسکا تھا۔ ایسا نہیں کہ وہ بچوں سے پیار نہیں کرتی تھی مگر وہ چاہتی تھی کہ بچے فوجیوں کی طرح چاق و چوبند رہیں اور سب کام اسی طرح کریں جیسا وہ چاہتی ہے۔ مگر آخر کار بچوں میں باپ کی عادات کا بھی تو کوئی پرتو منتقل ہونا تھا۔

وہ تینوں اپنی مرضی کے مالک تھے، اگرچہ ماں سے ڈرتے بھی بہت تھے، جو بچے ڈرا کرتے ہیں، وہ لامحالہ جھوٹ بھی بولتے ہیں۔ وہ بچوں کا کہا جھوٹ پہچان لیتی یا پکڑ لیتی جیسے کہ بچی نے کہہ دیا کہ اس نے اپنے سارے کپڑے تہہ کر کے ترتیب سے الماری کے اپنے حصے میں رکھ دیے ہیں، جب کہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ بچوں کے جھوٹ پر اسے بے تحاشا غصہ آتا اور وہ ان کو زبانی اور عملی طور پر رگید کے رکھ دیتی۔

باپ نے بچوں کے نام ان کی عادات کے مطابق رکھ دیے تھے۔ بڑے بچے کا نام تھا، میں بھول گیا

اور بچی کا نام تھا، ابھی۔ میں جانتی ہوں یہ وہ الفاظ تھے جو وہ کثرت سے استعمال کرتے۔ بچہ جو نہ کرنا چاہتا تو وہ بھول گیا تھا کہہ دیتا۔ ظاہر ہے جب نگاہیں موبائل فون پہ انٹرنیٹ استعمال کرنے میں مصروف ہوں گی تو کیا یاد رہے گا۔ بچی کا کہا ابھی جھوٹ ہوتا اور مجھے معلوم ہے غلط اگر اسے معلوم ہوتا تو جو کام کہا تھا یا جو ذمے لگایا گیا تھا اسے ہر روز دس بار یاد نہ کرانا پڑتا۔

چھوٹا تو تھا ہی چھوٹا، اس کا نام تھا، مجھے دو۔ میں چاہتا ہوں۔ ٹی وی چینل اس کی مرضی کا لگا رہے گا۔ بڑے بہن بھائی کچھ اور نہ دیکھیں۔ ایک جانب وہ شوہر کو بچوں کی تربیت نہ کرنے کا الزام دیتی تو دوسری جانب جب وہ بچوں کو کچھ سمجھانا چاہتا تو اسے اعتراض ہوتا کہ آپ اونچا بولتے ہیں۔ اس کے اونچے بولنے کی سزا بھی بیٹے کو ملتی۔ اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے؟ لوٹ جانے کو اس کا جی نہیں چاہتا اور ایسے حالات میں رہنا بھی کیا رہنا جہاں میاں بیوی اجنبی بن جائیں۔ اس نے اس کے کینے کو کم کرنے کی خاطر، اس سے کئی بار بات کرنے کی کوشش کی مگر اس کی رٹ یہی ہوتی کہ مجھے کچھ نہیں سننا۔ میرا کام کھانا پکا دینا ہے بس، اس کے علاوہ مجھ سے کوئی امید مت رکھیں۔ کھانا ہو تو نکالیں، گرم کریں اور کھالیں۔ امید نہ رکھنے کی بات تب کہی جب اس نے کہا کہ میرا ایک بٹن تو شاید مضبوط کر دیا مگر یہ ایک بٹن جھول رہا ہے۔ امید نہ رکھنے کا کہہ کر ساتھ ہی کہا یہ پڑے میں سوئیاں دھاگے۔ اس نے کہا کمینگی کی بھی حد ہوتی ہے، کون ہے کمینہ، گریبان میں جھانک لیں، جب اس نے یہ سنا تو فوراً نماز کی نیت باندھ لی۔ نماز پڑھتے سوچا کیا کہ اب افسانے ہی رہ گئے سنانے کو۔

☆☆☆☆

پروفیسر اسلم جمشید پوری (میرٹھ؛ بھارت)

اس کا پیار

یہ میرا لکھنؤ آنے کا تقریباً چوتھا یا پانچواں موقع تھا۔ میرٹھ سے چلنے والی نوچندی ایکسپریس علی الصبح پانچ بیس پر لکھنؤ پہنچ جاتی ہے۔ ویسے تو اس گاڑی کو لیٹ ہونے میں مہارت حاصل ہے۔ کبھی بھی نہ تو الٰہ آباد نہ میرٹھ وقت پر پہنچتی ہے۔ ہمیشہ دو تین گھنٹے لیٹ ہونا اس کی عادت میں شامل ہے۔ لیکن میرٹھ سے چل کر صبح جب یہ لکھنؤ پہنچتی ہے تو اکثر وقت پر پہنچتی ہے اور کبھی بار وقت سے بھی پہلے پہنچ کر مسافروں کو چونکا دیتی ہے۔ آج بھی نوچندی ایکسپریس سوا پانچ بجے پلیٹ فارم نمبر 1 پر پہنچ گئی تھی۔ یہاں تقریباً آدھا گھنٹے رکتی ہے مسافر اطمینان سے اتر جاتے ہیں۔ کمپارٹمنٹ میں ٹل چل اور گہما گہمی ہوئی تو میری آنکھ بھی کھل گئی۔ اوپری برتھ سے میں نیچے آیا جوتے تلاش کیے، جلدی جلدی موزے اور جوتے پہنے۔ اکلوتا چھوٹا بیگ اٹھایا، پانی کی بوتل بیگ میں رکھی اور باہر جانے والے راستے کی طرف چل پڑا۔ اب بھی کچھ مسافر سو رہے تھے اور کچھ اونگھ رہے تھے۔ نیند کا خمار پورے ڈبے پر طاری تھا۔ میں جب پلیٹ فارم پر اترا تو پلیٹ فارم پر روشنی کچھ کم سی دکھائی دی۔ ایسا لگ رہا تھا گویا پلیٹ فارم بھی گہری نیند کے نشے میں تھا۔

فروری کا مہینہ تھا، ٹھنڈ ابھی باقی تھی۔ میں نے ہلکا سوئیٹر اور اس پر ہن رکھا تھا۔ اسٹیشن کے باہر ٹھنڈ کے جھونکوں نے جب سلام کیا تو میں نے بیگ سے شال نکال کر اوڑھتے ہوئے ان کا جواب دیا۔ دراصل میں جب بھی لکھنؤ آتا ہوں تو زیادہ تر اپنے دوست حسین خان کے یہاں پھول باغ کالونی میں رکتا ہوں۔ مجھے اکثر اکیڈمی کی میٹنگ کی وجہ سے آنا پڑتا ہے۔ حسین بھائی میرے، بہت اچھے دوست ہیں وہ میرے لکھنؤ میں کہیں اور قیام کرنے پر ناراض ہوتے ہیں۔ لیکن علی الصبح کسی کے یہاں جانا مجھے بہت معیوب لگتا ہے۔ طوعاً و کرہاً میں رکشہ میں سوار ہوا۔ رکشہ اسٹیشن سے نکل کر خراماں خراماں اس شاہراہ پر آگیا تھا، جسے لکھنؤ کی ریڑھ کہہ سکتے ہیں۔ حسین گنج چوراہے سے بہت دور تک، ہوٹل، دکانیں، بڑے بڑے مال نما کامپلیکس، سیدھے ہاتھ کی طرف اسمبلی کی عظیم الشان عمارت، انتہائی ضروری سرکاری دفاتر، رہائشی فلیٹس کا سلسلہ حضرت گنج چوراہے اور آگے تک چلا گیا ہے۔ بائیں ہاتھ میں جج ہاؤس کی عمارت بھی ہے، جہاں سے قیصر گنج اور لال باغ تک بہ آسانی پہنچا جا سکتا ہے۔

رکشے والا پھول باغ آگیا تھا۔ میں چھ بجے کے آس پاس حسین بھائی کے دولت کدے پر پہنچ گیا تھا۔ حسین بھائی اور ان کی فیملی دیر تک اٹھنے کے عادی ہیں، نا چاہتے ہوئے بھی میں نے کال بیل کا بٹن

دبایا۔کال بیل نے تقریباً چیختے ہوئے اپنا کام پورا کر دیا۔لیکن حسین بھائی کے گھر سے کسی قسم کی کوئی آہٹ سنائی نہیں دی۔لگتا ہے حسین بھائی دیر رات گھوڑے بیچ کر سوئے ہوں گے۔دوبارہ کال بیل بجانے کی ہمت نہیں ہوئی۔میں بیگ لیے ہوئے واپس ہولیا اور گلی کے نکڑ پر چائے خانہ میں چائے کا آرڈر دیا۔گرم گرم چائے نے سردی کے احساس اور حسین بھائی کے بیدار نہ ہونے کی خجالت سے راحت دلائی۔

آج اردو اکادمی کی انعامات کمیٹی کی میٹنگ تھی جس میں سب سے بڑے انعام پانچ لاکھ روپے اور دس ایک ایک لاکھ روپے کے انعامات کا فیصلہ ہونا تھا۔بہت ہی خاص میٹنگ ہونے والی تھی۔ہر سال اس میٹنگ کا بہت شدت سے انتظار کیا جاتا ہے۔میں پچھلے کئی برس سے اردو اکادمی کی مجلس انتظامیہ کا رکن ہوں۔میری حتی المقدور کوشش ہوتی ہے کہ انعامات کے فیصلے میں کوئی گڑبڑی نہ ہو۔اور حق دار کو اس کا حق مل جائے۔ہاں یہ ضرور ہے کہ کبھی بار سیکریٹری اور چیرمین کی سفارشات کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے اور کسی ایک آدھ ایوارڈ پر من مار کے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔اکادمی کی میٹنگ میں ضیافت بھی اچھی خاصی ہوتی ہے۔پورے دن گہما گہمی اور ہلکا ہلکا سا شور سا سنائی دیتا رہتا ہے۔مجھے دوسری چائے کی حاجت طلب ہوئی اور میں نے چائے خانے کے مالک سے دوسری چائے طلب کی۔ویسے بھی چائے میری کمزوری ہے،میں بہت چائے پیتا ہوں۔مجھے چائے کا یہ شوق جمشید پور سے لگا۔جہاں بہت چائے پی جاتی ہے۔چائے کے پیسے ادا کر کے میں نے گھڑی دیکھی۔سات بجے کا عمل تھا۔میں دوبارہ حسین بھائی کے گھر کی طرف چل پڑا۔شرمندگی کے احساس کے ساتھ دوبارہ کال بیل پر انگلی رکھی اور ایک ساتھ دو بار بیل دبا دی۔اندر سے دروازے کی چرمرانے کی آواز نے بیل اور میری دونوں کی عزت رکھ لی۔تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا اور آنکھ ملتے ہوئے حسین بھائی دروازے پر برآمد ہوئے۔آنکھوں میں نیند کا خمار تھا لیکن چہرے پر پھیکی پھیکی سی مسکراہٹ بھی۔

"آئیے۔۔۔آئیے۔۔۔ارے۔۔۔ارے سلیم بھائی"

وہ دروازے سے واپس پلٹے اور مجھے اپنے ڈرائینگ روم میں لے آئے۔

"ابھی تو سات بجے ہیں میٹنگ تو 12 بجے ہے۔ایک آدھ گھنٹہ سو لیتے ہیں پھر چلیں گے"

وہ انگڑائی لیتے ڈولتے ڈالتے واپس گھر کے اندر سما گئے۔میں ڈرائینگ روم میں بیٹھا انھیں دیکھتا رہ گیا۔میں نے جوتے اتارے،لباس تبدیل کیا اور کونے میں پڑے دیوان پر دراز ہو گیا۔

لکھنؤ دراصل اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ تہذیب کا بھی گہوارہ ہے۔یہاں آپ کو قدم قدم پر مہذب لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔چکن کپڑوں کی بہت ساری دکانیں لکھنؤ کی رونق میں اضافہ کرتی ہیں۔نواب واجد علی شاہ کے ہورڈنگس بھی چوراہوں پر نظر آتے ہیں۔ذہن سیدھا 1857،بیگم حضرت محل کی جہد وجہد آزادی

اور نواب واجد علی شاہ کے کارناموں کی طرف گھوم جاتا ہے۔ پورے لکھنؤ میں عمارتوں کا طویل سلسلہ ہے جس کی طرزِ تعمیر بھی الگ نوابی رنگ لیے ہوئے نظر آتی ہے۔ خود لکھنؤ کا چار باغ اسٹیشن اس کی مثال ہے۔ بارہ دری، بھول بھلیاں، چھوٹا امام باڑا، شاہ نجف، ریزیڈنسی، گھنٹہ گھر، چڑیا گھر، جامع مسجد، پکچر گیلری، فرنگی محل، ندوۃالعلماء، لکھنؤ یونیورسٹی اور بے شمار عمارتیں لکھنؤ کی شان ہیں۔ گنج، باغ بنگری کباب، ٹنڈے کباب اور گومتی کے لیے مشہور لکھنؤ اپنی مثال آپ ہے۔ خود نیر مسعود نے اپنے افسانوں خصوصاً طویل افسانے "طاؤس چمن کی مینا" میں نواب واجد علی شاہ، لکھنؤ اور 1857 کے حالات کا جو منظر لفظوں میں ڈھالا ہے وہ لاجواب ہے۔ یہی نہیں لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت پر پنڈت رتن ناتھ سرشار کا "گزشت لکھنؤ" اور مرزا ہادی رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" اس کے بہترین عکاس ہیں۔ شیش محل، ڈالی گنج، جھاکر گنج، بالا گنج، نخاس، چوک، کشمیری محلہ، لال باغ، پھول باغ، نظیر آباد جیسے پرانے لکھنؤ کی زندگی اور تہذیب کو ادھر نئے لوگوں میں انیس اشفاق نے اپنے فکشن میں ازسرِنو زندہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اچانک ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور حسین بھائی کا حکم صادر ہوا جلدی سے نہا دھو کر آجائیں، میں ناشتے کی ٹیبل پر آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں نے خیالات کی پوٹلی کو الٹا سیدھا سمیٹا اور باندھا۔ کپڑے لے کر باتھ روم چلا گیا۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم لوگ حسین بھائی کے آفس قیصر باغ آئے اور پھر اردو اکادمی گومتی نگر پہنچ گئے۔ میٹنگ وغیرہ کے بعد طے ہوا کہ شام میں لکھنؤ کی مشہور و معروف بزرگ فکشن رائٹر کے یہاں چلیں گے۔ میں نے بچپن سے ہی محترمہ کے متعدد ناول پڑھ رکھے تھے ان سے ملنے کا مجھے کافی اشتیاق تھا۔ شام میں جب میں اور حسین بھائی ان کے گھر پہنچے تو انھوں نے ہمارا بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ عالم گیر شہرت یافتہ ادیبہ آج میرے سامنے تھیں۔ لمبا قد، بھری بھری شکل وصورت اور جسم والی یہی کوئی ساٹھ پینسٹھ سالہ خاتون کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ لمبے قد والی عورت کا ادب میں بھی قد خاصا بلند تھا۔ ڈرائنگ روم میں ایک الگ قسم کی نفاست ہر سامان سے چمک رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو رہی تھیں۔ ویسے میں نے ان کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ بہت زندہ دل اور دلچسپ گفتگو کرنے والی خاتون ہیں۔ چائے پانی کے بعد حسین بھائی اور میں دیر تک ان سے محوِ گفتگو رہے۔ ادب کے بہت سارے موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ لکھنؤ کا ماضی بھی گفتگو میں آیا۔ اچانک وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں:

"اگر آپ نے امین آباد اور حضرت گنج نہیں دیکھا تو لکھنؤ نہیں دیکھا۔ امین آباد بازاروں سے آباد ایک بڑا علاقہ ہے۔ آپ یہاں کی رونق اور چکاچوند سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ٹنڈے کبابوں کی

خوشبو، پراٹھوں کی مہک، مغلئی کھانوں کی لذت ہے تو سوتی اور چکن کے کپڑوں کے بازاروں کا جال بھی۔ یہاں ایک طرف پارک ہے۔ جس کے نیچے پارکنگ اور سامنے کتابوں کا بڑا سا بازار، جہاں ہر قسم کی کتابیں، ہول سیل اور رعایتی قیمتوں پر فروخت ہوتی ہیں۔ پہلے یہاں اردو کا بھی اچھا خاصا بازار تھا۔ اردو کی کئی دکانیں اور پبلشر ہوتے تھے، اب دانش محل، اپنی دانش مندی سے کسی طرح کام چلا رہا ہے۔ امین آباد کو آپ لکھنو کا چاندنی چوک بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہاں سے کئی راستے قیصر گنج تک آتے ہیں۔" وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوئیں۔ انھیں کیا پتہ کہ میں لکھنو سے واقف ہوں۔

"اور حضرت گنج کا کیا کہنا ایک اعلیٰ درجہ کا کشادہ بازار ہے۔ اسے آپ کناٹ پلیس سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ یہاں پرانی عمارتوں کو نئے انداز میں سجایا گیا ہے۔ زیادہ تر دکانوں کے نیون سائن بورڈ کالے پر سفید رنگ سے لکھے ہوئے ہیں۔ یہاں کی شامیں بہت گلزار ہوتی ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب یہاں کا کافی ہاؤس ادبا و شعرا کی آماجگاہ ہوا کرتا تھا۔ اب نئی نسل کے نوجوان کافی کی چسکیوں کے ساتھ خوب موج مستی کرتے ہیں۔"

وہ حضرت گنج کے قصیدے پڑھ کر خاموش ہو گئیں۔ لیکن ان کا حرف حرف حقیقت کو عیاں کر رہا تھا۔ مجھے ان کی باتوں سے یہ بھی علم ہوا کہ ان کے خانوادے میں خواتین اور زبان و ادب کے بڑے اساتذہ ہوئے ہیں۔ میں تو ان سے پہلے ہی سے بہت متاثر تھا اب ان کی شخصیت کا تاثر مزید گہرا ہو گیا تھا۔ ان سے رابطے کا نمبر حاصل کرنے کے بعد ہم لوگ رخصت ہوئے۔ وہ دروازے تک ہمیں الوداع کہنے آئیں۔ ان کی الوداعی نگاہوں میں مجھے ایک طلسم سا محسوس ہوا۔ شخصیت، خاندان، زبان، انداز اور فکشن کے ساتھ ساتھ ان کے والہانہ برتاؤ نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

☆

کافی دنوں سے میں لکھنو نہیں گیا تھا لیکن بزرگ ادیبہ سے ایسا دیرینہ تعلق قائم ہو گیا تھا کہ اکثر ان کے فون آتے یا میں خود ان کو فون کر لیتا۔ اور ہم کافی دیر تک باتیں کرتے۔ ان کے ناولوں کی باتیں، افسانوں پر تبصرے، ان کے کرداروں کا ذکر اور کچھ ادھر اُدھر کی ہنسنے ہنسانے کی باتیں۔

میں بھی ایک افسانہ نگار ہوں اور میرے دوست حسین خان بھی اچھے افسانہ نگار ہیں۔ میری عمر چالیس سے کچھ کم ہوگی جب کہ حسین بھائی پچپن کے آس پاس کے تھے۔ دوستی اور محبت میں عمر کا کوئی معاملہ نہیں ہوتا۔ مجھے بخوبی علم ہے کہ محترمہ کے کئی بچے ہیں اور ان بچوں کے بھی بچے ہیں لیکن ان سب کے باوجود مجھے اپنے دل کے نہاں خانے میں محترمہ کا احترام، شخصیت کا روپ اور اندازِ گفتگو کے ساتھ ساتھ ایک خاص لگاؤ محسوس ہونے لگا تھا، جس طرح نیا لکھنو، گومتی نگر، اندرا نگر، وکاس نگر، رام منوہر لوہیا پارک، وبھوتی کھنڈ، ایئر پورٹ علاقہ

اور پالی ٹیکنک علاقہ دل میں اپنی جگہ بنالیتا ہے۔

آئندہ بھی بار لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا لیکن محترمہ سے ملاقات کی کوئی سبیل نہیں نکل پائی۔ پھر میں نے اپنی تازہ ترین کتاب جو فکشن تنقید پر تھی جس میں محترمہ کے افسانوی مجموعے پر تبصرہ شامل تھا، انھیں بھجوائی تو وہ میری کتاب پڑھ کر خوش بھی ہوئیں اور جذباتی بھی۔ انھوں نے مجھے ایک دن فون پر کتاب کے تعلق سے بہت کچھ بتایا۔ میرے طرز تحریر کی بہت تعریف کی۔ ان کے لہجے اور انداز سے پیار کی ایک دھیمی دھیمی آنچ پھوٹتی تھی۔ ان کی باتوں میں سرور تھا اور میں مسرور ہوئے بغیر نہیں رہ پایا۔ میں نے ان سے ایک انٹرویو کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ انھوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ پاکستان کا ایک معروف رسالہ ان پر گوشہ شائع کر رہا ہے۔ میں اس میں ضرور لکھوں۔ میری عدیم الفرصتی نے ایسے بہت سے موقعے مجھ سے چھین لیے ہیں۔ میں چاہتے ہوئے بھی اس گوشے میں شریک نہیں ہو پایا۔

☆

کچھ دن بعد مجھے پھر لکھنؤ جانے کا موقع ملا۔ حسین بھائی تو مصروف تھے۔ میں کسی اور طالب علم کو لے کر ان کے گھر پہنچ گیا۔ لکھنؤ میں میرے کئی طالب علم زیر تعلیم ہیں۔ محترمہ بڑے جوش اور جذبے سے ملیں۔ ناشتے کا خاص انتظام تھا۔ انھوں نے ناشتے کے دوران ہی اپنی بیٹی اور نواسی سے ملوایا۔ کچھ دیر بعد میں نے ان سے انٹرویو شروع کر دیا۔ وہ چہک چہک کر میرے سوالوں کا جواب دیتی رہیں۔ اپنے ناولوں کے بارے میں، ان کے کرداروں، قصوں، افسانوں کی آپ بیتیاں سب کچھ تفصیل سے بتاتی رہیں۔ لکھنؤ اور اپنے رشتہ داروں کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کرتی رہیں۔ میں نے لکھنؤ کی ادبی حیثیت کے بارے میں پوچھا تو پر جوش انداز میں بولیں۔

لکھنؤ اردو زبان و ادب کا بڑا مرکز رہا ہے۔ آتش، ناسخ کے ہی عہد میں سودا، مصحفی اور میر ہجرت کر کے آئے اور عمر کا آخری حصہ لکھنؤ میں گذارا۔ میر انیس او مرزا دبیر نے مرثیے کو استحکام بخشا۔ میر حسن اور دیا شنکر نسیم نے مثنوی کو عروج عطا کیا۔ شرر، سرشار مرزا ہادی رسوا، نسیم حجازی، اسلم جیراجپوری، عزیز احمد، حیات اللہ انصاری نے ناول کو رفتار دی۔ امانت لکھنوی اور نواب واجد علی شاہ نے ڈرامے کو بطور صنف مستحکم کیا۔ صفی لکھنوی، محشر لکھنوی کے بعد یاس یگانہ، آرزو لکھنوی، جوش ملیح آبادی، مجاز، جاں نثار اختر نے شاعری میں اپنا جلوہ دکھایا۔ سجاد ظہیر کی قیادت میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد بھی پڑی اور عروج بھی ملا۔ یہی نہیں لکھنؤ کو تو ادب میں ایک اسکول کی حیثیت حاصل ہے"

وہ چپ ہوئیں تو میں نے سوال کیا۔ منشی سجاد حسین اور نول کشور کے بارے میں کیا خیال ہے۔

پہلے تو تھوڑا خجل ہوئیں، پھر بولیں "ارے سلیم میاں! میری یادداشت متاثر ہونے لگی ہے۔ عمر کا تقاضا ہے۔ منشی سجاد حسین اپنے اخبار اور نول کشور اپنے پریس کے لیے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔"

"اچھا یہ بتائیں آپ کو نیا لکھنؤ کیسا لگتا ہے؟" میرے اس سوال پر ان کی آنکھوں میں الگ ہی رنگ تھا۔

"نئے زمانے میں لکھنؤ نے بہت ترقی کی ہے۔ شاندار ایئر پورٹ، نئی نئی ٹرینیں، برق رفتار میٹرو، سڑکوں اور پلوں کا جال، عالی شان کثیر منزلہ عمارتیں، فلیٹس کا اگتا جنگل، نئے نئے بازار، مالس، ملٹی اسکرین فلم ہالس، خوبصورت پارک اور چوراہے، پرانی عمارتوں کے نئے رنگ روپ، لوفلور بسیں، شاندار کالجز اور ادارے، غرض لکھنؤ کا نقشہ ہی بدل چکا ہے۔ لیکن بدلتے زمانے نے لکھنؤ سے بہت کچھ چھین بھی لیا ہے۔ تہذیب کے نام پر صرف حرف ہی نہیں آیا بلکہ سب کچھ تہس نہس ہو گیا ہے۔ ادب اور تہذیب تو مدارس، امام بارگاہوں، مجالس و محافل تک سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ ورنہ یہی لکھنؤ تھا، جہاں پہلے آپ، پہلے آپ میں سواری چھوٹ جایا کرتی تھی۔"

فکر و تردد کی لکیریں ان کے چہرے کو مزید غمزدہ بنا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد میں نے آخری سوال کیا۔ لکھنؤ کے سیاسی رنگ کے بارے میں ایک ادیبہ کا کیا خیال ہے؟

"سیاست کا تو عجب ہی حال ہے تین رنگوں والا پرچم پہلے سبز و سرخ تو پھر نیلا اور اب زعفرانی ہو کر جم سا گیا ہے۔ کہیں پتھر کے عظیم الجثہ ہاتھیوں کی قطاریں، تو کہیں محل نما عمارتیں، خوبصورت پتھروں سے سجے وسیع و عریض پارک، زندہ سیاسی رہنماؤں کی قیمتی مورتیاں، شہروں کے بدلتے نام، نفرت کا روز بڑھتا کاروبار، مخصوص فرقے، مذہب اور ان کی عبادت گاہوں کو نشانہ بنانے کا سلسلہ۔" وہ بولتے بولتے روہانسی ہو گئیں۔

میرے ساتھ آئے طالب علم نے میرے ان کے ساتھ متعدد فوٹو فلم بند کیے۔ انٹرویو کے بعد جب ہم چلنے لگے تو وہ زیادہ جذباتی ہو گئیں۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ خدا جانے یہ بچھڑنے کے آنسو تھے یا طویل ملاقات اور قربت کی خوشی کے۔ ہم لوگ ان سے رخصت ہو کر ان کی پر امید اور نم نگاہوں کے سائے تلے دور تک چلے آئے۔ نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی وہ ذہن و دل پر سوار ہو گئیں۔ میں اس دن بہت بے چین رہا میری عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی۔ میری اور ان کی عمر میں تقریباً 20-25 سال کا فرق تھا لیکن ان کے والہانہ پن اور خوش دلی سے میں بہت متاثر تھا۔ اس کے باوجود ان کی چاہت کے رخ کا مجھے پتہ نہیں تھا۔ لیکن ایک عجیب سی کسک اور کمی کا احساس میرے اندر اترتا جا رہا تھا۔ گویا سورج شام میں سمندر کے اندر اپنی روشنی سمیت سما تا جا رہا ہو۔ اور سمندر کا پانی سنہرا ہو گیا ہو۔ میرے اندر بھی ان کی محبت کا سورج، اپنی حدت اور روشنی سمیت اترتا جا رہا تھا۔ میں اپنے اندر ان کی بے پناہ محبت محسوس کرنے لگا تھا۔ ان کا صحت مند و توانا اور خوبصورت جسم مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا میں روئی کے گالوں کے درمیان آسمان کی سیر کر رہا ہوں۔ میں نجانے کس طرح ان کی چاہت کے سمندر میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ وہ اکثر لکھنؤ کے پرانے قصے بیان

کرتیں اور اپنے آباؤ اجداد کے تذکرے بھی سناتیں۔ وداع ہوتے وقت ان کے آنکھوں کی نمی بوند بوند بارش کی شکل میں اترتی جا رہی تھی۔ میرے بدن کی گیلی مٹی میں کٹان اور دھنسان شروع ہو گیا تھا۔ ان کی آنکھیں کچھ کہنے کی کوشش کرتیں اور میں مضطرب ہو جاتا۔

نوچندی لکھنؤ سے میرٹھ کے لیے گیارہ بجے رات میں ملتی ہے۔ میں احتیاطاً دس بجے ہی اسٹیشن آ گیا تھا۔ پورا اسٹیشن مسافروں سے بھرا پڑا تھا۔ کوئی ادھر جا رہا تھا تو کوئی ادھر۔ ریل گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ پلیٹ فارم گاڑیوں کے آنے جانے سے کبھی کبھار کانپ اٹھتا تھا۔ مسافروں کے شور وغل سے ایک الگ سماں پیدا ہو رہا تھا۔ ضروری اعلانات بھی بہت کم سنائی دے رہے تھے۔ کسی طرح میں ٹرین کی آمد کا صحیح وقت کا پتہ لگانے میں کامیاب ہوا۔

"نوچندی ایکسپریس پلیٹ فارم نمبر چار پر سوا گیارہ بجے آئے گی۔"

گیارہ بجا چاہتے تھے۔ ٹرین کا ایک گھنٹہ انتظار میرے لیے بہت سخت تھا۔ پلیٹ فارم پر بہت زیادہ بھیڑ تھی۔ بیٹھنے کی کوئی کرسی خالی نہیں تھی نا ہی کوئی ایسی مناسب جگہ جہاں ٹکا جا سکے۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا اترنے اور چڑھنے والی سیڑھیوں کے دونوں جانب کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔ میں نے بھی ایک سیڑھی پر ریلنگ کے قریب قبضہ جما لیا۔ آنکھوں میں نیند طاری تھی۔ تھکاوٹ کا احساس بھی شدید تھا لیکن محترمہ کی یادیں، باتیں، انداز تصویریں ذہن کے اندر اور باہر رقص کر رہی تھیں۔ ان کی بولتی ہوئی خاموش نظریں مجھے بے حد مضطرب کر رہی تھیں۔ میں اس سے پہلے بھی کئی بار محترمہ سے رخصت ہو چکا ہوں لیکن آج کی ان کی الوداعی نظریں کچھ اور ہی فسانہ کہہ رہی تھیں۔ میرا دل اداسی کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ ان کا چہرا اپنی تمام جولانیوں کے ساتھ میرے دل سمندر میں لطف و انبساط کی لہریں ابھار رہا تھا۔

نوچندی ایکسپریس آ گئی تھی۔ مسافر اتر چڑھ رہے تھے۔ میں نے بھی اپنی سیٹ پر بستر کھولا اور دراز ہو گیا۔ محترمہ کا خیال میرے اور نیند کے درمیان لیٹ گیا تھا۔ میرا دل لکھنؤ میں کہیں چھوٹ گیا تھا اور بے جان سا جسم کب ٹرین کے جھکولوں کے ساتھ محترمہ کی تصویر کے ساتھ نیند کی آغوش میں سما گیا مجھے پتہ نہیں چلا۔

محترمہ پر جو پاکستانی رسالے کا گوشہ آیا اس میں اتفاق سے میری ایک کہانی "اس کی کہانی" بھی شامل تھی۔ محترمہ کا فون آیا پہلے تو گوشے میں میری عدم شمولیت کی شکایت کرتی رہیں لیکن پھر میری کہانی کے شامل ہونے پر خوشی کا اظہار بھی کیا اور کہانی کی بے حد تعریف کی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ میں پہلی بار کسی رسالے میں ان کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ میں ان کی باتوں سے مزید متاثر ہوا۔

ہمارا حال بالکل ٹرین کی پٹریوں جیسا تھا۔ انھوں نے کھل کر کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا اور میں

ایک چھوٹا افسانہ نگار ان کی شان میں ایسی گستاخی کیسے کرسکتا تھا۔ وہ لکھنوی تہذیب کی پروردہ، پہلے آپ پہلے آپ کی نمائندہ، اگر کوئی پہل ہوتی تو ان کی طرف سے ہوتی۔ میں میرٹھ کا ایک رف ٹف ادیب لکھنوی شان وشوکت اور تہذیب سے ناواقف۔ ایسی جرات کیسے کرسکتا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اگر میں نے کبھی ایسا قدم اٹھایا بھی تو میں انھیں کھو نہ بیٹھوں۔ اپنے اندر کے ڈر اور خوف نے مجھ پر ایک غلاف چڑھا دیا تھا۔ جو ان کی لطیف اور دلچسپ گفتگو سے کبھی کبھار چٹخ پڑتا تھا۔ لیکن اس کفن نما غلاف کو میں کبھی اتار نہیں پایا۔

گذشتہ دو ایک ماہ، میں بہت مصروف رہا۔ اس بیچ محترمہ کا کوئی فون بھی نہیں آیا اور میں بھی ان سے کوئی رابطہ نہیں کرسکا۔ یوں بھی ان کے پاس موبائل نہیں تھا بلکہ وہ اپنے گھر کے لینڈ لائن کا استعمال کرتی تھیں۔ ایک آدھ بار میں نے ان کا نمبر ملانے کی کوشش بھی کی تو فون خراب ہونے کا اشارہ ملتا رہا۔ ادھر کئی ماہ بعد مجھے لکھنؤ جانے کا موقع ملا۔ میں نے انھیں فون پر خبر دینے کی کوشش کی لیکن فون خراب ہی تھا۔ لکھنؤ میں اپنی مصروفیات سے فارغ ہو کر میں شام میں ایک طالب علم کے ہمراہ بائک پر سوار ان کے گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ انھوں نے اپنا گھر تبدیل کرلیا ہے۔ وہ پہلے بھی کئی بار گھر تبدیل کرنے کے بارے میں کہہ چکی تھیں۔ نئے گھر کا پتہ تلاش کرنے میں مجھے کافی جد وجہد کا سامنا کرنا پڑا اور جب کافی پریشانیوں کے بعد ان کے نئے فلیٹ پر پہنچا اور بیل بجائی تو ان کی بیٹی برآمد ہوئی۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے جو جملہ ادا کیا اس نے میرے وجود میں گرم پگھلتے شیشے کے اترنے جیسا کام کیا۔

"امی کو نیا گھر راس نہیں آیا اور وہ اپنے حقیقی گھر چلی گئیں۔"

"امی نے آپ کو فون ملایا تھا لیکن آپ سے بات نہیں ہو پائی۔ امی آپ کے لیے یہ لفافہ چھوڑ گئی ہیں۔"

میں نے لفافہ اپنی جیب میں رکھا اور تعزیت کے بعد قبرستان کا رخ کیا۔ ان کی قبر کے پاس جا کر میں نے اپنے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیا اور جیب میں رکھے لفافے کو کھولا۔ لفافے سے دو تصویریں برآمد ہوئیں پہلی تصویر میں، میں ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں موجود تھا جس پر لکھا تھا" میں اور نوجوان افسانہ نگار سلیم" جبکہ دوسری تصویر میں محترمہ کسی نوجوان کے ساتھ تھیں جس کی شباہت مجھ سے بہت ملتی جلتی تھی لیکن عمر 5-4 برس کم ہوگی۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

"میں اور میرا مرحوم بیٹا سلیم درانی۔"

میری نظر میں محترمہ کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کی شاندار عمارتیں، امام باڑے، بلند و بالا گنبد و مینار، قبرستان میں موجود شاندار تکیے اور آستانے آگئے۔ جن کی قدر تو دور، احترام اور محبت سے دیکھنے والے بھی اب نہیں رہے۔

☆☆☆☆

صدف مرزا (ڈنمارک)

دو پلوں کے درمیاں

یہ عالمی وبا اور عالمی تنہائی کیسی اعصاب شکن ہے۔ ذہنوں سے سوچنے اور ہاتھوں سے لکھنے کی طاقت چھین کر لے گئی ہے۔ مجھے کبھی تو یوں لگتا ہے کہ سارے افکار اور سب الفاظ صرف ماسک پہنے ہی نہیں بلکہ سلیمانی ٹوپی اوڑھے نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں لیکن عین ہمارے سامنے موجود ہیں۔ انسانی بے بسی کا تماشا کرتے والوں میں خود اس کی ذات کے اندر اگی ہوئی آنکھیں موجود ہیں۔

گزرے دنوں کی پہیلیاں فینکس کی پہیلیوں کی طرح شہرِ ذات کے دروازے پر کھڑی ہیں۔ یہ پہیلی حل نہیں کر پاؤ گے تو مار دیے جاؤ گے۔ خود تمہارے اندر ہی سے کوئی تمھیں قتل کر دے گا اور بغیر کسی لاش اور کتبے کے تمہارے اندر ہی اندر کہیں تمہاری قبر بنا دی جائے گی۔ اس قبر پہ گھنا جنگل اُگ آئے گا اور تم باہر بیٹھے ہی اس میں بھٹک جاؤ گے۔

اس وبا نے گھریلو تشدد کی نئی کہانیاں جنم دی ہیں۔ انسانوں کے اندر کا جنگل ہرا بھرا ہو گیا ہے۔ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہتے رہتے وحشت زدہ ہو چکا ہے۔ قرب و وصال کی نشاط کے معنی بدل چکے ہیں۔ انسانی نفسیات میں محرکات کی تشریحات بھی شاید بدلنے کو ہیں۔

میں نے لکھتے لکھتے تھک کر قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ ماضی کی اذیت بھری راہیں پیروں کے زخم ہی نہیں دل کے گھاؤ بھی ہرے کر دیتی ہیں۔

میری میز پہ نئے مقدمات کی فائلیں ایک دوسرے سے سر جوڑے ایک ہی جیسی سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ کبھی یہ سرگوشیاں ایک دھاڑ بن کر مجھ پہ حملہ آور ہوتی ہیں ۔ میں جو آج جرمن ذوثقافتی نفسیات Biculturalism کی ایک سرگردہ نفسیات دان سمجھی جاتی ہوں پچھلی صدی ہی میں کہیں پہیلی نہ بوجھ پانے کے جرم میں ماری جا چکی ہوں۔

دو معاشرتوں کے جال میں پلنے والی عورتوں اور بچوں کے مقدمے مجھے مشکل ترین لگتے ہیں۔ ان کی پیروی کرتے ہوئے کبھی تو مجھے یوں لگتا کہ ایک تاریک غار کے سفر سے واپس آئی ہوں۔ اس غار کے اخیر پہ کوئی راستہ نہیں ہے اس کے دہانے پہ بھاری پتھر ہے۔ واپسی کا سفر حوصلے کی دیا سلائی جلاتے جلاتے اور ٹٹولتے بھٹکتے ہوتا ہے۔ کسی دن اسی غار میں قبر بن جائے، کون جانے۔ جلی ہوئی تیلیوں پہ پڑے پنجر کی باقیات

شاید نئی صدی کے مہم جو کبھی نہ کھوج سکیں۔

اکلچریشن، پیڑی آرچل اونر شپ، اور آنر کلنگ آج بھی ایک بے رحم حقیقت ہے۔ ان کے مقدمے میرے باپ کے پاس آتے تھے اور شاید مجھے انھی سفاک حقائق نے کہانی کار بنا دیا تھا۔ ابا ایک معروف فیمنسٹ تھے۔

میرے باپ نے مجھے بھی جرمنی اور فرانس کی فیمی سائیڈ کے مقدمات کے بارے میں پڑھنے دیا۔ وہ مجھے کہانیوں کی طرح انسانی زندگی کے واقعات سناتے۔ میری ذاتی زندگی میں باپ کی شفقت ایک مینارۂ نور کی طرح تھی۔

مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ بچی خبروں کی کہانیاں سناتے سناتے ابا خود بھی ایک خبر بن جائیں گے۔ ہر معاشرے میں گھریلو تشدد ہوتا ہے۔ جرمنی میں بھی تھا۔ لیکن مجھے ایک عراقی سہیلی عظیمہ کے خوفناک قتل نے دہلا دیا تھا۔ اس کا ساتھی مائکل بھی اسی خون آشام آنر کلنگ کا شکار ہو گیا تھا۔

میرا ابا میرے کمرے کی کھڑکیوں پر گرے ہوئے کالے پردے اور بند دروازہ دیکھتا؛

"میں خود کو تمھارا مجرم سمجھتا ہوں،

ابا کہتے تم نے آنکھ کھولتے ہی مجھے ایسے مقدمہ لڑتے دیکھا ہے یہ تمھارے لاشعور کا حصہ بن گئے ہیں۔ اس اندھے کنوئیں سے باہر نکلو میری بچی عظیمہ کا یہ قتل، عورت کے قتل کا کوئی پہلا واقعہ نہیں ایسا ہوتا آیا ہے۔"

میرا جی چاہتا کہ چیخ کر کہوں کہ میری زندگی میں تو یہ ہولناک واقعہ پہلا قتل ہے، ایک معصوم، نو عمر لڑکی کا قتل۔ میرے باپ کی نیلی آنکھوں میں نیلے سمندر کی طرح لہریں ڈوبتی ابھرتی رہتی تھیں۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر یہ قطرے چھلک گئے تو پوری دنیا سونامی کی زد میں آجائے گی۔

مجھے میرے باپ کے غم نے نہیں اس طغیانی کے خوف نے اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ ایک نو عمر لڑکی باپ کا ہاتھ تھام کر خوف کے عفریت سے بچ کر اس جنگل سے باہر نکل آئی تھی۔

میرے ابا یورپ کی فیمنسٹ موومنٹ کے سرکردہ رکن رہا۔ گلاس سیلنگ کے بارے میں لندن کی کانفرنس سے واپس آ کر ابا نے اس کا جرمن ترجمہ کیا۔ شیشے کی چھت تعمیر کرنے والے ہاتھ بہت سے ہیں جو عورت کے ہاتھ میں صرف آئینہ تھما دینا چاہتے ہیں۔ ابا کہتے۔

جب وہ آئینہ دور رکھ کر شیشے کی بندشیں توڑتی ہے تو ریزے اڑتے ہیں۔

میری ماں جرمن لٹریچر پڑھاتی تھی۔ وہ میرے باپ کے مقدمات کی شقی القلب دنیا سے دور شعر و ادب کی دنیا میں جیتی۔ کرداروں کا تجزیہ کرتی، ماضی اور حال کی آواز سنتی تھی۔ وہ ادب سے ذہنی سکون حاصل

کرتی تھی۔ میری ماں مجھے نہیں سمجھ سکتی تھی۔ وہ جرمنی کے ایک گاؤں سے پڑھنے کے لیے میونخ آئی تھی۔ ماں میں گاؤں والوں کی ساری خصوصیات موجود تھیں۔ سادگی، معصومیت اور انسانوں پر یقین ابھی دھندلایا نہیں تھا۔

میں نے اپنے باپ کے پیشے کے برعکس نفسیات کے موضوع کا انتخاب کیا۔ میری ماں نے شدید اختلاف کیا، وہ کہتی کہ تم پیشن اور پروفیشن کو الگ نہیں رکھ سکو گی۔ جرمن معاشرہ یا جرمنی کا ذو ثقافتی معاشرہ تمہارے لیے بہتر نہیں۔

ہماری زندگی میں ایک عراقی لڑکی عظیمہ کا دخل ہمیشہ رہے گا۔ وہ ہمارے سامنے والی عمارت میں آ کر بس گئے تھے۔ عظیمہ سب سے بڑی تھی۔ اس سے چھوٹے تین بہن بھائی اور بھی تھے۔

عظیمہ زندگی سے بھری ہوئی لڑکی تھی۔ ہم گرمیوں کی لمبی شام کو عمارت کے سامنے بنے کھیل کے میدان میں کھیلتے۔ سردیوں میں کھیل گھر میں ہوتے تھے۔ عظیمہ کے باپ کو ہمارا میل جول پسند نہیں تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو عام جرمن لڑکی سے بچا کر رکھنا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود ہماری دوستی ہو گئی۔

اس کی ماں جب بھی اسے ہمارے گھر آنے کی اجازت دیتی اسی شرط پر ہوتی کہ گھنٹے بعد واپس آ جانا۔ اس کے بابا شام کو پانچ بجے گھر آ جاتے تھے۔ اسے صرف عمارت کے سامنے لگے جھولوں پر کھیلنے کی اجازت تھی جو اس کے گھر کی کھڑکی سے دکھائی دیتے تھے۔

میری ماں کو اس کی سبز آنکھیں بہت پیاری لگتی تھیں۔ وہ کہتیں کہ یہ بچی بہت ذہین ہے بڑی ہو کر ضرور کچھ مختلف کرے گی۔ عام بچوں سے الگ، کچھ تخلیقی کام، کوئی شاہکار"۔

عظیمہ کے ننھے سے سر پر خوش نما رنگوں کا سکارف موجود ہوتا تھا۔ اس نے میری ماں کو بتایا کہ اس کی اماں نے اسے پانچ برس کی عمر میں یہ سکارف پہنایا تھا۔ کھیلتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے سکارف تھامے چھلانگیں لگاتی۔ اور میری ماں اس کا سکارف درست کر کے مضبوطی سے پن لگا دیتی۔

میرے ابا اسے ہر وقت سر پر مضبوطی سے حجاب پہنتے دیکھتے تو الجھ جاتے، "لیکن پانچ برس کی بچی کو کیا علم کہ وہ یہ سکارف کیوں پہن رہی ہے۔" ابا بحث کرتے۔ ماں اکثر ابا سے کہتی، تم شیشے کی چھت توڑو، لیکن دوسروں کے گھروں کی دیواروں کے پیچھے مت جھانکو"

میرے ابا ایک مرتبہ سرکاری دورے پر لندن گئے اور واپسی پر ہم دونوں کے لیے دو بڑے مگ لے کر آئے جن پر لندن کے پل کی تصویر تھی اور دوسری طرف ہمارے نام لکھے ہوئے تھے۔ لیکن عظیمہ نے وہ کپ گھر لے جانے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگی میرے بابا ناراض ہوں گے۔ میں آپ کے گھر جب بھی آؤں گی اسی مگ میں دودھ پیا کروں گی۔ وہ جوس اور کولا بھی اسی مگ میں ڈال کر پیتی۔

اس کے والدین نے نجانے کیسے اسے آٹھ برس کی عمر میں سکول بھیجا تھا اس سے پیشتر وہ ایک پرائیویٹ عربی جماعت میں صرف زبان اور قران سیکھتی رہی۔ اگرچہ جرمنی کے پرائمری سکول میں چھ برس کے بچے کو بھیجنا قانونی فرض تھا۔ عظیمہ کہتی کہ میرے ابا مجھے آگے پڑھنے کے لیے جمنازیم نہیں بھیجیں گے۔ ان کا خواب ہے کہ میں واپس اپنے ملک جا کر عربی پڑھ کر اسلامی تعلیم حاصل کر کے واپس آؤں۔

عظیمہ کی دسویں سالگرہ پر مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ میں اس وقت آٹھ برس کی تھی اور اس کی تیرہ سہیلیوں کے درمیان واحد جرمن لڑکی تھی۔ اس کمرے میں تیرہ خوبصورت چہرے، سکارف سے حسین بالوں کو ڈھانپے، مزے سے گپ شپ لگاتے چہرے، میں اس کمرے میں اقلیت اور غیر ملکی چہرہ تھی۔

ان بچیوں کے والدین آپس میں دوست تھے اور جمعہ کی نماز کے لیے ملتے۔ مہینے میں ایک مرتبہ کسی کے گھر رات کا کھانا کھایا جاتا۔ وہ اپنی زبان تہذیب اور مذہب کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔ جرمنی کے اندر ایک کمرے میں ایک ننھا سا معصوم عراق سانس لے رہا تھا۔ ان کے قہقہے کتنے رشک انگیز تھے۔ مجھے ان سے مل کر بہت لطف آیا۔

ان میں سے ایک لڑکی کی ماں جرمن تھی جس نے اسلام قبول کیا تھا۔ اس کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ اس کے باپ کو بھی بہت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا کیونکہ اس نے ایک کافر عورت کو مسلمان کر کے اس سے شادی کر لی تھی۔ ان سب کے درمیان بے تکلفی، دوستی اور ثقافتی ہم رنگی کو میں نے بہت دلچسپی سے دیکھا۔

سکول میں عظیمہ کتنا ہنستی تھی، بات بات پر اسے ہنسی آتی تھی اور جب بھی وہ ہنستی فوراً منہ پر ہاتھ رکھ کر ادھر ادھر دیکھتی پھر ہلکے سے کہتی، لڑکیاں نہیں ہنستیں۔ عظیمہ کا شمار خوش باش اور محنتی طالبات میں ہوتا تھا۔ وہ سب سے گھل مل کر رہنے والی لڑکی تھی۔ جماعت کی ذہین ترین لڑکیوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ وہ جرمن زبان میں مضامین لکھنے، نظموں کا تجزیہ کرنے اور گروپوں کی پریزنٹیشن دینے میں بہترین مانی جاتی تھی۔ وہ لسانی طور پر غیر معمولی ذہانت کی مالک تھی۔

نویں کلاس میں آ کر وہ یک دم بدل گئی۔ تفریح میں وہ ہمارے گروپ سے غائب ہو جاتی اس کی خوبصورت آنکھوں میں کھل کی دھار مسکرانے لگی۔ پھر ایک دن میں نے اسے دسویں جماعت میں مائیکل کے ساتھ بیٹھے دیکھ لیا۔ دونوں مرکزی عمارت کے پیچھے سبز درختوں کے جھنڈ میں چھپے بینچ پر بیٹھے تھے۔ مائکل کا ہاتھ اس کی کمر پر تھا۔ عظیمہ کو میں نے اس کی سکارف سے پہچانا۔

میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ میں الٹے قدموں واپس لوٹ آئی۔ اگلے دو دن مجھے یہ فیصلہ کرنے کی ادھیڑبن میں لگے کہ عظیمہ سے بات کروں یا نہ کروں۔ صبح وہ

بالکل معمول کی طرح آئی اور ہم گپ شپ لگاتے اسکول چل دیے۔ گھر سے ہم اکٹھے ہی نکلتی تھیں لیکن ہماری واپسی کے اوقات مختلف ہوتے تھے۔

پھر ایک دن ان دونوں سے میرا ٹکراؤ ہو گیا۔ مائیکل کے ہاتھ میں اسٹرابری کا ڈبہ تھا اور وہ عظیمہ کو ایک ایک کر کے اسٹرابری کھلا رہا تھا۔ عظیمہ نے مجھے بتا دیا کہ وہ مائکل سے شادی کرے گی۔ مائکل اس کی خاطر مسلمان ہو جائے گا۔ چھوٹے سے سکول میں یہ قصہ راز کیسے رہ سکتا تھا۔

گو بات اب راز نہیں رہی تھی۔ لیکن بات اتنی بڑھ جائے گی کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ عظیمہ اور مائکل کی یہ داستان صرف میں ہی نہیں جانتی تھی یہ کہانی اس کے باپ تک بھی جا پہنچی تھی۔

اسی ہفتے کے اختتام پر میں اتوار کی شام کو صوفے پر پاؤں رکھے، چپس کھاتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہی تھی جب دروازے کی گھنٹی بجی۔

تھوڑی دیر بعد میرا باپ سفید چہرے کے ساتھ میرے کمرے میں بغیر دستک دیے داخل ہوا۔ ہمارے گھر پولیس آئی تھی۔ پچھلے جمعہ کو کسی نے عظیمہ کو قتل کر کے جنگل کی جھیل میں پھینک دیا تھا۔ میں چیخ پڑی، لیکن عظیمہ تو چھٹیوں پر عراق گئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے ابا مائکل کو خود مسلمان کریں گے۔ وہ عراق سے روایتی لباس اور تحائف لے کر آئے گی۔ جھگڑے والی تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اگر وہ کوئی خطرہ محسوس کرتی تو مجھے بتاتی، پولیس سے کہتی۔

"تمھیں جو بھی علم ہے، سب بتا دو، ہر بات پولیس کو بتا دو چھوٹی سے چھوٹی معمولی سے معمولی بات" میرے باپ نے میری شانے پر ہاتھ پھیلا دیا۔

پولیس سکول کے بچوں سے تفتیش کرنے آ رہی تھی۔ مائکل کے گھر پولیس نے جیسے ڈیرے ڈال دیے تھے۔ اس کی حالت پاگلوں جیسی ہو چکی تھی۔ پولیس اس سے مسلسل سوالات کرتی رہتی۔ اس کا باپ ایک پلمبر تھا اور ماں قریبی کنڈر گارٹن میں کام کرتی تھی۔ وہ روتی رہتی کہ میرے بیٹے کو یہی مسلمان لڑکی ملی، کتنا منع کرتے تھے کہ اس کو یوں چھپ چھپ کر دیکھنے مت جایا کرو۔

عظیمہ کے آخری دیدار کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سکول کے اساتذہ اور ہماری جماعت اسے دیکھنے مردہ خانے جا سکتے تھے۔ مردہ خانہ میرے لیے بے حد خوفناک لفظ تھا۔ میری ماں بھی اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن کاش ہم کبھی نہ دیکھنے جاتے۔ اس کا آخری دیدار ہی میری زندگی کا دہشت ناک خواب بن گیا۔

اس کا گلہ کاٹ کر قتل کیا گیا تھا۔ نیلے ہونٹ، متورم آنکھیں، سر سے خوبصورت رنگوں والا سکارف چھن چکا تھا جیسے کسی نے سزا کے طور پر اس کے سر سے عزت کی دستار اتار لی ہو۔ اس کے گلے پر یاقوت کی لڑی جیسی

سرخ رنگ کی باریک لکیر تھی۔

ابھی عظیمہ کے قتل کی تفتیش چل ہی رہی تھی کہ ایک صبح سکول کے عقب میں ایک درخت سے جھولتی مائکل کی لاش ملی۔ ان ہی درختوں کے جھنڈ میں جہاں وہ دونوں بیٹھا کرتے تھے۔ یقیناً کسی نے انھیں وہاں ملتے دیکھ لیا ہوگا۔ سکول میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی تھی۔

مجھے ایک شام کو بیٹھے بیٹھے جسم میں شدید درد اور دل کے ڈوبنے کی کیفیت لاحق ہوئی، شاید میں چیختی جا رہی تھی۔ ہر روز صبح اٹھتے ہی ڈر سے دل کی دھڑکن تیز ہونا تو عظیمہ کے قتل کے بعد سے ہی معمول تھا۔ لیکن یہ دورہ اتنا شدید تھا کہ مجھے ہسپتال بھیج دیا گیا۔ خوف کے شدید دورے کے بعد میری طبیعت جب سنبھلی تو مجھے میرے ماں باپ کا وحشت زدہ چہرہ دکھائی دیتا۔ کبھی بینچ پر بیٹھی ہم آغوش مائیکل اور عظیمہ کی کمر نظر آتی۔ کبھی عظیمہ کی وحشت بھری آنکھیں، نیلے ہونٹ، کبھی مائیکل کی درخت سے لٹکی ہوئی لاش جو اگرچہ میں نے خود نہیں دیکھی تھی لیکن نجانے کیسے میرے ذہن میں ابھرتی رہتی۔

پولیس نے بہت جلد سارے کیس کو حل کر لیا۔ عظیمہ کے باپ کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ عظیمہ کو عبرتناک سزا دیتے ہوئے اسے ورغلانے والے کو بھی سبق سکھایا گیا۔ عظیمہ کے باپ نے بے تاثر لہجے میں جرم قبول کیا۔ میری بچی کسی جرمن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھ سکتی۔ سب مسلمانوں کو سیکھنا چاہیے کہ یہ طریقہ نہیں چلے گا۔

میرے باپ کی نیلی آنکھوں میں غصے اور نفرت کی آگ کے لال ڈورے تیرنے لگے۔ ایک مرتبہ میں نے ابا کو چھپ کر روتے دیکھا۔ انھوں نے عظیمہ کا مگ سینے سے لگا رکھا تھا۔ عظیمہ نے ابا کو کئی مرتبہ تصویریں بنا کر اور رنگ بھر کر دی تھیں۔ ابا نے انھیں فریم کروا لیا تھا۔

ابا نے ہمیشہ رضاکارانہ طور پر مظلوم عورتوں کے مقدمات لڑے تھے۔ ایک مرتبہ ابا کو میونخ میں عورتوں کے دارالامان کے مقدمے کے لیے بلایا گیا تو انھیں کتنی ہی نئی کہانیاں سننے کو ملیں۔ عظیمہ کے قتل کے بعد ابا کو یہ کام کرنے کا جنون ہو گیا تھا۔

وہ آنر کلنگ اور کثیر الثقافتی معاشرے کے مقدمات کو سمجھنے والے سب سے بڑے وکیل تھے۔

ابا کی اسی شہرت اور کامیاب مقدمات کے لیے انھیں ثقافت کی وزارت سے بھی کام کرنے کی پیشکش ہوتی تھی۔ ابا کو منسٹری آف فیملی افیئرز کے کثیر الثقافتی پروجیکٹ کا سربراہ بنا دیا گیا۔ غیر ملکی عورتوں پر گھریلو تشدد اور گلاس سیلنگ کی تعمیر کرنے کا ڈیٹا جمع کرنے میں بھی پیش پیش بھی تھے۔

میرے ابا غیر ملکیوں کے لیے سخت قوانین بنانے کے حامی بن گئے تھے۔ جرمنی میں مقیم بچوں کو جلد

شادیوں اور ان کے شوہر یا بیویوں کو ویزے دینے کے لیے قوانین میں سختی کی تجاویز بھی دیتے۔

ان دنوں ریڈیو پروگراموں میں بھی ابا کو بلایا جاتا۔ ابا کا لہجہ مستحکم تر ہوتا چلا گیا۔ "یہ ہمارا ملک ہے اور یہاں ان لوگوں کو عزت کے نام پر معصوم بچیوں کے خواب اور زندگی چھیننے کی اجازت نہیں دی جا سکتی"۔

دو معاشرتوں میں مل تب تعمیر ہوں گے جب دونوں تہذیبیں ایک دوسرے کے معاشرے کو سمجھیں۔ ایک دوسرے کا احترام کریں۔ یک طرفہ سڑک کب تک چلے گی؟ ابا کا موقف واضح تر ہوتا گیا۔

پھر ایک دن کسی نے میری بلی کو مار کر دروازے کے سامنے ڈال دیا۔ میں چیخ چیخ کر روتی رہی۔ ابا رات کو میرے سرہانے بیٹھے رہے۔ میری حالت دیکھ کر ان کی آنکھوں کی روشنی بجھنے لگی تھی۔

اس شہر کو کیا ہو گیا، بھوتوں کا شہر بن گیا ہے یہ، میری ڈپریشن کی ماری ماں میرے بابا کو باہر نہیں جانے دیتی تھی، بعد میں علم ہوا کہ ابا کو دھمکیوں بھرے خط ملتے تھے۔

پھر وہی ہوا جو کئی دن پہلے سے میری ماں کے دہشت بھرے خوابوں میں دکھائی دے رہا تھا۔ ابا کو کسی نے عدالت سے نکل کر کار تک جاتے ہوئے سر کے پیچھے گولی مار دی تھی۔ میرا ہوش و خرد کی دنیا سے ناطہ ٹوٹ گیا۔

پھر ہم میونخ سے برلن منتقل ہو گئے۔ میری نانی بھی ہمارے ساتھ رہنے آ گئی۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں ہم تین عورتیں، دو ماؤں اور دو بیٹیوں کے رشتے سے بندھی ہوئی تین بے بس عورتیں بے دلی سے جینے لگیں۔

لیکن شاید نہیں۔ میری نانی انتہائی سخت جان عورت تھی۔ اس نے جنگ عظیم دوم کے شعلوں کی تپش سینک کر رکھی تھی۔ نانی نے جنگ کے دنوں میں فاقوں کا ذائقہ چکھ رکھا تھا۔ بھاری بوٹوں کی دھمک سن رکھی تھی۔ نانی نے سخت سردیوں میں کھیتوں سے سبزیوں کی جڑیں اکھیڑنے کی مشقت جھیل رکھی تھی۔

"ایک کھیت کی گوڈی کر کے جڑیں نکالنے کے بعد ہاتھ سُن ہو جاتے تھے، پھر سردی نہیں لگتی تھی، پھر ہاتھ مشین کی طرح کام کرنے لگتے تھے"

نانی یوں کہانی سناتیں جیسے جگ بیتی سنا رہی ہوں۔

نانی مجھے اپنی نانی کی کہانی سناتی تھیں جو کھیتوں میں بیل کے ساتھ برابر کی مزدوری کرتی تھیں۔ نانی کا زمانہ جرمنی میں خوف و ہراس کا دور بھی تھا۔ نانی نے یہودیوں کو پیلے بیج باندھے اچھوتوں کی طرح سڑکوں پہ گھومتے دیکھ رکھا تھا۔ انھیں گھروں سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ طاقت کا تسلط بھی تو کرونا وبا جیسا ہی تو ہوتا ہے۔ انسانوں کو محبوس اور محدود کر دیتا ہے۔

آج نانی ہوتی تو وہ بتاتی کہ کرونا نے ساری دنیا کو مساوات سکھا دی ہے۔ میری بوڑھی نانی آسانی

سے ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں تھیں۔

"کوئی حادثہ اتنا سخت نہیں ہوتا کہ وہ زندگی کے قدم روک دے"

،نانی کہتیں، زندگی کی پہیہ پہل پیری چلتی رہتی ہے۔

نانی نے اپنی بیٹی اور اس کی بیٹی کی بیٹی کو اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا۔

"مذہبی جنونیوں کے ساتھ جنگ دنیا کی مہلک ترین جنگ ہے" میری تقریباً ناخواندہ نانی کسی بڑے فلاسفر کی طرح کہتی۔ اپنے سفید بالوں میں کنگھی پھیرتے ہوئے کہانیاں مجھے سناتیں۔ ابا کے دل دہلانے والے مقدموں کو سن کر میرے اندر کی قصہ گو کے بیان میں جو تلخی بھر گئی تھی وہ نانی کی سنائی داستانوں نے حوصلے میں بدل دی۔

نانی اپنی آرام کرسی پر جھولتے ہوئے میری بے ترتیب باتوں کو غور سے سنتی تھیں۔ کبھی میری ماں سے ابا کے بارے میں بار بار کی سنی تفصیل سنتی۔ ماں کبھی روتی کبھی ہنستی، کبھی ان منحوس قاتلوں کو برا بھلا کہتی جنھوں نے ابا پر گولی چلائی تھی۔

"ہمارے قوانین پسند نہیں تو گھر جاؤ مرو"

میری نانی نسل پرستوں کے انداز میں ہاتھوں سے دفع ہو جاؤ کے اشارے کرتے ہوئے کہتی۔

کبھی نانی اور میری ماں مل کر پرانا جرمن فوک گیت گانے لگتیں، ماں بھاگ کر ایک بالٹی اٹھالاتی، اور دونوں ناچتے ہوئے بالٹی کا سوراخ مرمت کرنے کی تدابیر کرتیں۔

Ein Loch ist im Eimer

اے ہول ان دی بوکٹ، میری بالٹی میں سوراخ ہے، بتالیزا میں کیا کروں"

میری اماں بالٹی کو الٹا کر کے لہراتی ہوئی گاتی جاتی۔ اور نانی لیزا بن کر اسے مرمت کے طریقے بتاتی ہے

"بالٹی کی مرمت کے لیے اسے گھاس پھونس کی ضرورت ہے۔

ماں مکالے کا شعر گاتی۔

وہ گھاس پھونس لانے کے لیے پھر اسے کلہاڑی کی ضرورت ہے۔

کلہاڑی تیز کرنے کے لیے اسے پتھر کو پانی میں بھگونا ہوگا لیکن پانی کہاں سے آئے۔ اور سوال پھر وہیں آجاتا ہے کہ اب ندی سے پانی بھر کر لانے کے لیے بالٹی کی مرمت کیسے کی جائے۔

میں تماش بین کی صورت دونوں کو بالٹی تھامے گاتے اور ناچتے دیکھتی رہتی۔ اماں اور نانی کہتیں

میں عورتیں کے کلکی ڈالتے ہوئے روایتی گانے گاتیں۔ نانی کے آنے سے گھر میں گیت گونجتے رہتے۔ نانی نے اپنی نانی سے جو گیت سن رکھے تھے وہ سناتی رہتیں۔ قدیم زمانوں میں ہماری نانیاں دادیاں ہی وہ ماہر نفسیات تھیں جو تحلیل نفسی کے تجزیے کیا کرتی تھیں۔

میں نے اس کی بوڑھی اور سرمئی رنگ کی آنکھوں میں شام اترتے کبھی نہیں دیکھی۔ ان میں عزم کی چنگاریاں دہکتی تھیں۔ اٹھاسی سال کی بوڑھی نانی۔ پرانے جرمن کھانے بناتے ہوئے میری نانی مجھے برتھا بینز کی کہانی سناتی جس نے پہلی گاڑی چلائی۔ یہی کہانی سن کر میری ماں بڑی ہوئی تھی۔

"جانتی ہو وہ اپنے دو بیٹوں کو لے کر شوہر کو بتائے بغیر گھر سے نکلی اور گاڑی کو ٹیسٹ کر کے آئی۔ برتھا بینز کے شوہر کال بینز نے گاڑی بنائی تھی، نانی آواز میں سنسنی بھر کر کہتیں۔

اور برتھا بینز نے پہلی گاڑی بنانے کے لیے اپنا جہیز اور زیور بیچ دیا تھا"۔

نانی ہمیں پرانی جرمن عورتوں کی مشقت بھری داستانیں سناتی میری نانی واقعی پریوں کی دنیا کی رانی تھی۔ میرے دو ماموں جوانی میں ہی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ ایک کو بس کا حادثہ کھا گیا اور دوسرے کو سرطان کا مرض۔

"میری بیٹی کو تیرا باپ لے گیا"۔ وہ ہلکے سے مسکراتیں۔ میں نے کیرول سے کہا جہاں وہ کہتا ہے بس وہیں رہو، اور اکٹھے رہو۔

اور نانا"؟ میں نے محتاط انداز میں پوچھا۔

لو، نانا کیا، ارے ہمارے زمانے میں بھی مردوں کو فیصلے کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔ ریٹا مجھ سے زیادہ حسین تھی، جوان تھی، اس کا کھیت بھی تمہارے نانا کے کھیت سے بڑا تھا، اس کے مرحوم شوہر کی جائیداد بھی اس کے پاس تھی۔ وہ جوان، حسین مالدار بیوہ تھی۔

تمہارے نانا مجھ سے چھپ کر ملنے جاتے، میں نے کہا، جاؤ بھئی، دن کے اجالے میں ملو۔ یہاں بیٹھے بھی یہاں نہیں ہو، رسی تڑوانے کے بہانے ڈھونڈتے ہو جاؤ۔"

نانی سے اتنی صاف گوئی کی توقع نہیں تھی۔

"اور ہاں تم بھی، نانی نے میرے سر کو انگشت شہادت سے ٹھوکا دیا" تم بھی صرف اس سے شادی کرنا جو دل سے طالب ہو، کھونٹے کسی کو نہیں روک سکتے"

نانی مجھے پرانے محاورات اور لوک گیت سنانے لگتیں۔

نہ ہی کوئی عشق آخری ہوتا ہے نہ ہی تباہ کن، انسان جینا سیکھتا رہتا ہے، یہ تو بس کھیت میں اگی فصل جیسا

ہوتا ہے، بیج اچھا ہو، گوڈی ہوتی رہے، پانی ملتا رہے اور شعلہ بدن کسان جانفشانی سے کام کرے اور کھیتی باڑی کو ایمان سمجھے، تم مجھے بتا دینا جب عشق ہو جائے۔"

توبہ ہے نانی، میں نانی کے ہاتھ کا بنا بادام اور شہد کا کیک کھاتے ہوئے کہتی۔

نانی کہتی کہ ہر ملک، ہر زبان اور ہر دنیا کی عورت نے قربانیاں دی ہیں اور خسارہ کمایا ہے۔ اس کا مذہب کے ساتھ کبھی خطے کے ساتھ کبھی خطے کی زبان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ انسانوں کے ذہن کے اندر رہتا ہوا ایک جنگل ہے۔ اس جنگل کے درندے باہر نکل کر انسانوں کو کھا جاتے ہیں۔ آدم خور درندے انسان کے اپنے ذہن کے جنگل میں چھپے ہوتے ہیں"۔

میں حیران ہو کر اپنی بوڑھی نانی کا چہرہ دیکھتی۔ نانی نے اپنا گھر، جائیداد اور زیور بیچ دیا اور ہم دونوں ماں بیٹی کو اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ میں نے بھی ابا ہی کی طرح وکالت کا پیشہ اپنانا چاہا۔

دل کے اندر جلتے درد کے دیے کی روشنی اپنے پیشے سے محبت سکھاتی ہے۔ ہتھیار ڈالنے نہیں دیتی۔ جذبے مستعار نہیں لیے جاتے اماں، دل کے اندر سے درد کے آب حیات سے ان کی تخلیق کی جاتی ہے۔ ہر تخلیق پانی سے ہوتی ہے اماں، آنکھ سے ٹوٹے آنسو کا مخروطی موتی ہو ہو یا دل کے خون کی لال مدور بوند،

میں دل ہی دل میں نجانے کیا سوچتی رہی لیکن صرف اتنا کہہ پائی، میں ابا کے مقصد کو لے کر آگے بڑھنا چاہتی ہوں اماں،" تم رہنے دو یہ وکالت تمہارے بس کی بات نہیں۔ میری ماں نے انتہائی سرد انداز میں میرا ہاتھ جھٹکا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ نہیں خوف تھا۔

"ان مقدمات میں شوہر گنوا دیا میں نے۔ سنا تم نے" وہ ہسٹریائی ماری عورت کی طرح چلائی،

"سنا تم نے، تمہارا باپ یہ ڈیٹا جمع کرتا نہ یہ رپورٹ لکھتا"

گوئٹے اور جرمن شاعروں کو پڑھنے والی میری ماں کی شیریں زبان دو دھاری شمشیر بن گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے جھاگ نکلنے لگا۔ وہ بے دم ہو کر گر پڑی۔ میں نے ابا کی سٹڈی روم کا دروازہ لاک کر دیا۔

شام کو میں نے ماں کے ہاتھ پر بوسہ دیا، میں وکیل نہیں بنوں گی، میں وکیل نہیں بنوں گی ماں، میں سائیکاٹرسٹ بنوں گی"۔

ماں نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ماں جو عزم کی ایک تصویر بن کر جیتی رہیں لیکن ان کو پے در پے ہونے والے حادثات نے بستر سے لگا دیا تھا۔

میری نانی ایک عظیم عورت تھیں، وہ ماں کو بچپن کی باتیں یاد کروا کر ہنساتی رہتیں۔ نانی کو دنیا جہان کی عوامی داستانیں، عوامی گیت اور کہاوتیں یاد تھیں۔ میری ماں نے شاید نانی کی اسی تربیت کی وجہ سے زبان

وادب کے شعبے میں تعلیم حاصل کی۔

اس دن اماں کی طبیعت بہت خراب تھی۔ وہ صبح سے کمرے سے ہی نہیں نکلی تھیں۔ ہم نانی نواسی نے نانی کے ہاتھ سے بنے انڈے کے پین کیک کھائے اور کافی کے مگ لے کر بڑے کمرے میں آ بیٹھیں۔ نانی نے حسب معمول کچھ نیا ہی سنانے کی کوشش کی۔

"جب خدا سخت روٹی دیتا ہے تو دانت بھی مضبوط دیتا ہے" نانی نے اپنی نانی سے سنا ہوا محاورہ سنایا۔ نانی مکمل طور پر ناخواندہ تھیں لیکن انھیں ان گنت قصے، ضرب الامثال، لوک گیت اور محاورات یاد تھے۔

'یہ تمھاری ماں کیا کمرے میں گھسی بیٹھی ہے، اتنی چمکیلی دھوپ اور تین عورتیں، پھر خاموشی، کیا فضول بات ہے،

جانتی ہو، ہمارے زمانے میں کہتے تھے،" تین عورتیں، تین قاز، اور تین مینڈک مل جائیں تو میلہ" یہ کیا بات ہوئی نانی، میں بگڑ کر کہتی، یہ قاز کیا ہوا، بطخ؟

نہیں، نانی کی ہنسی چھوٹ جاتی،

" قاز، بڑی بطخ یعنی چھوٹی بطخ کم قیں قیں کرتی ہے، جب کہ بڑی بطخ ہوتی ہے جس کی آواز بھی بلند ہوتی ہے۔

" جیسے راج ہنس؟ میری تفتیش جاری رہی۔

" نہیں وہ تو بہت خوبصورت ہوتا ہے"

اچانک میری ماں کی آواز آئی، وہ نجانے کب اپنے کمرے سے نکل کر نشست گاہ میں آ گئی تھیں۔" راج ہنس کی گردن لمبی اور چمکتا سفید، اس کا استعارہ تو مردوں کے لیے استعمال کرتے ہیں" اماں نے نانی کے پاس صوفے پر جگہ بنائی۔

" بطخیں، بھیڑیں، بھڑیں بکریاں، طوطیاں، چڑیاں، اور مینڈکیاں تو عورتوں کے باتونی ہونے پر طنز ہے" میری ماں بھی ہنسی میں شامل ہو جاتی اور یہ تین مینڈک؟ نانی مینڈک کا اور عورتوں کا کیا تعلق؟ میری ناراضگی میں تجسس بھی شامل ہو گیا۔

نانی کی شریر آنکھیں جھریوں اور عینک کے شیشے کے درمیان سے چمکتیں، ہنستیں اور پھر سنجیدہ ہو جاتیں،

" اس کا مطلب تین مینڈکیاں ہو گا، اچھا اس محاورے کو یوں تبدیل کر لو" تین عورتیں، تین قازیں، تین مینڈکیاں مل جائیں تو میلہ"

نہیں نانی، میں بگڑ جاتی، لغت میں کیوں نہیں ہے یہ محاورہ"

اس لیے کہ تم لوگ علم لغت سے ڈھونڈتے ہو، ہم زندگی کی باگ پکڑ کر حاصل کرتے ہیں۔اچھا چھوڑو، نانی نے اون سلایاں میز پر رکھیں۔

"یہ محاورہ ہم تینوں پر پورا اترتا ہے، مردوں کو خوش ہو لینے دو، بے چارے ان ہی بلخوں اور مینڈکیوں کی قیں قیں اور ٹرٹر کی دھن پر ناچتے بھی ہیں"۔

نانی نے شاید میری دلجوئی کی، آرام کرسی کا بازو پکڑ کر باہر کو نکلیں،" آؤ ناچیں۔

"تین عورتیں، تین قازیں، تین مینڈکیاں مل جائیں تو میلہ"

زندگی کی بالٹی میں سوراخ ہو جائے تو وہ قطرہ قطرہ ٹپکتی ہی رہتی ہے۔ندی سے پانی بھر کر لانے تک سارا سفر لا حاصل ہو جاتا تھا۔میں نے نانی کی طرح رقص کرتے ہوئے زندگی کی بالٹی ہی بدل لی۔

اپنے باپ کی طرح میں نے بھی ذو ثقافتی معاشرے کے اسرار کو ہی جاننا چاہا۔میں نے بائی کلچرلزم کی نفسیات میں بہت نام کمایا۔میں اپنے خوف کے درندے کو جرات کا لال کپڑا دکھا کر مشتعل کر کے زیر کر چکی تھی۔میں پوری جرات کے ساتھ ان مقدمات کا مطالعہ کرتی۔متاثرہ افراد سے ملتی۔

میرے سامنے چند فائلیں بے ترتیبی سے کھلی پڑی تھیں۔

ایک رپورٹ نے مغرب کے دل، برلن میں لڑکی اور عورتوں کے متعلق حقائق اکٹھے کیے جس نے مغربی دنیا کے ہوش اڑا دیے۔چار مہینوں میں چھ مسلمان لڑکیوں کے قتل پر پورا جرمنی بلبلا اٹھا۔اشتعال اور خوف کے درمیان اخبارات چیخ رہے تھے۔

آج میری میز پر، ساٹھ سال کی ایک عورت کے سامنے ایک رپورٹ پڑی ہے جس میں پورے یورپ میں عورتوں کے قتل کا شماریات ڈیٹا اور رپورٹ درج ہے۔جرمنی، فرانس، برطانیہ، اٹلی، سپین ہر جگہ عورتوں کے قتل ہوش اڑا دینے والے شماریات موجود ہیں۔

شیشے کی چھت توڑنے والی عورتوں کو کانچ کے فرش پر چلنا پڑتا ہے۔میں نے ان 147 عورتوں کے چہرے نہیں دیکھے لیکن میرے خوابوں کے پردے پر یہ سب چہرے ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں۔وبا کے سال پرانے دنوں نے اس شماریاتی ڈیٹا میں تیزی سے اضافہ کیا ہے۔

عظیمہ کا چہرہ ایک مرتبہ پھر میرے ذہن کے پردے پر جی اٹھا۔

ضعیفی کی حد کو پہنچ گیا ایک بے بس وجود ہسپتال کی سفید چادر پر پڑا تھا۔شوگر کی وجہ سے اس کے

پاؤں کاٹے جا چکے تھے۔

اس کی آخری خواہش تھی کہ ہسپتال میں ایک امام کا بندوبست کیا جائے جو اس کے لیے دعا کرے۔ وہ اپنے لیے قبر کی جگہ خریدنے کا بندوبست کر رہا تھا۔ اپنے بچوں کے ذکر پر اس کی گدلائی ہوئی آنکھوں سے آنسو نکلتے اور اس کی سفید داڑھی میں گم ہو جاتے۔

جولائی کی طویل دوپہر کو اس کے ساتھ ایک ملاقات تھی۔ سب سے بڑی اذیت یہ تھی کہ وہ جرمن زبان نہیں بول سکتا تھا۔ اگرچہ ترجمان اس کے آنسو اور ہچکیوں کا ترجمہ نہیں کر سکتا تھا لیکن یہ زبان آفاقی زبان ہے۔

موت کے بے آواز قدموں کی دھمک ہوتی ہے جو صرف مرنے والا سن سکتا۔ وہ روتا رہا پچھتاوے روتے رہے۔ شاید توقعات بین کر رہی تھیں۔ اسے اپنی اولاد کی بے حسی رلا رہی تھی شاید۔ جوان اولاد جسے خود بھی چند دہائیوں کے بعد اسی ہسپتال کی سنگ دیواروں میں محبوس ہونا تھا۔ اس سے لاتعلق تھی۔

میں اس کی زبان نہیں سمجھ سکتی تھی۔ ترجمان سر جھکائے بیٹھا تھا۔ بوڑھے کی ہچکیاں اپنا مقدمہ خود سنا رہی تھیں۔ وہ سرسبز کھیتوں کھلیانوں اور گاؤں کے ہرے بھرے راستے چھوڑ کر یہاں آیا تھا۔

اسی گاؤں سے وہ ایک بیوی لایا جو ذہنی مریضہ تھی۔ گاؤں کے رواج کے مطابق اسے اپنے چچا کی بیٹی سے ہی شادی کرنی تھی۔ اس کے ساتھ گزارہ کرتا رہا۔ پھر ایک دن اس عورت نے خودکشی کر لی۔ بچے برباد ہو گئے۔ شاید ماں کے ذہنی خلل کا اثر اولاد میں بھی آیا تھا۔

میں نے رپورٹ مکمل کی اور اپنے اخراجات پر اس کے خط کا ترجمہ کروانے کے لیے بھیجا۔ اس کی بیٹی سے بات کرنے کا فیصلہ بھی میرا اپنا تھا۔ یہ نہ تو میرے پیشے کا حصہ تھا اور نہ ہی میری ملازمت کا تقاضا تھا۔

میری ماں سچ کہتی تھی عظیمہ کے قتل کا زہریلا سنپولیہ میرے دماغ کی کھپا میں سو رہا تھا۔ وہ مرا نہیں تھا بس میری قوتِ ارادی کی برف باری میں نیم مردہ ہو کر پڑ جاتا۔

میں نے ہمیشہ عورت کی شکستگی کی داستانیں رقم کی تھیں۔ عورت کے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر تہارہ جانے والا یہ بوڑھا ایک مختلف کردار تھا۔ روایتی پدرسالاری دنیا سے ہٹ کر ایک مظلوم ترجمان۔ یہ مقدمہ مختلف تھا۔ میں نے اس کی پیروی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے ہسپتال کے بستر پر پڑے اس مظلوم بوڑھے کی بیٹی کو کھوج نکالنے کا ارادہ بھی کر لیا۔

میرے سامنے اس کے باپ کے بیان کا ترجمہ شدہ خط پڑا تھا جس میں اپنے کلچر کی جڑیں کھودتے

ہوئے اس نے لکھا تھا کہ اس کے گھر مسلسل چھ بیٹیاں ہوئیں. اس نے سب کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ اب اس کی اپنی بیٹی غدار سول اور کلچر کی پروا کیے بغیر گورے کے ساتھ بھاگ گئی۔ چھ بچیوں کا باپ اور ایک ذہنی مریضہ کا شوہر ہسپتال کی سوگ بھری فضا میں آخری سانس لے رہا تھا۔

"میں زندہ درگور ہوں"۔ اس کا آخری جملہ تھا۔

میں نے اپنے سامنے بیٹھی اس بے پناہ حسین لڑکی کو دیکھا۔

وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے سکون سے میری بات سن رہی تھی۔

"میں چھٹی بیٹی ہوں"۔ اس نے انتہائی مہذب ناگواری سے میری بات مکمل ہونے تک سنی، اور اسی سکون سے سرد لہجے میں بولی۔

"یہ جو جرمن زبان میں خط تمہارے سامنے پڑا ہے نا، یہ میری ای میل میں بھی موجود ہے۔" اس نے میرے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور کھڑکی کے پار جھانکا۔ کھڑکی کے بڑے شیشے سے مسلسل گرتی برف نظر آ رہی تھی۔ یقیناً بظاہر مضبوط لڑکی اندر گرتے اشکوں کو دبانے کا مختصر وقفہ لے رہی تھی۔

"ہر سال میری ماں اس شخص کو وارث لا کر دینے کے لیے اپنے جسم میں خود اپنی موت کی پرورش کرتی"۔ اس نے جھٹکے سے اپنے بال ہٹائے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

جدید ترین مغربی لباس میں ملبوس وہ پرانی تصویر دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ غم اور پچھتاوے کی پرچھائیاں نہیں تھیں بلکہ ایک ہموار سے غصے کی فاتح جھلک تھی۔ یقیناً وہ اپنی ذات کی پرتیں ہٹانے کو تیار تھی۔

"میں الٹرا ساؤنڈ کی چغل خور مشین کی ایجاد سے پہلے پیدا ہو گئی"۔ وہ اپنی بات پہ خود ہی ہلکا سا مسکرائی، "ورنہ میں اپنی ساتویں اور آٹھویں بہن کی طرح اپنی ماں کے پیٹ میں نمک کا ٹیکہ لگنے سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتی"۔

"میرا باپ خط میں لکھنا بھول گیا کہ اس نے گاؤں جا کر اپنی ماں کے حکم پہ مزید تین شادیاں کی تھیں لیکن بے چارا بے اولاد رہا۔ یورپ میں مشرقی کلچر کی تفہیم کی دوڑ جاری ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے اپنا قدیم کلچر دیکھ لیں۔

دادی ابا کی بیوی لاتی۔ گاؤں کے غریب اسی بات پہ خوش ہو جاتے کہ بیٹی پکے مکان میں رہے گی، پیٹ بھر کر کھائے گی۔ دادی کو سونے کی چار چوڑیوں اور حق مہر کے عوض ایک خدمت گار مل جاتی۔ ابا کے پھیرے

ڈالنے کے بعد بھی اگر کسی خوش خبری کا ظہور نہ ہوتا تو دادی اسے باپ کے گھر بھیج دیتی۔ دادی کو اپنے کھیتوں کھلیانوں کا وارث چاہیے تھا لیکن اس کی بہوئیں تو سبز قدم نکلی تھیں۔

یکے بعد دیگرے پندرہ سالوں میں ابا نے تین منحوس عورتوں سے وارث پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں سے اولاد مقدر میں نہیں تھی البتہ اپنی منحوس بیٹیوں کے ناقص بیج میری ماں کی کھیتی میں بو دیتا"۔

ابا بھی دادی کے حکم کے مطابق بیاہ کرتا۔ حیران مت ہونا بڑے سے بڑا مرد بھی گھریلو سیاست میں اپنی اماں کا غلام ہی ہوتا ہے اور اس کی اماں سماجی نظام کے جبر کی چکی میں پستی ہوئی وہ بے بس لڑکی جو خود بھی ظالم کا روپ دھار لیتی ہے۔ تم تو نفسیات دان ہو نا مظلوم اکثر ظالم بنتا ہے۔"

اس نے اب میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ اس کا یہ انداز میرے لیے نیا تھا۔ عموماً ایسے گھرانوں کے بچے مخاطب کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہیں لیکن یہ لڑکی بے باکی سے مخاطب کو تولنے اور اعتماد سے بولنے کی جرات رکھتی تھی۔ جیسے کسی اور کی کہانی کی ایک راوی ہو۔

مشرقی کلچر میں کل کے مظلوم، آج کی ظالم عورت کی جنگ اپنے دور کی مظلوم عورت سے رہتی ہے۔ عورت کو یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ اس جنگ میں اس کا اپنا پیادہ پٹ رہا ہے۔ اس کا بیٹا ذہنی اور جذباتی طور پر دو خانوں میں بٹ رہا ہے۔ شخصیت ٹوٹ جاتی ہے۔ ماں اس کے پیر سے بندھی رسی کی گرہ کھولنے کو تیار نہیں ہوتی۔ بیوی کے آنچل کی گرہ سے وہ بندھنے نہیں دیتی۔ جہاں بیوی کا پلو گانٹھ باندھ لے اس کا پلڑہ بھاری ہو جاتا ہے۔ وہ اماں کی باندھی سانپ نماری کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

میں نے احتیاطاً اپنے ٹیپ ریکارڈر کی طرف دیکھا، مجھے خدشہ ہونے لگا کہیں اس کا کہا کوئی حرف ضائع نہ ہو جائے۔ جدید ترین آلہ وفاداری سے ہر لفظ سینے میں محفوظ کر رہا تھا۔ جرمنی کی فضاؤں میں پلی بڑھی یہ لڑکی جو مجھ سے کہیں زیادہ خوفناک واقعات کی چشم دید گواہ تھی کسی ماہر سماجیات کی طرح انتہائی سادہ اور بے ضرر انداز میں اپنے نسائی کلچر کے الجھے ہوئے ریشم کو ایک سادہ سفید دھاگے کی طرح کھولتی جا رہی تھی۔

اس نے میرے ٹیپ ریکارڈر اور خط کو استہزائی نظروں سے دیکھا، عورت اور مرد، میاں بیوی، بلکہ عورت اور عورت کے درمیان بندھی یہ گرہیں کھلنے میں بہت وقت لگے گا۔ غیر ملکی سرزمین پر تو یہ گرہیں سکندر اعظم کی گرہیں ہیں۔ کیونکہ یہاں گھر کے اندر مشرق بستا ہے بلکہ نصف صدی پہلے کا وہ معاشرہ سانس لیتا ہے جو اماں ابا چھوڑ کر یہاں آتے ہیں۔ خود ان کو بھی علم نہیں ہوتا کہ زمانہ قیامت کی چال چل چکا ہے۔ خود ان کا اپنا معاشرہ اس نقطے سے کہیں آگے جا چکا ہے۔ گھر کے بیرونی دروازے سے نکلتے ہی ہمیں ایک اور دنیا خوش آمدید کہتی ہے"

وہ لاشعوری طور پر صیغہ متکلم میں بات کرنے لگی۔ "ہمیں" کہہ کر وہ جگ بیتی کے دائرے سے نکل کر

تن بیٹی کی دنیا میں آ گئی تھی۔

اس دنیا میں چبھتی نگاہوں اور ڈنک مارتی زبانوں کو ہم نے جواب دینا ہوتا ہے۔ مسجد میں بیٹھے ابا یا سیل پر سے حلال مرغیاں اور ادرک کی گولیاں خریدتی ہماری ماؤں کو اس اذیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ہمیں گورا یا گوری بننے کے طعنے دیے جاتے۔ ہمیں وہ کلچر اور مذہب سکھانے کی کوشش کی جاتی ہے جسے ہمارے ابا بھی اپنے زمانے میں بھول چکے تھے۔ نافرمان اولاد کو واپس وطن بھیج دیا جاتا جو ان کا وطن تھا اولاد کے لیے خوفناک پردیس۔

میری دو بہنیں اسی کالے پانی میں قید ہیں۔ ابا کا خیال تھا ان کا یہی علاج تھا کہ انھیں پس ماندہ ماحول میں رکھا جائے۔ وہ سوچنے اور بولنے کی جرات نہ کر سکیں۔ ان کا وجود معدوم ہو جائے۔ خود ابا پیسہ کمانے کے لیے یہیں رہ گئے۔ پیسہ مشترکہ مذہب ہے۔ اس کی عبادت کے طور طریقے یکساں ہیں۔ اس کی رسومات غیر ملکی یا ملکی نہیں ہوتیں۔

بات کرتے کرتے رک کر اس نے گھڑی دیکھی۔

میں آج ہی آپ سے مکمل بات کر کے جاؤں گی مجھے دوسری مرتبہ اس موضوع پر بات کرنے کے لیے نہ بلایا جائے۔ میں انکار کر دوں گی۔ میں ماضی کا سفر دوبارہ نہیں کرنا چاہتی۔ میں اپنے حال میں خوش ہوں۔ اگر چہ میرے جرمن شوہر کے حوالے سے مجھے برا بھلا کہا جاتا ہے۔ مسلمان کیسے بغیر شادی کر لی میں نے۔ مجھے تو خود اپنی خبر نہیں ہے۔ میرے بچے کیا کریں گے ان کی شناخت کون سے مذہب سے ہوگی، مجھے علم نہیں ہے۔ ایسے حالات میں تو بچے کو دنیا میں لانا بھی نہیں چاہیے۔

مرد جرمن عورت سے شادی کرے تو اسے تمغہ دیا جاتا ہے۔ عورت جرمن مرد کا انتخاب کرلے تو اسے گالی بنا کر گلی کی طوائف قرار دیا جاتا ہے۔ اسے گلی ہی میں گولی مارنا بھی ثواب ہے۔"

میں اس کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ حال ہی میں ایک نوجوان بھائی نے اپنی انیس سال کی بہن کو اور اس کے شوہر کو سرِعام سڑک پر گولی مار دی تھی۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے چھپ کر ایک عربی ہم جماعت سے نکاح کر لیا تھا۔

"اس خط سے شدید متاثر ہو کر تم مجھے اس جاں بلب شخص سے آخری بار ملنے پر مجبور کر رہی ہو نا۔ میں نے بڑی بہنوں کی اترن پہنتے پہنتے اور ماچس کی ڈبیاں پیک کرنے والی فیکٹریوں میں ان کے کمسن ہاتھوں کی کمائی سے خریدے دودھ کے ڈبوں پر پرورش پائی ہے۔

میری ماں کا باپ بھی میرے باپ جیسا ہی تھا۔ اس نے تعلیم کی دولت کا ایک دھیلا ماں کو نہیں دیا

اور سولہ برس کی عمر میں بیاہ دیا۔ ماں کو جہیز میں گاؤں کے وسط میں تعمیر پکا مکان ملا۔ دادی کے لیے شریکوں میں سر تان کر کھڑے ہونے کا موقع تھا۔ اس کا بیٹا چوہدریوں کی بیٹی بیاہ لایا تھا۔ بیٹی جہیز میں گہنے پاتے، دو بھینسیں اور چھ بکریاں لائی تھی۔ اب وہ گاؤں کی پردھان عورتوں میں شامل ہوگئی۔ کل کی مار کھاتی اور ظلم سہتی عورت اب خود ملکہ بنی ہے اور ذہنی تشدد کے نئے قصے تحریر کرے گی۔

پہلے دو سالوں میں بڑی دو بہنیں پیدا ہوگئیں۔ نانا نے ابا کے جرمنی آنے کے انتظامات کروا دیے۔ لیکن دادی اماں اور بہنوں کو باہر کے ملک نہیں بھیجنا چاہتی تھی۔ اسے جائیداد کا وارث بھی چاہیے تھا اور بہو کے روپ میں ایک لونڈی کی بھی ضرورت تھی۔

آخر دادی کو سمجھایا گیا کہ اسے وارث پیر جی کی پھونکوں سے مل تو سکتا تھا لیکن وہ اس کا اپنا تخم نہیں ہو گا۔ وہ اسی پھونک کی پیداوار ہو گا۔ بہو کو ولائت بھیج دو۔ دادی نے بڑی بہنوں کو اپنے پاس روک کر اماں کو اکیلے بھیجنا چاہا لیکن میرے نانا سر پر شملہ رکھ کر دادا کے گھر پہنچ گئے اور بیٹی کو نواسیوں سمیت جرمنی کا دن وے ٹکٹ خرید دیا۔

اس نے میز پر پڑا خط اٹھایا، خاموش گواہ، یک طرفہ کہانی، اس کے چہرے پر استہزائی باریک جھریاں پھیل گئیں۔

"ابا نے مجھے کونے پر پڑے کچرے سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔" وہ چند لمحے رکی اور باہر گرتی برف کو دیکھا۔ برف شریر بچوں کے قہقہوں کی طرح یہاں وہاں بکھری تھی۔

"میں نے بیس برس بڑے جرمن ڈاکٹر سے صرف اس لیے شادی کر لی کہ ایک دسمبر کی مسلسل گرتی برف میں اس نے میری میز پر بھاپ اڑاتی کافی کی پیالی لا کر رکھی تھی۔ وہ تو شاید ایک غیر ملکی اور پچیس برس چھوٹی لڑکی سے شادی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی طرف دستِ طلب میں نے خود بڑھایا تھا۔ یقیناً وہ مجھے کسی دسمبر کی برف باری میں جوتوں کے بغیر گھر سے نہیں نکالے گا۔

آخر بوڑھوں کے عشق میں مبتلا ہونے والی حسین اور جوان لڑکیوں کی بھی تو کوئی نفسیات ہوگی۔ تحفظ کا احساس دل میں محبت اور بدن میں ضرورت کے بیدار ہونے سے بہت پہلے ہمکتا ہے۔ مجھ سی اترن پر پلنے والی لڑکی کو آج ایک خود مختار ڈاکٹر ہے لیکن اس کے دل کے اندر خزاں کے موسم میں برگِ آوارہ جیسی زندگی کی اذیت ڈنک مارتی رہتی ہے۔

مجھے ایسا ہی ہم سفر چاہیے تھا، مہربان، سردی کی شدت میں کافی کی گرم پیالی جیسا۔ بغیر سوال کیے خاموشی سے خود ہی ضرورت کو سمجھنے والا اور پچپن برس کی عمر میں بھی وجیہہ اور شاندار سراپے کا مالک۔ یقیناً میرا

بچہ بھی ایسی ہی جینز لے کر پیدا ہوگا۔ بائی داوے، آئی ایم پریگننٹ"

وہ فخر سے ہلکا سا مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں بھی مقناطیسیت تھی۔ دائیں جانب سے دہانہ ہلکے سے انداز میں پھیل جاتا اور رخسار پر ایک گڑھا نمودار ہو جاتا۔ دیکھنے والے کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ خیر سگالی کی مسکراہٹ ہے یا ایک طنزیہ سا تبسم۔

اس کی ذات میں ایک عجیب سی کشش تھی جو یقیناً خود آگاہی کے کڑے کوس طے کرنے کے بعد آتی ہے۔ اس نے اپنی دانست میں اپنے ثقافتی ورثے کے بوجھ کو اتار پھینکا تھا۔ اس کا راستہ شیشے کی چھت اور دیوار نہیں روک سکی تھی۔ اس نے چھت توڑ کر ٹوٹے کانچ پر چلنے کی اذیت بھری سزا کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ اس نے پورے شیشے کی دیوار بنا کر ایک کونے میں ڈال دی تھی۔

میز پر رکھے گلاس کو اٹھا کر اس نے لبوں سے لگایا۔

"ابا نے میری ماں کو شدید غصے کی حالت میں ایسے ہی ایک دسمبر میں گھر سے نکال دیا تھا۔ اس کے پاس باہر بڑے داخلی دروازے کی چابی نہیں تھی۔ ورنہ ماں پٹ کر بھی گھر سے نہیں نکلتی تھی۔ شوہر کی مار پیٹ سہنا بھی شاید مشرقی بیوی کے مقدس فرائض میں شامل تھا۔

یا پھر عورت کو دہلاتا ہو پھن لہراتا سوال، کہ آخر گھر سے قدم نکال کر پھر وہ کہاں جائے گی۔ زبان سیکھنے سے محروم رکھنا، ملازمت نہ کرنے دینا، لڑکے کی آس میں لڑکیاں پیدا کرواتے چلے جانا ایسی قفل لگی زنجیریں تھیں جن کو اس نسل کی عورت کسی حال میں نہ تو کاٹ سکتی تھی نہ ہی اس کی چابی حاصل کر سکتی تھی۔

ایک درندے کی مار کھانا اور بدسلوکی سہنا معاشرے کے بے نتھے بیلوں کی ٹکریں کھانے سے بہتر تھا۔ اماں کی اور ان کی نسل کی عورتوں کا یہ انتخاب کسی بھی مظلوم کے لیے بہترین چناؤ تھا۔ گھر میں ایک بھیڑیے کے ساتھ بسر کر لینا معاشرے کے بھونکتے کتوں سے بچنے کا بہترین طریقہ تھا۔ ماں کو بھی یہی تدبیر پسند تھی۔ آخر بچیوں کے سر پر چھت تو ہے۔

لیکن تیسری منزل کی بلندی بڑی دردناک ہوتی ہے۔ میں ایک کھڑکی کے شیشے سے ناک لگائے ماں کو دیکھتی رہی۔ وہ غسل خانے کے استعمال والے پلاسٹک کے جوتے پہنے ہوئے تھی۔

وہ دونوں ہاتھ پھیلائے، منہ اوپر کیے چیخ رہی تھی، ابا سے دروازہ کھولنے کی التجا کر رہی تھی یا شاید گھر کی چھت کی اور پناہ کی بھیک مانگ رہی تھی یا اپنی بیٹیوں کی سلامتی کے لیے دوبارہ اس عقوبت خانے میں داخل ہونے کی اجازت طلب کر رہی تھی یا پھر شاید اس خدا سے کچھ مانگ رہی تھی جو کتنے برسوں سے اس کی دعائیں شاید سن بھی نہیں رہا تھا۔

تیسری منزل پر ابا کے کانوں تک تو اس کی آواز پہنچی نہیں تھی خدا تک کیسے پہنچتی۔

میری ناک کھڑکی کے شیشے سے چپک کر منجمد ہو گئی تھی۔ ماں چیختے چیختے نڈھال ہو کر برف کے فرش پر گر گئی۔ پھر اٹھی، ایک مرتبہ پھر اوپر دیکھا۔ شاید ابا دروازہ کھول دیں۔ پھر میری جانب دیکھا اور پلٹ کر جانے کہاں چل دی۔

میں نے چیخ کر اماں کو آواز دی، پلٹ کر بھاگی اور ابا سے لپٹ گئی، ابا، اماں کے لیے دروازہ کھول دو۔ بڑی بہنیں بھی چیخنے لگیں۔ ابا اماں کو اندر آنے دو۔ ابا کی دھاڑ کے آگے سب کی چیخیں رک گئیں اور آنکھیں بانجھ ہو گئیں۔ خوف اور بے حسی آنکھوں سے نمی چھین لیتی ہے۔

بڑی بہن نے بانہیں پھیلا کر مجھے آغوش میں لے لیا۔

ماں ریل گاڑی کے نیچے آ گئی تھی۔ پولیس نے رپورٹ لکھ لی۔ اماں ذہنی مریضہ تھی۔ ابا ڈاکٹر کو لکھواتا رہتا تھا۔ اماں کو تائید یا تردید کرنے کا موقع ہی نہیں تھا۔ اسے زبان آتی تو کسی ظلم کا اندراج کرواتی۔

اماں کی لاش ہسپتال بھیج دی گئی۔ بڑی بہن اماں کو دیکھنے گئی۔ واپس آ کر چھوٹی بہنوں کو پیار کیا۔ چاول پکا کر کھلائے۔ مجھے نہلایا دھلایا اور شام کو تیسری منزل سے کود گئی۔

ایک بہن گھر سے بھاگ گئی اور آج تک اس کا نشان نہیں ملا۔ تین بہنوں کو ابا گاؤں بوڑھی جادو گرنی جیسی دادی کے پاس چھوڑ آیا۔ ان کا انجام کیا ہوا یہ کوئی نہیں جانتا۔

اس نے اپنا بیان ادھورا چھوڑ کر مجھے دیکھا، اگر ہو سکے تو اپنے بوڑھے، بے بس اور مظلوم مریض سے پوچھ لینا کہ وہ تین بیٹیاں کہاں ہیں۔ میں ان کے سارے اخراجات اٹھانے کو تیار ہوں۔ وہ مر گئیں، یا مار دی گئیں یا قربانی کے کسی چبوترے پر دان کر دی گئیں۔ کوئی اتا پتا ڈھونڈ سکو تو مجھ پر احسان ہوگا۔"

اداس آنکھوں اور جادو بھری مسکراہٹ والی یہ لڑکی عجیب تھی۔ پورے اعتماد سے بات کرتے کرتے وہ ماضی اور حال کے درمیان جادوئی زقند بھرنے پر قائل تھی۔ ٹوٹے سرے جوڑ کر وہ پھر داستان شروع کر لیتی۔ میں ہمہ تن گوش اس کی بات سن رہی تھی۔ میز پر ریکارڈر خاموشی سے ہر لفظ نگلتا جا رہا تھا۔

"مجھے ایک جرمن گھرانے کی تحویل میں دے دیا گیا" اس نے ایک مرتبہ پھر ماضی کے بند کمرے کی درز سے باہر جھانکا،

میرے سرپرست مجھے ہفتے میں ایک مرتبہ مسجد بھیجنے کا اہتمام بھی کرنا چاہتے تھے۔ میں نہیں مانی۔ میں ڈاکٹر بن گئی۔ ولایت آنے والی غیر ملکی کم سن عورتوں کی ڈاکٹر۔ میں ان کو اپنے جسم کی فیکٹری میں سال بسال کی بیگار سے بچنے کے طریقے سکھاتی ہوں۔ مشرقی ثقافت اور مذہب کے ٹھیکے داروں کی نظر میں

مجرم ہوں لیکن کبھی کم سن ماؤں کو حیات و موت کی سولی پر لٹکا نہیں دیکھ سکتی۔

میں نے ترکی زبان بھی سیکھ لی ہے۔ عربی سیکھنے کی کوشش میں ہوں۔ مجھے جہاں معاملہ مشتبہ نظر آتا ہے میں خاموشی سے ماؤں کو اپنا وزٹنگ کارڈ بھی تھما دیتی ہوں۔ غیر قانونی ہے تو ہو لیکن میں جانتی ہوں کہ ریل گاڑی بدن کے چیتھڑے اڑا دیتی ہے، تیسری منزل سے کودی لڑکی کے سر کے پاس خون کا تالاب بن جاتا ہے"

اس نے اپنے بیگ سے دستانے نکالے اور ہاتھوں پر پہنتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میز پر میری طرف جھکتے ہوئے بہت نرمی سے بولی جیسے کسی چھوٹے بچے کو سمجھاتے ہیں: "میں چھٹی بیٹی تھی، اگر میں چھٹا بیٹا ہوتی تو گوری سے شادی میرے باپ کی ناک نہ کٹتی۔"

اس نے میز پر رکھے میرے ریکارڈر کو چھنگلی سے چھوا: "ممکن ہو تو میرے بیان کا ترجمہ بھی عام کر دینا، کیونکہ یک طرفہ بیان بازی گمراہ کن ہے"۔

وہ پلٹی اور میں اس کے جدید تراش خراش کے کوٹ کو دیکھنے لگی۔ اس کے جوتے کی مدھم سی ٹک ٹک نانی کا گیت گنگنانے لگی،

"میری بالٹی میں سوراخ ہے، بتا لیزا میں کیا کروں"

☆☆☆☆

شہلا نقوی (امریکہ)

سیلفی

عاصمہ احمد نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا۔خزاں رسیدہ پتوں نے کھڑکھڑا کر ان کے ساتھ گھر میں داخل ہونے کی کوشش کی۔حسب عادت انھوں نے دروازے پہ کھڑے کھڑے ایک نظر اندر ڈال کر اطمینان کیا کہ ان کے پیچھے گھر میں کوئی داخل نہیں ہوا تھا۔اس بڑی عمر میں اکیلے رہتی تھیں،امریکہ میں کون اپنی اولاد کے ساتھ رہتا ہے۔انھوں نے تاسف سے دوسرے شہر میں رہنے والے بیٹے کو یاد کیا۔لیکن اب تو پاکستان میں بھی یہی حال ہو گیا ہے۔سب کی اولادیں اپنے والدین کی دعاؤں کے ساتھ کیریر بنا رہی ہیں،انھیں اپنی بہنوں اور دوستوں کا خیال آیا۔وہ لوگ سوچتے بھی نہیں ہوں گے کہ وہ اس تنہا زندگی میں انھیں کتنا یاد کرتی ہیں۔

تنہائی کا مداوا۔مجلسی زندگی۔بارش ہو یا برفباری،ہر بلاوے پہ وہ بال بنوا کر میک اپ کر کے چلی جاتی تھیں۔خود لوگوں کو اپنے گھر بلاتی رہتی تھیں کہ ایسا نہ ہو کہ دوستیاں ختم ہو جائیں۔یہاں کوئی عزیز تو تھا نہیں تھا۔انھیں ڈر تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کبھی ضرورت پڑے تو کوئی اپنا نہ ہو۔

رفیق احمد،ان کے رفی پانچ سال پہلے انھیں داغِ مفارقت دے چکے تھے۔سامنے چاندی کے فریم میں ان کی تصویر مسکرا رہی تھی۔رفی ان سے سات سال بڑے تھے،عاصمہ نے کوٹ اتارتے ہوئے سوچا۔دو سال میں میرے جانے کا وقت آ رہا ہے۔انھوں نے اپنے آپ کو ہال میں لگے آئینے میں دیکھا،میک اپ کے ساتھ ہلکی روشنی میں جھریاں نظر نہیں آ رہی تھیں،ٹھوڑی کے نیچے اب کھال لٹک گئی تھی لیکن ان کا چہرہ اس سے نرم لگنے لگا تھا۔انھوں نے پسندیدگی کی نگاہ اپنے عکس پر ڈالی۔

اپنے کالج کی شوخیاں کہیں سے ذہن میں کوند گئیں۔کسی امریکی مزاح نگار نے عورت کی زندگی کے ادوار گنوائے تھے۔بچی،لڑکی،نوعمر خاتون،نوعمر خاتون،نوعمر خاتون۔۔۔۔

اور انھوں نے اپنی دوست سے مل کر یہ اندازہ لگایا تھا کہ پاکستان میں یہ ادوار بچی،لڑکی،چڑھتی جوانی،ڈھلتی جوانی،چڑھتا بڑھاپا اور بڑھاپا ہے۔وہ اس یاد پہ مسکرا دیتیں لیکن ایک سوال نے مسکراہٹ کو بے دخل کر دیا۔وہ خود کون سے دور میں ہیں؟ان کے ذہن نے اس کا جوب دینے کے بجائے حساب لگانا شروع کر دیا کہ ابھی اس تنہا زندگی کے کتنے سال باقی ہیں؟پڑھا تھا کہ رنڈوے تو جلد مر جاتے ہیں لیکن بیوہ عورتوں کی زندگی کم نہیں ہوتی۔شاید اسی لیے بیواؤں کو ستی کیا جاتا تھا اور اب بھی ہندوستان کے آشرموں میں ان کو بری غذا

سے جلد مارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خوشی کا حق تو انھیں شاید پاکستان میں بھی نہیں ہے۔

مغرب میں کیا ٹھاٹ ہیں۔ جتنا چاہو بجو بنو، گھومو پھرو۔ یہی تعریف ہوگی کہ بھئی بہت اچھی طرح زندگی نبھاری ہیں۔ رنی کے دنیا سے جانے کے بعد انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ اگر وہ غم کی تصویر نظر آتی ہیں تو ان کے جاننے والے ان سے بدکتے ہیں۔ جیسے ان کا غم کوئی چھوت کی بیماری ہو۔ پیسوں کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن دوا علاج تو چلتا رہتا ہے۔ انھیں کوئی خاص بیماری لاحق نہیں تھی لیکن اگر وہ کبھی سے گھٹنے کے درد، کبھی کمزوری یا بیماری کا اظہار کرتیں تو دوست انھیں ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دے کر پھر دوبارہ نہیں پوچھتے تھے۔ آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ اور خوشی کا تاثر مستقل کر لیا تھا۔

رنگے ہوئے بال بنوا کر، چہرے کو اپنی عمر کے مطابق سجا کر، صوفیانہ رنگ لیکن قیمتی لباس میں وہ محفلوں میں جاتیں اور دوسری عورتوں کے کپڑوں اور پلاسٹک سرجری کے نتائج پر خوشی کا اظہار کرتیں۔ اب وہ ایک خوشگوار آنٹی بن چکی تھیں۔ ان کی بیٹیوں کی عمر کی خواتین انھیں اپنی پارٹیوں میں بلانا نہیں بھولتی تھیں اور ان سے اپنے شوہروں کی بے التفاتی یا بچوں کے ان مسائل کا ذکر کرتیں جو وہ مارے غرور کے اپنی ہم عمر عورتوں سے نہیں کر سکتی تھیں۔

پھر بھی عاصمہ صاحبہ نے اپنے ہم عمر امریکی لوگوں سے دوستیاں کر لی تھیں۔ زیادہ تر ان کے محلے والے تھے۔ وہ اور سینڈرا، باربرا اور اس کے شوہر اینڈی کے ساتھ مل کر میوزیم یا فلم دیکھنے چلے جاتے تھے۔ کبھی ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیتے تھے۔ اس کے دوران اینڈی کے لطیفوں پر تینوں عورتیں خوب ہنستیں۔ اینڈی ان گوروں میں سے تھا جو بیر پی پی کر توند نہیں نکالتے۔ وہ تینوں بھی ڈاکٹر کی ہدایت پر ورزش کرنے جاتی تھیں لیکن اینڈی روز سڑک پر کئی میل دوڑنے جاتا تھا۔ ایک دن عاصمہ احمد کو ان کے ساتھ کافی پیتے ہوئے اندازہ ہوا کہ وہ اینڈی کو لگاتار دیکھ رہی تھیں، وہ جھینپ گئیں اور نیچے دیکھنے لگیں۔ میز پر رکھے اینڈی کے ہاتھوں پر سرخی مائل رونگٹے تھے اور کھال پر بیشمار بھورے تل۔ انھوں نے پھر نگاہوں کو پھیرا تو وہ باربرا کے ہاتھوں پر ٹک گئیں۔ شکنوں پڑی کھال کے نیچے ابھری ہوئی ہڈیوں اور نوکدار خون کبوتر پالش کیے ناخنوں سے ہاتھ چیل کے پنجے لگ رہے تھے۔ کسی نئے خیال کی آمد سے عاصمہ نے گھبرا کر میز پر اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو اوپر کر دیا تھا۔

دو ہفتے پہلے کی بات تھی جب وہ ان تینوں کے ساتھ فلم دیکھنے گئی تھیں۔ وہی دن تھا جب تنہائی کے ان مختصر لمحوں میں جب دوسری دونوں عورتیں لیڈیز روم گئی ہوئی تھیں اینڈی نے ان سے اظہار محبت کر دیا تھا۔ وہ اس دن سے ان دونوں میاں بیوی سے چھپتی پھر رہی تھیں۔ لیکن یہ دو ہفتے سکون سے نہیں گزرے تھے ایک

بے چینی ان کو بار بار آئینے کے سامنے لے جاتی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے وہ بہت احتیاط سے آنکھوں کے حلقوں میں کریم لگاتیں، چہرے پر کریم ملتیں۔ رات میں سونے سے پہلے ان کا ہاتھ مسہری کے خالی حصے پر چلا گیا، اب وہاں رنی کے جسم کی گرمی نہیں تھی۔ وہ اپنا بازو پھیلائے رہیں اور ان کے آنسو تکیے میں جذب ہوتے رہے۔

وہ اپنے ان تینوں دوستوں کے ساتھ علاقے کی سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ آج وہاں جانے کے لیے وہ تیار ہو چکیں تو انھوں نے ہاتھ بڑھا کر ایک سیلفی لی۔ وہ اکثر اپنی سجی بنی تصویر بیٹے کو بھیج دیتی تھیں کہ اسے اطمینان رہے کہ ماں خیریت سے ہے غمگین نہیں ہے۔ انھوں نے کیمرے کے اسکرین کو دیکھا۔

پھر امیج کو برائٹ کیا، تصویر کو فریم کیا، اسے دیکھا اور پھر سب تبدیلیاں ختم کر کے ایک تاسف سے اپنی اصلی شکل دیکھتی رہیں۔ انھوں نے میز پر رکھے اپنے ہاتھ کی پشت پر ابھری رگیں اور نیلی نیلی نسیں دیکھیں۔ ایک ہلکی سی سسکی ان کے لبوں سے نکل گئی۔

آج اتفاق سے باربرا نہیں آئی تھی اور جب وہ اور اینڈی سیاسی دفتر میں ڈاک میں بھیجنے کے لیے لفافوں میں خط ڈال کر بند کر چکے اور اپنے گروپ کے نہ آنے والوں کی فون پر خیریت معلوم کر چکے تو انھوں نے اینڈی کو کافی کی دعوت دی۔ اینڈی کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے دبے لہجے میں یہ بھی کہا کہ کافی شاپ میں جانے کی کیا ضرورت ہے تمھارا گھر تو نزدیک ہے۔

لیکن عاصمہ نے کیفے میں اینڈی کے ساتھ اکیلے بیٹھ کر کافی پی اور اپنے ہاتھوں کی پشت پر پھیلی نیلی ندیاں اور صحرا کی ریت پر بنی لہریں دیکھتے ہوئے اس سے گفتگو کرتی رہیں۔ بڑی سی شیشے کی کھڑکی کے باہر سردیوں کی پھیکی دھوپ میں درختوں سے جھڑے ہوئے پتے دیوانہ وار ایک دوسرے کے پیچھے دائروں میں دوڑ رہے تھے۔ عاصمہ نے کھڑکی کے شیشے میں اپنے مرجھائے چہرے کے سرمئی عکس میں میرینڈا کا جھریوں پڑا چہرہ دیکھا اور اینڈی کو افسردہ میز سے اٹھ کر گھر جاتے دیکھتی رہیں۔

☆☆☆☆

عشرت معین سیما (برلن؛ جرمنی)

دل پھینک

یہ تو مجھے میری چھوٹی بہن شہلا نے بردکھوے کے دن ہی بتادیا تھا کہ اس کے ہونے والے دولہا بھائی اچھے خاصے دل پھینک ہیں۔ خاص طور پر جب وہ زنان خانے میں میری بہنوں اور بھابھیوں سے کھل کر ہنسی مذاق کر رہے تھے تو ان کی یہ خصوصیت اہل اہل کر گھر کی خواتین کے سامنے عیاں ہو رہی تھی۔ لیکن اماں کو ان کا یہ عورتوں سے مذاق کرنا خاندان میں گھل مل کر رہنے کی نشانی لگی تھی یا پھر ان کا اپنا بیٹا نہ ہونے کی کسی محرومی نے ان کے دل پر دستک دی تھی۔ تب ہی وہ کئی سالوں بعد اپنے دل میں جاگنے والی اس بیٹا نہ ہونے کی محرومی کو بیٹے جیسے داماد پانے کی صورت میں بدلتا دیکھ رہی تھیں۔ اسی لیے ہی تو وہ فوراً ان کا ماتھا چوم کر ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ تھما کر چلی آئی تھیں جو ایک طرح سے رشتہ پکا کرنے کی ضمانت تھی۔ پھپھو اماں اور بڑی امی کو اماں کی یہ حرکت بالکل پسند نہ آئی کہ بلا مشورہ انھوں نے اپنا حق رائے دہی فیصلے کے طور پر استعمال کر لیا۔ لیکن اس وقت وہ دونوں ہی خاموش رہیں۔ بردکھوے سے واپسی پر گھر آتے ہی انھوں نے اماں کو آڑے ہاتھوں لیا اور ان کی حرکت پر انھیں خوب باتیں سنانا شروع کر دیں۔ وہ تو ابا نے مداخلت کر کے بیچ بچاؤ کیا اور رشتے کو مناسب سمجھتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اماں کی طرفداری کی۔ میں دریچے سے لگی سب کی باتوں پر کان لگائے ہوئے کھڑی تھی۔ خاندان کے مردوں میں سب ہی کا کہنا تھا کہ لڑکا برسرِ روزگار ہے، تعلیم بھی ٹھیک ہے اور باپ بھائی بھی نیک نام ہیں لیکن جو خاندان کی خواتین بردکھوے میں گئی تھیں ان کی مختلف رائے تھی، کوئی کہہ رہا تھا کہ لڑکا مجھ سے زیادہ خوش شکل ہے، کوئی مجھ سے زیادہ ہنس مکھ گردانتا اور کوئی کہتا جس مرد کی مردان خانے میں بولتی بند ہو اور زنان خانے میں ہنسی ٹھٹھا چلتا ہو اس کی عورت کی زندگی جلاپے سے کٹھن ہو جاتی ہے اور صبر شکر کے آنسو پیتے ہی گزرتی ہے۔ یہ تمام باتیں میرے دل میں عجیب سے وسوسے پیدا کر رہی تھیں۔ زندگی کے اس اہم سفر کی ابتدا خدشات سے شروع ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن اماں تو اس لڑکے کے اخلاق و کردار پہ واری صدقے تھیں اور ابا ہمیشہ سے میری اماں پر، لہٰذا میرا رشتہ شکیل احمد قریشی سے طے ہو گیا اور چھ ماہ بعد ہی شادی بھی ہو گئی۔ اس چھ ماہ کے دوران شکیل صاحب نے ہمارے گھر کے کم از کم چھتیس چکر لگائے اور بقول شہلا کے یہ چکر انھوں نے میرا دیدار کرنے کو کاٹے تھے لیکن خاندانی روایات اور مشرقی طرز کے امین گھرانوں کی لڑکیاں اس زمانے میں منگیتروں سے پردہ کرتی تھیں، سو میں نے بھی ان روایتوں کا پاس رکھا اور شادی کی رات ہی

پہلی بار اپنا گھونگھٹ شکیل احمد قریشی کے آگے اٹھایا۔

ابتدا شادی کے بعد انھوں نے میری خوبصورتی و نیک سیرتی کی شاید تعریف بھی کی لیکن نہ جانے مجھے کیوں لگتا تھا کہ وہ میری تعریف کے بجائے اپنی ہی تعریف کر رہے ہیں۔ جیسے وہ کہتے کہ میرے دراز قد کے مقابلے میں تمھارا پستہ قد ہونا دراصل ہمارے خوبصورت ازدواجی جوڑے ہونے کی نشانی ہے یا تمھاری سانولی رنگت اور سادے نین نقش میرے گورے رنگ اور ستواں ناک پہ بھاری دکھائی دیتے ہیں۔ شادی کے پہلے دن کے بعد سے ہی مجھے ان کی ستائش بھلی نہ لگی بلکہ ان کی شخصیت کے کچھ پہلوؤں پر دلی اطمنان بھی نہ ہوا۔ لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ میں بھی اس قسم کے جملوں کی عادی ہوتی گئی اور ان کا میرا گھونگھٹ اٹھانا یا گرانا بھی رفتہ رفتہ ان کے لیے ایک ہی جیسی بات ہوتی چلی گئی۔

اب تقریباً ہماری شادی کے چالیس سال گزر چکے تھے ان کے منہ سے میں نے اپنے لیے محبت کے محدود جذبات یا اپنائیت کا ایک بھی لفظ محسوس نہیں کیا تھا۔ میں اکثر سوچتی تھی کہ جب ایسا شادی کے ابتدائی دنوں میں نہ ہوا تو اتنا عرصہ گزرنے کے بعد انھیں میری شکل میں کوئی کشش کہاں سے نظر آئے گی یا انھیں میری کوئی ایسی ضرورت کہاں محسوس ہوگی جو ایک شوہر کو بیوی کی محبت میں محسوس ہوتی ہے۔ میں نے تو شاید شادی کے پہلے روز سے ہی ان کے منہ سے اپنے بجائے کسی عزیزہ کے دلکش نین و نقش کے قصیدے سنے اور کبھی کبھی تو کسی دوشیزہ کی اداؤں اور ناز برداریوں کا عملی مظاہرہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ایسا لگتا تھا کہ انھیں کسی بھی قسم کی کشش تو مجھ میں کبھی بھی نظر نہیں آئی البتہ چہرے اور بدن کی کمی خامیاں گاہے گاہے بیان کر کے انھوں نے اس احساس کو جگائے رکھا تھا کہ میں ان کے زاویہ نگاہ کے مرکز میں نہ ہی لیکن کسی کونے کھدرے میں ضرور پڑی ہوں اور بیوی کی صورت میں میری ذات ان کی توجہ اپنی جانب کھینچنے کی کشش ضرور رکھتی ہے۔ چاہے یہ توجہ تنقیدی ہو یا تعمیری مجھے اس سے غرض اس لیے زیادہ محسوس نہ ہو سکی کہ شادی کے بعد ہر سال دو سال میں اوپر تلے پیدا ہونے والے چار بچوں کی پیدائش کے سلسلے نے مجھے ان باتوں پر غور کرنے کی فرصت ہی نہ دی۔ لیکن چھٹے بچے کی آمد کی خبر نے شکیل صاحب کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ کلرکی کی سرکاری نوکری میں اتنے بچوں کی کفالت و پرورش آسان کام نہیں تھا۔ اس وقت ہی سے تو میری بھی صحت جواب دینے لگی تھی۔ خدا نے ہی کوئی راستہ کھولا کہ دنیا میں آنے والا یہ بچہ نہ صرف وقت سے پہلے آ گیا بلکہ پیدائش کے مراحل میں اتنی پیچیدگی ہوئی کہ ڈاکٹرنی کو بچہ دانی ہی جسم سے باہر نکال کر پھینکنا پڑی، وہ آنے والا ننھا فرشتہ بھی چند ہی روز دنیا میں سانس لے کر واپس جنت کی طرف روانہ ہو گیا۔ شکیل صاحب کہتے تھے کہ وہ ننھا فرشتہ ہماری آخرت میں مغفرت کی نوید تھا لیکن مجھے تو لگتا تھا کہ وہ دنیا ہی میں میرے لیے کسی گناہ کا کفارہ بن کر آیا تھا جس نے مجھے جانوروں کی

طرح سال دو سال پر بچہ جننے سے روک دیا۔

اس بچے کے بعد مجھے اپنے دیگر بچوں سے محبت کا احساس اپنے دل میں محسوس ہوا۔ اس سے قبل تو بس ایسا لگتا تھا کہ یہ ازدواجی زندگی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے یہ پانچ بچے کسی کارخانے میں چلتی پٹی پر کسی مصنوعات کے لیے تیار ہونے والا کوئی مال ہیں۔ مجھے بھی لگنے لگا تھا کہ سارا سال کسی روبوٹ کی طرح زندگی کے مسائل حل کرنا، صبح سے شام تک خاندان کے لیے فرائض و حقوق کی جنگ لڑتے رہنا۔ رات کو تھک ہار کر اپنا جسم اور بستر شوہر کے حوالے کر دینا اور سال کے آخر میں ایک نئی زندگی کو دنیا میں لا کر انسانوں کا انبار لگا دینا ہی میرا دنیا میں آنے کا مقصد رہ گیا ہے۔ بچوں کی بڑھتی تعداد مجھے اپنے گھر میں ان کیڑے مکوڑوں کا ڈھیر لگتی تھی جو زمین پر گندم کے خوشے سے جڑے دانوں کی چھینا جھپٹی کے لیے دنیا میں بھیجے گئے ہیں۔ مجھ کو کبھی یہ محسوس ہی نہیں ہوا تھا کہ یہ بچے تو قدرت کا وہ تحفہ ہیں جنھوں نے مجھے صاحب اولاد ہونے کا شرف بخشا، جنھوں نے میری زندگی کو ایک مقصد کے ساتھ محبت اور خوشی سے بھی جوڑے رکھا ہے۔ یہ وہی بچے ہیں جنھوں نے مجھے انسان کو انسان بنانے کے فن سے متعارف کروایا اور زندگی کو فرائض و حقوق کے دائرے میں لا کر اس کی رفتار سے روشناس کروایا مگر سچ تو یہ ہے کہ محبت اگر ازدواجی زندگی کے دونوں فریقین کے دلوں سے غائب ہو جائے تو یہی بچے ان کے لیے بےزاری اور میکانکی عمل کا بوجھل نتیجہ لگنے لگتے ہیں۔ میرے بچے میری محبت کے حقدار اور پاسبان تھے لیکن اس سے قبل میری توجہ کبھی اس طرف نہیں گئی تھی۔ میں زمانے کی روش پر انھیں کھانا پینا دینے اور سونے جاگنے کی سہولت دینے کے ساتھ سرکاری اسکول بھیجنے سے زیادہ کا احساس نہیں رکھتی تھی۔ مجھے اپنی لڑکیوں کا مستقبل شادی اور لڑکوں کا روزگاری دکھائی دیتا تھا۔ لیکن چھٹے بچے کی پیدائش اور موت کے بعد احساسِ محبت اور احساسِ محرومی نے آپس میں گتھم گتھا ہو کر میرے اندر سے بےحسی کے بت کو توڑ دیا۔ کہتے ہیں کہ احساسِ گناہ توبہ کی پہلی سیڑھی ہے۔ میں نے اس سیڑھی پر پہلا قدم رکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ شکیل صاحب کو بھی میرے اس نئے سفر میں میرا ہمسفر ہونا ضروری ہے۔ میں نے کوشش کی کہ ان کو کسی طرح اپنی اس راہ کا مسافر بناؤں اور اولاد سے جڑی ہر خوشی کے ذائقے سے متعارف کرواؤں مگر وہ گزرے وقت کے ساتھ اپنی مصروفیت اور خودستائشی کا بہانہ کرتے ہوئے اپنی دنیا شاعری، ادبی محافل میں اور نہ جانے کہاں کہاں بسا چکے تھے۔ جہاں بقول ان کے انھیں داد و تحسین سے نوازنے والوں کا ایک جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ نو آموز خوبصورت اور دلربا نازک اندام شاعرات سے لے کر پکی عمر کی افسانہ و ناول نگار خواتین ان کی تنقید نگاری کے لیے اپنی نگارشات پیش کرنا فخر سمجھتی تھیں۔ کئی منچلے نوجوان شاعر اور عاشق ان ہی خواتین کی کشش میں محفل کے چراغوں میں تیل بھرنے کی ذمہ داری اٹھائے ہوئے تھے۔ لیکن مجھے تو نہ شاعری سے کوئی شغف تھا اور نہ ہی ادب سے

کوئی دلچسپی۔ البتہ ٹی وی ڈرامے اور سیریل بڑے شوق سے دیکھتی تھی۔ کسی ڈرامہ فنکار کو قریب سے دیکھنے کی خواہش میں کبھی کبھار شہر کی ادبی وثقافتی محفلوں میں زبردستی شکیل صاحب کے ساتھ چلی جاتی مگر ہمیشہ اور ہر محفل میں جانا میرے لیے ناممکن تھا اور وہ بھی مجھے ساتھ لے جا کر اپنی ویلیو کم نہیں کرنا چاہتے تھے۔

خیر مجھے اب ان کی یہ ساری حرکتیں اور باتیں دکھ نہیں دیتی تھیں۔ میں نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو اپنے اس دکھ اور غم میں شریک کر لیا تھا۔ وہ میرے لیے ہر لحاظ سے ساتھ کھڑے تھے اور اپنی بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اپنے باپ کے سماجی رویے اور عادات سے بھی واقف ہو رہے تھے۔ یہ میری تربیت تھی کہ وہ باپ کے اس رشتے کا احترام کرتے ہوئے براہ راست انھیں کم ہی کچھ کہتے لیکن جب بلوغت کی سیڑھیاں وہ چڑھ گئے تو کبھی کبھار باپ کے ساتھ ان کی کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی جھڑپ ضرور ہو جاتی۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ میرے بچوں کا اپنے باپ کے ساتھ یہ رویہ میرے لیے تحفظ و محبت کی ایک مضبوط دیوار ہے لیکن کبھی کبھی مجھے افسوس بھی ہوتا کہ ہمارے گھر کا ماحول محبت و سکون کے حوالے سے اپنا توازن کھوتا جا رہا ہے۔

اگرچہ شکیل احمد قریشی بھی ان چالیس سالوں میں میرے قدم سے قدم ملا کر چلنے کے کبھی بھی روادار نہیں ہوئے لیکن اب پانچ بچوں کی تعلیم اور چار کی شادی کے فرائض نبھا کر ان کی کمر جھک گئی تھی، ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر میں ایک ہارٹ اٹیک کے بعد انھیں اپنی صحت کی بہت فکر ہو گئی تھی۔ اب ان ادبی محفلوں میں ان کی جگہ نئے لوگ بھی آ رہے تھے لیکن وہ اپنی جگہ چھوڑنے کو ہی تیار نہ تھے۔ لہٰذا انھیں بزرگ ادیب و نقاد کا لیبل لگا کر رفتہ رفتہ محفل میں کم ہی بلایا جاتا یا انھیں کسی تقریب میں صدارت کی کرسی پہ بٹھا کر خاموش کر دیا جاتا تھا۔ اپنی بزرگی کا یہ لیبل انھیں سخت ناپسند تھا۔ تب ہی اب انھوں نے خود ہی ایسی محفلوں میں جانا کم کر دیا تھا لیکن صبح ہوتے ہی وہ انفرادی سطح پر شاعرات شعرا سے ملاقات یا فون پر گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے تو شام گئے تک اس میں ہی مصروف رہتے۔ اگرچہ اب تو سب سے چھوٹی بیٹی بھی دوسرے شہر کے میڈیکل کالج کی اسٹوڈنٹ بن گئی تھی اور ساتھ ہی اپنی پھوپھی کے گھر کی ہونے والی بہو بننے کی تیاری میں تھی لیکن شکیل صاحب کا انداز زندگی بزرگی کی طرف آنے کے بجائے الٹی جانب تیزی سے چلنے لگا تھا۔ میں شکیل صاحب کی ایک اسی عادت سے نالاں تھی وہ یہ کہ وہ اپنی بڑھتی عمر کی کسی ایسی سیڑھی پر ٹھہر گئے تھے جہاں وہ خود کو اب تک حسینوں کے جھرمٹ میں خوبرو جوان تصور کرتے تھے۔ اسی خوش فہمی میں وہ کبھی کبھی انتہائی حد تک پہنچ جاتے۔ دادا اور نانا کا خطاب پانے کے باوجود وہ اب اپنی اس عمر میں بھی عورتوں اور لڑکیوں کو سامنے پا کر کچھ ایسی چھچھوری حرکت کر جاتے کہ میں اور بچے شرمندہ ہو جاتے۔ لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ محلے کی عورتیں اور خاندان بھر کی لڑکیاں انھیں ٹھرکی گردانتی تھیں۔ بیٹیاں الگ شکایتیں کیا کرتی تھیں کہ ان کے سسرال میں ان کے باپ کی وجہ سے اکثر ناگوار باتیں

ان کو سننا پڑتی ہیں اور بیٹے بھی مجھے ہی کہتے کہ میں نے ان کے ابا کی لگام کس کر نہیں رکھیں۔ بھلا بتاؤ وہ بھی کوئی تھی کا بیل ہیں یا کسی تانگے کا گھوڑا کہ لگام ڈال کر رکھا جاتا۔ میں دبے لفظوں میں بچوں کی یہ شکایات جب ان تک پہنچاتی تو وہ الٹا مجھ پر ناراض ہوتے اور مجھ سے شکایات کا پٹارا کھول لیتے۔ کبھی کبھی تو غصے میں کھانا پینا بھی گھر سے باہر ہی کرتے۔ پھر میں نے ایک ہی طریقہ اپنا لیا تھا کہ بس خاموشی سے سب دیکھتی رہتی اور بچوں کو بھی خاموش رہنے کی تلقین کرتی لیکن آج کل کی اولاد کتنی ہی فرمانبردار ہو والدین کی ذرا سی بھی غلطیاں انھیں جتانے سے باز نہیں رہتی ہے اور یہاں تو بات ان کی اور ان کے حلقہ احباب اور سسرال میں باپ کے ٹھرکی پن کے قصوں کی تھی وہ ان سے کیسے برداشت ہوتیں۔

اس روز صبح میری سب سے بڑی بیٹی نائمہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اپنے میکے آئی تو اس کا موڈ خراب تھا اور بہت تھکی ہوئی بھی لگ رہی تھی۔ میں سمجھی کہ پچھلے دنوں وہ اپنی اکلوتی نند کی شادی میں مصروف تھی جس کی تھکن وہ میکے میں اتارنے کے لیے آئی ہے۔ لیکن کچھ دیر بعد اس کی بات چیت سے ظاہر ہوا کہ شادی پہ اپنے باپ کی اوچھی حرکتوں پر اس کے سسرال والوں اور میاں نے کوئی بات کہہ دی ہے جس سے وہ نہایت دل برداشتہ ہے۔ میرے پیار سے پوچھنے پر گویا وہ پھٹ پڑی اور روتے ہوئے باپ کی شکایت کرنے لگی۔

امی آپ سمجھاتی کیوں نہیں ہیں ابو کو؟۔۔۔ وہ کیوں میرے سسرال کی عورتوں میں گھستے ہیں؟ بھلا کوئی عمر ہے ان کی شادی پہ لڑکیوں لڑکوں کے بیچ میں گھس کر بھنگڑا ڈالنے کی اور مہندی میں عورتوں پر جملے بازی کرنے کی۔۔۔ مجھے کتنی خفت ہوتی ہے جب اسد اور ان کے بہن بھائی ابو کا مذاق اڑاتے ہیں۔

نائمہ کا چہرہ شرمندگی سے لال ہو رہا تھا۔ مجھے دکھ ہونے لگا کہ ہم کیوں گئے اس کی نند کی شادی میں؟ شکیل صاحب کا تو یہ پرانا وطیرہ ہے کہ بے گانے کی شادی میں عبداللہ بن کر دیوانہ وار ناچتے ہیں۔ چاہے گھر پہ آ کر مجھ سے اپنی کمر اور گھٹنوں پر زیتون کے تیل سے مالش کروائیں یا درد دور کرنے کی گولیاں پھانکیں۔

آج جب گھر آئیں گے تو میں بات کروں تمہارے ابو سے۔۔۔ تم جانتی تو ہو ان کی عادت۔۔۔ بس مسجد میں نکاح پہ بلا لیتیں۔ وہ ہی ہمارے لیے کافی تھا۔

میں نے چرائی نظروں سے خجل ہوتے ہوئے نائمہ سے کہا اور کچھ دیر بعد اس کے قریب آ کر اس کو گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے یاد دلایا کہ آج منجھلے بیٹے کی سالگرہ بھی ہے جو ہمارے اوپر والے فلیٹ میں اپنی شادی کے بعد منتقل ہو گیا تھا۔

اچھا ہوا تم آ گئیں آج عمیر کی سالگرہ ہے وہ بھی چھتیس سال کا ہو رہا ہے ہم اس کی طرف چلیں

گے۔۔۔ بیچاری نازش اپنی دو سال کی بیٹی کو سنبھالے یا عمیر کے لیے کیک بنائے۔۔۔ اب تم اپنی چھوٹی بھاوج کی مدد کرو جا کر وہ پورے دنوں سے ہے نہ جانے کس دن تمھیں دوبارہ پھپھو بننے کی خبر سنا دے۔

میں نے نائمہ کو چمکارتے ہوئے کہا۔ بھائی کی سالگرہ کا سن کر وہ خوش ہوگئی۔ خوش تو میں بھی ہوگئی تھی کہ اس کا دھیان دوسری جانب کرنے میں میں کامیاب ہوگئی ہوں ورنہ وہ سارا دن اپنا منہ پھلائے ہی رکھتی۔ اب اس کے چہرے پہ بھائی اور بھاوج کی محبت نے رنگ بکھیر دیے تھے۔

میرے دو بچے ملک سے باہر تھے۔ جن میں سے ایک شادی شدہ بیٹی جدہ میں تھی اور ایک بیٹا اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ لندن میں رہتا تھا۔ اب وہ وہیں کا ہوگیا ہے اور واپس اپنے ملک لوٹ کر آنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا۔ بچے اپنے باپ سے ان کی حرکتوں کی وجہ سے دور ہو گئے ہیں لیکن شکیل احمد کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا وہ بس یہی کہتے تھے کہ میں نے بچوں کو ان کے خلاف ورغلایا ہے۔

اس شام اپنے بیٹے عمیر کے گھر کئی دنوں کے بعد ہم سب اکھٹے ہوئے تھے۔ نائمہ اپنے بچوں کے ساتھ رات رکنے کے ارادے سے آئی تھی۔ بچے آپس میں کھیل رہے تھے نائمہ اور میری بہو چائے لے کر جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو شکیل صاحب نے بہو کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بے ساختہ اس سے کہا:

نازش ! تمھارا پیٹ تو اتنا بڑھ گیا ہے کہ لگتا ہے جڑواں بچے ہیں۔۔۔ اب اور کتنے دن رہ گئے ہیں تمھاری ڈیلوری میں؟۔۔۔ تم ان دنوں اتنا کام نہ کیا کرو۔۔۔ آرام کرو آرام۔۔۔ اور ہاں ! یہ کھلے بال اچھے لگتے ہیں تم پر ماشاءاللہ۔۔۔ یہ کیا کہ ہر وقت انھیں باندھ کر سر پہ دوپٹہ جما لیتی ہو۔۔۔

ابھی شاید وہ نازش کو ٹکٹکی باندھے مزید کچھ کہتے لیکن عمیر نے بات کاٹ کر کہا کہ جاؤ نازش! اب اپنے کمرے میں آرام کرلو۔۔۔ آپا کو بھی ساتھ لے جاؤ۔۔۔ میں بھی تھک گیا ہوں بچوں کے ساتھ ذرا کھیل کر انھیں بھی سلاتا ہوں۔۔۔ آپا! مونا اور کاشان کو یہیں رہنے دیں تا زوبی کے ساتھ کچھ دیر کھیل لیں پھر میں ان تینوں کے ساتھ ہی سو جاں گا۔۔۔ تم چاہو تو نازش کے کمرے میں اس کے ساتھ ہی سو جاؤ۔۔۔ امی کے یہاں ویسے بھی تم ہمیشہ ٹھہرتی ہو ۔۔۔ آج بھائی کے گھر رک جاؤ۔

میں عمیر کے بدلتے ہوئے ناگوار موڈ دیکھ کر اور اس کی باتوں سے سمجھ گئی کہ اب وہ اشارہ کر رہا ہے کہ میں اور اس کے ابو اپنے فلیٹ میں نیچے جا کر آرام کریں۔ لیکن نائمہ نے بھائی کی ان سنی کرتے ہوئے غصے سے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور بولی۔ ابو آپ کا مسئلہ کیا ہے؟ آپ کی نظر اب گھر کی بہو بیٹیوں پر بھی اسی انداز میں پڑنے لگی ہے جس انداز میں آپ بازار و محفل میں دوسری عورتوں کو دیکھتے ہیں؟۔۔۔ کچھ تو شرم کیجیے نانا اور دادا بن چکے ہیں آپ۔۔۔ مجھے سب کے سامنے آپ کو یوں کہنا اچھا نہیں لگ رہا مگر آپ خود اپنی عمر، رتبے

اور رشتوں کا ہی لحاظ کر لیں ذرا۔۔۔ نازش بہو ہے آپ کی۔۔۔ سسر باپ کی طرح ہوتا ہے۔۔۔ کیا آپ کو یہ سب اس سے بولنا زیب دیتا ہے۔۔۔ اور آپ کو کچھ احساس ہے کہ پچھلے دنوں میری نند کی شادی پہ آپ نے جو ناچ گانا کیا ہے نا اس پہ میرا کتنا مذاق بنا ہے؟۔۔ بیٹی کے سسرال میں اس کی عزت کا کچھ احساس ہے آپ کو؟ اور تو اور آپ نے میری سسرال کی عورتوں میں بیٹھ کر جو اپنی عزت افزائی کی ہے نا وہ ہم سب کو شرمندہ کرنے کے لیے کافی ہے۔۔۔ آپ جیسے مردوں کو۔۔۔

شکیل احمد نے بیٹی کی بات کاٹتے ہوئے چلا کر کہا

کیا بدتمیزی ہے یہ۔۔۔ باپ سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔۔۔ یہی تربیت کی ہے تمھاری ماں نے؟

اچانک ہنستا کھیلتا ہوا سارا ماحول سنجیدہ اور ناگوار ہو گیا۔ عمیر بچوں کا ہاتھ پکڑتے ہوئے انھیں دوسرے کمرے میں لے جانے لگا۔ بچے سہم سے گئے تھے۔ ہماری بہو نازش کی ہاتھ میں بھی چائے کی ٹرے میں کپکپاہٹ نے ایک ہلکا شور سا پیدا کر دیا تھا۔ میں نے نائمہ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور گھبراتے ہوئے اپنے شوہر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

چلیں چھوڑیں سب باتوں کو۔۔۔ غصہ نہ کریں یوں۔۔۔ طبیعت خراب ہو جائے گی آپ کی طبیعت جائے بھاڑ میں۔۔۔ تم لوگ تو چاہتے ہی یہی ہو کہ وقت سے پہلے ہی مر جاؤں۔۔۔ اور تمھارے سسرال کی عورتوں میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں؟ میں نے ذرا ہلہ گلہ ان سب کے کہنے پر کر لیا تو تمھاری ساس اور شوہر کو کیوں پتنگے لگ گئے؟ ایک تو تم لوگوں کی تقریب کامیاب بنائی اوپر سے تم مجھے یہ اول فول بک رہی ہو؟

شکیل صاحب نے مجھے گھور کر دیکھنے کے بعد بیٹی کو لتاڑا۔ ادھر نازش نے جلدی سے ٹرے میز پہ رکھی اور کمرے سے نکل گئی۔ میں بھی اب وہاں سے جانا چاہ رہی تھی لیکن اب دونوں باپ بیٹی میں ٹھن چکی تھی۔ نائمہ انھیں ماضی اور حال کی وہ وہ باتیں یاد دلا رہی تھی کہ جس کی وجہ سے چھوٹا بھائی شمیر پردیس سدھار گیا اور عمیر نے اپنا گھر شادی کے بعد الگ کر لیا۔ لیکن شکیل صاحب ان باتوں کی ان سنی کرتے ہوئے مجھ سمیت تمام بچوں پہ اپنی لعنت ملامت کے تیر چلا رہے تھے۔ میں گنگ ہو کر دونوں باپ بیٹی کی اس نفرت آمیز گفتگو کو سننے پہ مجبور تھی۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اس سے قبل بھی عمیر اپنے باپ کے ساتھ اس وقت الجھا تھا جب وہ اس کی ضد پہ نازش کو دیکھنے پہلی بار اس کے گھر گئے تھے اور وہاں نازش کی بہنوں اور امی کے ساتھ کچھ غیر شائستہ گفتگو کی تھی جس پہ نازش کی امی عمیر اور نازش کے رشتے کے لیے تیار نہیں ہو رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے میں نے اور عمیر نے بگڑتی بات کو سنبھالا تھا اور نازش کو اس کے گھر والوں کی جانب سے صرف اس شرط پہ بہو بنا کر لائے تھے کہ وہ الگ گھر میں رہے گی۔ لیکن اس کے باوجود شکیل احمد بہو کو جس نظر سے دیکھتے تھے اس کی چبھن نازش سمیت

عمیر اور مجھ پہ عیاں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عمیر نے اپنی غیر موجودگی میں نازش کو ہمارے یہاں یعنی صرف ایک نچلی منزل پہ بھیجنے کے لیے پابندی عائد کر رکھی تھی۔ باپ اور بیٹی میں طنز و غصے بھرے جملوں کا تبادلہ تیز آواز میں جاری تھا میں نائمہ کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ تو غصے اور جذبات سے بھری بیٹھی تھی۔ اس نے باپ کو خوب رکھ رکھ کر سنائیں، شکیل صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ نائمہ کو تھپڑ ہی لگا دیں اور خاموش کروا دیں۔

میں سر پکڑے یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ بچے الگ حیرت اور خوف سے عمیر سے لپٹ گئے تھے۔ نازش بھی دوسرے کمرے میں یہ شور سن کر پریشان تھی۔ پھر وہی ہوا جو اس سے قبل بھی اکثر ہوا ہے۔ عمیر نے چلا کر اپنے باپ سے کہا۔ نکل جائیں میرے گھر سے آپ۔۔۔ مجھے ایسے ٹھرکی اور بےہودہ باپ کی ضرورت نہیں ہے جو ہم سب کے لیے شرمندگی کا باعث ہو۔ شکیل احمد نے بھی جواباً بیٹے کو برا بھلا کہا اور اٹھ کر دروازے کی جانب چل دیے۔ میں نے بیٹی اور بیٹے کی جانب روہانسی ہو کر دیکھا اور تقریباً بھاگتی ہوئی شکیل احمد کے پیچھے پیچھے فلیٹ کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ شکیل احمد اپنے فلیٹ کا لاک کھول کر اندر جا رہے تھے مجھے دیکھا تو ایک بار پھر لعنت ملامت کی اور غصے میں مجھے دھتکارنے لگے۔ میں خاموشی سے کسی مجرم کی طرح ان کے پیچھے فلیٹ کے اندر آ گئی۔ دروازہ بند کر کے سیدھے باورچی خانے میں گئی اور فرج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر اور پانی کا گلاس لیے کمرے میں آئی جہاں شکیل احمد بستر پہ آدھے لیٹے اور آدھے بیٹھے ہوئے اپنے غصے پہ قابو پانے کی مشق اپنے دانت اور مٹھیاں بھینچ کر کر رہے تھے۔ میں نے پانی کا گلاس ان کی جانب بڑھایا لیکن کوئی ردعمل نہیں ملا تو وہیں بستر کے کنارے سائیڈ ٹیبل پہ گلاس رکھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ چند سال قبل بھی چھوٹے بیٹے شہیر سے وہ کسی ایسی ہی بات پہ الجھے تھے اور شہیر نے بھی لگ بھگ آج عمیر کی طرح ہی انھیں برا بھلا کہا تھا جس پہ انھوں نے جواباً شہیر کو گھر چھوڑ دینے کا حکم دے دیا تھا۔ ان کے حکم کی تعمیل میں شہیر نے بالکل دیر نہیں لگائی اور اپنے دوست کے یہاں چلا گیا جس کے بعد دل برداشتہ ہو کر اس نے شہر اور پھر ملک ہی چھوڑ دیا۔

میری ایک بیٹی صائمہ بھی میری بہن شہلا کی بہو بنی اور چند ماہ میں جدہ چلی گئی۔ شہلا اپنے بہنوئی کی حرکتوں کی وجہ سے میرے گھر کم ہی آتی تھی اور جب سے میری بیٹی کی ساس بنی ہے تو بہناپے سے زیادہ سمدھن ہونا اس پہ غالب آ گیا ہے۔ میں اپنے سارے رشتے چھوڑ کر شکیل احمد سے رشتے میں بندھی تھی۔ پتہ نہیں یہ مشرق کی مٹی کا اثر ہے یا یہاں کے پانی میں کوئی جادو کہ مشرق کی بیٹی اپنی روایات اور رسموں کی پابند ہو کر شوہر کو ہی خاندان کا ستون سمجھتی ہے۔ اپنی اولاد کی محبت اور قربت تک شوہر کے ساتھ کے لیے وار دیتی ہے۔ ایک خاندان کی تشکیل گھر کے مرد سربراہ کے بغیر مکمل ہی نہیں سمجھتی۔ چاہے وہ سربراہ شوہر بن کر اس کی عزت نفس

کچل کر رکھ دے یا اس کے سر کو معاشرے میں شرم سے جھکا دے لیکن وہ اسے اپنے سر کا تاج ہی مانتی ہے اور اس سے علیحدہ ہونا خود کو اپنی زندگی سے الگ ہونا گردانتی ہے۔ یہی خاندانی عورت شوہر کے ہر عیب پہ پردہ ڈال کر اور اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لیتی ہے، کانوں میں سیسہ گھول کر ڈال دیتی ہے یا ہونٹ سی کر خاموش رہتی ہے مگر ہر صورت میں اس شوہر کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہے۔

مجھے یاد ہے شبیر کے گھر اور پھر ملک چھوڑنے کے بعد شکیل احمد کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ میں اس وقت بھی ڈر رہی تھی کہ ان کی طبیعت نہ بگڑے۔ دن رات جائے نماز پر ان کی صحت و سلامتی کی دعا کرتی تھی اور وہ بستر پہ لیٹے لیٹے اپنے دل کا حال فون پہ شہر بھر کی جاننے والی خواتین کو سناتے رہتے۔ میرے وجود کا احساس انھیں اس وقت ہوتا جب کھانے پینے اور دوا لینے جیسی کوئی حاجت ہوتی۔ میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ مائیں اپنے بیٹوں کی دن رات نظر اتار کر اور ان کی خوبصورتی کے گن گا کر انھیں ایسا خود پسند بنا دیتی ہیں یا یہ وصف انھیں ورثے میں ودیعت ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ورثے میں ملتے تو شاید شبیر اور عمیر بھی ایسے ہی ہوتے لیکن وہ اپنے باپ سے بالکل مختلف تھے۔ تعلیم اور میری تربیت نے انھیں بہترین انسان بنایا ہو یا نہیں لیکن باپ کی ان خجالت آمیز حرکتوں کو بچپن سے دیکھ کر ان میں یہ احساس ضرور بیدار کر دیا تھا کہ انسان کا سماجی رویہ ہی اس کی عزت قائم کرتا ہے اور اس رویے کی تعمیر میں مرد کو عورت کا احترام کرنا اور اپنا احترام کروانا سب سے اہم ہے۔

میں نے کچھ دیر بعد کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں شکیل احمد قریشی بدستور اپنے میں بستر پہ آڑھے ترچھے لیٹے ہوئے تھے اور پانی کا گلاس میز پر آدھا خالی رکھا ہوا تھا۔ مجھے اطمنان ہوا کہ انھوں نے ٹھنڈا پانی پی لیا ہے تو غصہ بھی ذرا ٹھنڈا ہوا۔ ہوگا۔ میں ہچکچاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی اور جب ان کی نظر مجھ پر پڑی تو ان کا غصہ دوبارہ ان کی زبان سے اظہار بن کر برسنے لگا۔

دفع ہو جا یہاں سے بدشکل عورت! تمھاری اولاد بھی تمھاری طرح بدتمیز و بدلحاظ ہے۔۔۔ نہ باپ کا کوئی احترام تم نے انھیں سکھایا ہے اور نہ خود بھی مجھے کسی خاطر میں رکھا ہے۔۔۔ نکل جا یہاں سے۔۔۔ شکل نہیں دیکھنا چاہتا تمھاری۔۔۔

میں خاموشی سے مجرموں کی طرح کمرے سے نکل گئی اور دوسرے کمرے میں آ کر ہمیشہ کی طرح اپنی قسمت پر رونے لگی۔ جب بھی کوئی ایسی صورتحال ہوتی تو مجھے خود پر ہی غصہ آتا کہ زندگی کا اتنا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود میں شکیل احمد کے دل میں نہ مقام بنا سکی اور نہ ہی ان کی زندگی میں اپنے لیے کوئی عزت حاصل کر سکی۔ رشتہ نبھانے والی مشرقی روایت کو لے کر میں عمر بھر ان سے خاموش محبت ہی کرتی رہی اور ان کی دھتکار اور بے توجہی کو اپنی خاموش ریاضت اور خدمت کر کے نہ جانے کیسے خود کو پتھر کا ایک بت بناتی چلی گئی جس

پہ ان کے کسی بھی رویے کا اثر نہیں ہوتا۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ انھوں نے مجھے فرمانبردار اولاد کی شکل میں زندگی جینے کا مقصد دے دیا ہے لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ انھوں نے اپنی ہی حرکتوں سے خود کو اپنے بچوں سے دور کرلیا ہے۔ اس عمر میں آ کر ان کے پاس اولاد کی محبت تو کجا کوئی توجہ بھی ڈھنگ سے نہیں حاصل ہوئی ہے۔ وہ ساری عمر محنت کرنے کے بعد بھی اپنے انعام سے محروم ہیں۔ عمیر کا انھیں یوں بے عزت کرنا یا نائمہ کا یوں زبان درازی کرنا ان کا اپنا بویا بیج تھا جس کی تلخ فصل وہ اس عمر ناتواں میں کاٹ رہے تھے۔ جب کہ یہی اولاد میرے لیے اتنی فکرمند رہتی کہ ہر مشکل پہ اپنی جان مجھ پہ نثار کرنے کو تیار رہتی۔ میری ساری رات اسی تاسف میں گزرگئی کہ وہ دنیا کی ہر نعمت پانے کے باوجود خود کو وقت کے ساتھ تبدیل نہ کرسکے اور نہ ہی اپنے مزاج و طبیعت کے ٹھرکی پن کو قابو کرسکے۔ نہ جانے کیوں اس رات مجھے یہ احساس شدت سے کیوں ہو رہا تھا کہ اس طویل ازدواجی سفر میں کہیں نہ کہیں مجھ سے بھی کچھ زیادتی ہوگئی ہے۔ شاید میں ہی اپنے شوہر کو نہ پہچان پائی ہوں۔ مجھے اس سفر کے آغاز سے اب تک کا ہر دن کسی فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے چلتا محسوس ہو رہا تھا۔ میری شادی شدہ زندگی کے ابتدائی سفر میں ہی اطراف کے لوگوں کی سن گن نے دل میں اندیشے اور بے اعتباری کے بیج بو ڈالے تھے جس نے میری ازدواجی زندگی کو کبھی پھلنے پھولنے نہیں دیا اور میرے اندر روایت میں جکڑی اور محرومی میں بندھی ایک عورت نے مجھے ہمیشہ شکیل احمد قریشی کے سامنے ایک بیوی اور ان کے بچوں کی ماں بنا کر پیش کیا جب کہ ان کے دل کا خلا بھرنے کے لیے انھیں ایک محبوبہ کی بھی ضرورت تھی یا صرف ایک ایسی عورت کی ضرورت جو اپنے فن تخلیق سے شادی کے بعد شکیل احمد جیسے محرومیت کے مارے شخص کو نیا جنم دے سکتی۔۔۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی مجھے یہ رشتہ سمجھنے میں بھی اور انھیں یہ تعلق سمجھانے میں بھی۔۔۔ ان ہی گزرے لمحوں کو سوچتے سوچتے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

جب فجر کی اذان کی آواز پہ آنکھ کھلی تو میں نماز پڑھنے کی نیت سے اٹھی اور وضو کرنے کے بعد کمرے سے نکل کر شکیل صاحب کے کمرے میں چپکے سے جھانکا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ شکیل احمد قریشی بستر سے گر کر زمین پہ بے سدھ اوندھے پڑے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میں دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی اور چلا کر انھیں سہارے سے اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ ان کی سانسیں اور نبض ہلکی ہلکی چل رہی تھیں۔ میں نے بھاگ کر میز پہ رکھا فون اٹھایا اور عمیر کو جلدی نیچے آنے کو کہا اور دوبارہ شکیل صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلانے لگی۔ چند ہی لمحوں میں عمیر اور نائمہ بھاگتے ہوئے نیچے آگئے ان کے پاس ہمارے فلیٹ کی ایکسٹرا چابی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی عمیر نے باپ کو سہارا دے کر سیدھا کیا اور نائمہ نے فوری ایمبولینس کو فون کیا۔ میرے ہاتھ پاں پھولے ہوئے تھے۔ شکیل صاحب نے غنودگی کی حالت میں میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

ان کی آنکھیں نیم کھلی ہوئی تھیں۔انھوں نے میرا نام لے کر کہا:

شبانہ !سینے میں بہت درد ہو رہا ہے۔۔۔تم مجھے بچا لو۔۔۔مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے

میری آنکھوں سے آنسو جاری ہونے لگے۔مجھے معلوم تھا کہ شکیل صاحب جب بھی اپنا غصہ دباتے ہیں تو وہ کسی درد کی صورت میں ہی باہر نکلتا ہے،میں ان کے اس درد سے واقف بھی تھی اور درد کا علاج بھی کر دیتی تھی لیکن اس بار ان کے اس انجانے درد کی دوا بہم پہنچانے کے لیے مجھے دیر ہو گئی تھی۔شکیل احمد قریشی کی سانس کی رفتار کم ہو رہی تھی،ایسا لگ رہا تھا کہ میری آغوش میں ان کے درد میں بھی کمی آ رہی ہے۔وہ بدستور میرا ہاتھ تھامے ہوئے ہلکے ہلکے میرا نام پکار رہے تھے۔

چند ہی منٹ کے بعد مجھے لگا کہ باہر ہسپتال کی ایمبولینس کا سائرن تیز اور قریب آ رہا ہے۔کچھ دیر میں دروازے پہ گھنٹی بجی اور نائمہ کے دروازہ کھولتے ہی طبی عملہ اور ڈاکٹر تیزی سے کمرے میں داخل ہوئے۔اس وقت شکیل احمد کی بند ہوتی ہوئی آنکھوں میں شوخی اور غصہ کہیں گم ہو چکا تھا۔صرف ایک بیچارگی دکھائی دے رہی تھی۔ڈاکٹر نے مجھے ان سے الگ کرتے ہوئے ان کی نبض چیک کی مجھے نائمہ ایک طرف لے گئی اور کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ شکیل احمد قریشی دل کا دوسرا دورہ نہیں سہار پائے اور انتقال کر گئے ہیں۔نائمہ اور عمیر خاموشی سے ایک طرف ہو گئے ان دونوں کے چہرے پہ اداسی اور پریشانی تھی۔نائمہ نے مجھے میرے بازوں سے تھامتے ہوئے خاموشی سے گلے لگا لیا۔میرے آنسو میرے چہرے کو بھگو رہے تھے۔پتہ نہیں یہ صدمہ وصال کے آنسو تھے یا شکیل احمد سے اعتراف محبت کے حساس کو جگاتے آنسو تھے۔مگر اس وقت ساری زندگی کے گلے شکوے اور کدورتیں ان آنسوں میں بہہ رہے تھے۔میرے کانوں میں شکیل احمد کے آخری الفاظ بار بار گونج رہے تھے۔وہ اپنے درد کی دوا مجھ سے یہ کہتے ہوئے مانگ رہے تھے کہ شبانہ!میرے سینے میں بہت درد ہو رہا ہے۔۔۔تم مجھے بچا لو۔۔۔مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔

میں اس وقت شکیل احمد کا یہ درد مسلسل اپنے سینے میں محسوس کر رہی تھی۔۔۔نہ جانے یہ درد اپنے جیون ساتھی کے بچھڑنے کی تکلیف تھا یا کسی دل پھینک نے اس بار میرے دل پہ بھی کاری ضرب لگا دی تھی۔

☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

سرور غزالی (برلن؛ جرمنی)

ٹریننگ ایپ

شدید بخار کی حالت میں اس کا جسم تو جیسے جل رہا تھا۔
اسے شدت سے پیاس لگ رہی تھی۔ بستر کے برابر میں لگی میز پر پانی کا جگ اور ساتھ میں ایک گلاس دھرا تھا۔۔۔اس نے گلاس اٹھا کر جگ سے پانی انڈیلا اور غٹاغٹ سارا پانی ایک ہی سانس میں پی گیا۔
اس کی بے چینی میں مگر پھر بھی کوئی کمی نہ آئی۔۔۔ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔۔۔ٹیبل لیمپ کی مدقوق روشنی میں اسے اپنا کمرہ کوئی قبر لگ رہا تھا۔۔۔
وہ ہڑبڑا کر ایک بار پھر سے اٹھ بیٹھا۔۔۔چند لمحوں بعد وہ کھڑکی پہ کھڑا باہر دیکھ رہا تھا۔۔۔۔باہر سڑک پر ہو کا عالم تھا۔۔اس نے اپنا موبائل فون دیکھا۔۔رات کے دو بج رہے تھے۔۔۔
وہ کمرے سے باہر آ گیا اور گرم کپڑے اور جوتے پہن کر باہر نکلنے ہی لگا تھا کہ اس کی بیوی بھی اپنے کمرے سے نکل کر راہداری میں آ گئی۔۔۔
"کہاں جا رہے ہو؟" اس کی بیوی نے نیم خوابیدہ آواز میں اس سے پوچھا۔
مگر وہ کچھ نہ بولا صرف اپنی بیوی کو دیکھتا ہی رہا۔
جواب نہ پا کر اس کی بیوی ایک مرتبہ پھر گویا ہوئی۔ "تم بیمار ہو۔تمھیں باہر نہیں جانا چاہیے۔تمھیں اپنی 'قید تنہائی' سے باہر نکلنے کی ممانعت ہے۔تم گھر پر ہی رہو تو اچھا ہے۔" اس کی بیوی متحوش نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئی بولی۔
وہ بغیر کچھ کہے سنے دروازے سے باہر نکل گیا اور اپنے پیچھے دروازے کو کھینچ کر بند کرتے ہوئے چل دیا۔۔۔باہر سڑک پر اسے ٹھنڈک کا احساس ہوا۔اس نے کھلی فضا میں تیز تیز سانس لی تو اسے لگا کہ جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو۔۔۔وہ مٹرگشت کے ارادے سے گلیوں سے نکلتا بڑی شاہراہ پر آ گیا۔۔۔ابھی وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اسے دو پولیس کے سپاہی اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔وہ تیزی سے پلٹا اور قریبی ایک تنگ گلی میں مڑ گیا۔۔۔
"رک جاؤ"۔۔۔ایک پولیس والے نے اسے رکنے کا کہا۔۔مگر وہ پولیس والے کے گلی کے نکڑ پر

پہنچنے سے پہلے ہی بھاگ کر ایک اور گلی میں گھس کر تیزی سے دوڑنے لگا۔۔۔اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں مگر وہ رکا نہیں۔۔۔تیزی سے بھاگتے ہوئے اس کا موبائل فون ایک تڑاخ کی آواز کے ساتھ زمین پر گر گیا۔۔۔اس طرف خاصا اندھیرا تھا۔رات کی خاموشی میں موبائل فون کے گرنے کی آواز گونج کر رہ گئی۔۔۔پولیس والے تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔۔۔اس نے خود کو تاریکی اوڑھ کر روپوش کر لیا اور قریبی جھاڑیوں میں گھس کر۔۔۔دھیرے دھیرے دور ہونے لگا۔۔۔پولیس والے اس کے موبائل کا سراغ لگاتے وہاں تک پہنچ گئے۔۔۔ایک پولیس والے نے جھک کر فون اٹھایا۔۔۔اور اپنی ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگا۔۔۔وہ تیزی سے چلتے ہوئے اپنے دوست کے گھر تک پہنچ چکا تھا۔۔۔

کافی دیر تک بار بار داخلی دروازے کی گھنٹی بجانے کے بعد اندر سے آواز آئی۔۔۔کون ہے؟ اتنی رات گئے کیا افتاد آن پڑی ہے۔۔۔؟

"میں ہوں عاصم یار مجھے اوپر آنے دے۔۔۔"اس نے آہستہ سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے یوں کہا جیسے پکڑے جانے کے خوف سے اس کی آواز حلق میں پھنس گئی ہو۔۔۔۔

داخلی دروازے پر کھلنے کا اشارہ دینے کی گھنٹی بجی اور وہ دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔۔۔سیڑھیوں سے تیزی سے اوپر چڑھ کر وہ تیسری منزل پر پہنچا اور اپنے دوست کے دروازے کے سامنے کھڑا ہانپنے لگا۔۔۔۔۔۔دروازہ کھلنے پر وہ جلدی سے اندر گھس گیا۔۔۔۔۔۔

"ابے عاصم تو اتنی رات گئے۔۔۔۔سب خیر تو ہے نا۔۔۔؟"اس کا دوست ندیم بھونچکا اسے دیکھتا رہا۔۔۔ابے تو تو قرنطینہ میں تھا۔۔۔کیا بھابھی سے لڑائی ہو گئی۔۔۔ندیم پوچھتا ہی رہا۔۔۔۔۔۔

صبر صبر، مجھے اندر تو آنے دے عاصم بولا۔۔۔۔پہلے ایک گلاس پانی تو پلا۔۔۔کہہ کر خود ہی باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔ندیم اس کے پیچھے پیچھے آیا اور فریج میں سے پانی کی بوتل نکال کر پانی ایک گلاس میں انڈیلنے لگا۔۔۔عاصم ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔۔۔اور پانی کے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے بولا۔۔۔

"سن میرے کورونا ٹسٹ کا نتیجہ نیگیٹو آیا ہے مگر پھر بھی مجھے قرنطینہ میں بند رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔اور تو اور تیری بھابھی نے میرے موبائل فون پر ایپ بھی لوڈ کر دیا ہے۔۔۔۔کورونا ٹریکنگ ایپ۔۔۔"عاصم کی بات مکمل ہونے سے قبل ندیم بول پڑا۔۔۔

"اور اور۔۔۔۔تو یہاں جو آیا تو پھر۔۔۔۔پھر۔۔۔"

عاصم بیچ میں ہی بول پڑا۔"فکر نہ کر میں راستے میں اپنا موبائل پھینک آیا ہوں۔۔۔۔اب وہ ہمیں تلاش نہیں کر سکتے۔۔۔۔"عاصم کی بات سن کر ندیم کی جان میں جان آئی۔۔۔

"اچھا تو پھر۔۔۔" ندیم نے سوال کیا۔۔۔

"پھر کیا ہم سب اس بڑے کھیل کے مہرے ہیں۔۔۔وہ بھی پیدل ہمیں تو شطرنج کی بساط پر ڈھائی چال بھی نصیب نہیں۔۔۔ہم تو پیدل ہیں۔۔۔

دیکھو مجھے قرنطینہ میں ڈال کر پندرہ دن بعد دوسرے ٹیسٹ میں وہ میری رپورٹ بدل دیں گے۔۔۔لامحالہ میرا نام وبا میں مبتلا مریضوں کی فہرست میں آجائے گا۔۔۔

دیکھو اس جدید دنیا کو ایک نئے معبود کی ضرورت ہے۔ان کا معبود بوڑھا اور پرانے خیالات کا ہو چکا ہے جو ان کی جدید پر رونق اور سائنسی شعبدے کے سامنے اپنی اہمیت کھو چکا ہے۔۔۔یہ چینی تم جانتے ہی ہو صرف آہنی پردے کے پیچھے ہی رہ کر خوش رہ سکتے ہیں۔۔۔انھیں ہمیشہ ہی ایک دیوار آہنی دیوار چاہیے۔۔۔ان کی دیوار کی شہرت سے ہم سب واقف ہیں۔جدید معیشت کی آزادی نے ان کے عوام کو خود سر بنا دیا ہے۔۔۔اور اس خود سری کی سزا انھیں اس نئے خدا سے دلوانا ہے۔۔۔اس کا نام انھوں کورونا رکھا ہے لیکن کورونا صرف چینیوں کا خدا نہیں ہے۔۔۔

اگر تمھاری دل کا دورہ پڑنے سے موت ہو جائے تو یقیناً تمھارا نام کورونا سے مرنے والوں کی صف میں شامل ہو جائے گا۔۔۔ورنہ صحت یاب ہونے والوں کی فہرست میں تو تم شامل ہو ہی جاؤ گے۔۔۔۔ندیم بولا۔۔۔اب تم زیادہ فلسفہ نہ بگھارو اور مجھے سونے دو۔اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔۔ہاں رات کے تین تو بج رہے ہیں۔عاصم بولا۔۔۔چلو میرا بستر لگاؤ صبح دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔

یہ لو،ندیم نے ایک فولڈنگ بستر کو کھولتے ہوئے کہا۔تم جوان چینیوں کا تبرہ پڑھ رہے ہو انھی کا تیار کردہ یہ بستر خاص طور سے چین سے منگوایا ہے۔اللہ چینیوں کا بھلا کرے کہتے ہوئے عاصم بستر پر دراز ہو کر رضائی درست کرتے ہوئے لمبی تان کر سو گیا۔۔۔

ندیم بھی سونے کو لیٹ گیا۔

دوسرے دن صبح اٹھ کر ندیم نے عاصم کا بخار ایک تھرمامیٹر سے ناپا۔۔۔اس کا بخار اتر چکا تھا۔پھر بھی وہ دونوں ہی دوپہر تک سوتے رہے۔دو بجے کے قریب جب عاصم سو کر اٹھا تو ندیم کھانا بنا چکا تھا عاصم ایک بار پھر چہک رہا تھا۔۔۔

تو پھر جولیا کو فون کر دوں آ کر تجھے لے جائے گی۔۔۔ندیم نے عاصم کو چھیڑا۔۔۔

ابے تو پولیس کو کیوں نہیں فون کر دیتا کہ تیرے پاس ایک کورونا مریض چھپا بیٹھا ہے۔۔۔اس طرح تو تو فوراً ہی مجھ سے نجات پا سکتا ہے۔۔۔عاصم کا لہجہ سخت تھا۔۔۔

ابے تو تو ناراض ہوگیا، میں صرف تجھے چھیڑ رہا تھا۔۔۔ چل چھوڑ یہ بتا کہ یہ نیا معبود اگر صرف چینیوں کا نہیں ہے تو اور کس کس کو اس کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ ندیم نے عاصم کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے اس کا من پسند موضوع چھیڑ دیا۔۔۔۔۔

"یہ معاشی نظام جسے یورپ و امریکہ نے اپنا رکھا ہے۔۔۔" عاصم بلا تمہید بولنا شروع ہوگیا۔ "یہ بہت جلد بری طرح ناکام ہونے والا ہے اور اس کا الزام بھی تو کسی کے سر دھرنا ہے نا۔۔۔ کسی ایسے کے سر جو، جواب میں اپنا دفاع نہ کر سکتا ہو۔۔۔۔۔ خاموش تماشائی بنا رہے۔۔۔۔۔ سو یہ 'کورونا معبود' سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔ مگر سب کے سب ایسی سوچ کے حامل نہیں۔۔۔۔۔۔ باقی سب تو بھیڑ کی چال چل رہے ہیں۔۔۔ اب دیکھ لو نئے معبود کی پرچار کے لیے نئے پیغام بر بھی اتارے گئے ہیں۔۔۔"

ندیم ایک دم عاصم کے پاس پہنچا اور اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔۔۔ رات تو تجھے بخار تھا۔۔۔۔ مگر یار اب تو بخار بھی نہیں۔۔۔ تو پھر تو یہ ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے۔۔۔۔

یہ باتیں یوں ہی نہیں کر رہا۔۔ عاصم زچ ہوتے ہوئے بولا۔ ٹی وی دیکھ، گوگل کر اور سن کہ رابرٹ کوخ انسٹیٹیوٹ کے علاوہ بھی دوسرے وائرولوجسٹ کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ وبا کا زور ٹوٹ چکا ہے مگر خوف و ہراس کی فضا اب بھی قائم ہے۔۔۔۔ اور یہ ان نئے معبود کے نئے پیام بر ان کی ہی تو کرامت ہے۔ یہ کہیں سائنسی فتویٰ دے رہیں تو کہیں 'آر این اے' ویکسین کو لازم قرار دلوانے کے لیے ڈبلیو ایچ او کو چندہ دیگر زیر بار کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ یہ ماسک کی پابندی جبکہ شرح اموات میں کمی اور چھوت کے پھیلاؤ کے تناسب میں تیزی سے گھٹاؤ آ گیا ہے۔۔۔

یہ وبا انسانی آزادی اور نجی زندگی سلب کرنے کے لیے ہے۔ یہ جدید غلامی ہے جس میں ہم سب گھرنے والے ہیں۔۔۔ آخر سویڈن، بیلا روس اور جنوبی کوریا یہ ممالک بھی تو ہیں۔۔۔ انھوں نے شماریات کی گڑبڑ کے زور پر اقدامات نہیں کیے ہیں۔ انھوں نے پوسٹ مارٹم کی گڑبڑ کو نہیں ذریعہ بنایا ہے۔" عاصم بولتا رہا۔۔۔ "دیکھ بھائی اب ایسے خیالات کے ساتھ تو تو یہاں نہیں رہ سکتا" ندیم عاصم کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔۔۔

"کیا مطلب؟" عاصم نے حیرانی سے ندیم سے سوال کیا "تو مجھے یہاں سے جانے کو کہہ رہا ہے۔ "نہیں نہیں۔۔۔" ندیم نے استہزائیہ انداز میں عاصم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ میرا مطلب ہے ہم اس لاک ڈاؤن اور بند سرحد کے دور میں یہاں سے نکل کر سویڈن جا رہے ہیں۔۔۔۔

ہائیں وہ کیسے عاصم نے پوچھا۔۔۔

بس یہ مت پوچھو۔۔۔ندیم بولا۔۔۔

اس بند دور میں آخر کو سبزی اجناس کی ترسیل تو جاری ہی ہے نا۔ یاد کرو جب ہم جرمنی آئے تھے تو کیا سرحدیں کھلی تھیں؟

رات کو ندیم نے بستر میں لیٹے لیٹے عاصم کی بیوی کو ٹیکسٹ کیا تم پریشان مت ہو میں اور ندیم خیریت سے سوئیڈن کی سرحد میں داخل ہو چکے ہیں۔

☆☆☆☆

فہیم اختر (لندن؛ برطانیہ)

بیوٹی پارلر

مرزا جی کو مٹیا محل میں رہتے ہوئے تیس برس ہو چکے تھے۔ ان تیس برسوں میں مرزا جی نے کئی اُتار چڑھاؤ دیکھے تھے۔ سیاسی، سماجی اور ثقافتی بدلاؤ۔ مگر کچھ نہیں بدلا تو مرزا کا رکھ رکھاؤ اور تہذیبی قدریں۔ مجال تھی کہ مرزا جی کو کوئی آداب کی بجائے نمسکار کہتا۔ کیا ہندو کیا مسلمان۔ بس مرزا جی کو آداب کہنا مرزا جی کے لیے شایانِ شان تو ہوتا ہی تھا لیکن کہنے والے کے لیے حد درجہ مسرت کا باعث بھی ہوتا۔ مرزا جی کا تعلق تو لکھنؤ سے تھا مگر مٹیا محل میں آتے ہی مرزا جی کے رکھ رکھاؤ اور تکلفات نے لکھنؤ کو بھی مات کر دیا۔۔ کالی شیروانی، سر پر دو پلڑ ٹوپی اور ہاتھ میں چھڑی، جو کہ سہارے سے زیادہ دکھاوے کے لیے ہوتی۔ آج صبح ہر روز کی طرح مرزا جی چہل قدمی کے لیے نکلے تو ان کی نظر سامنے والی دھوبی کی دکان پر پڑی۔

'میاں غفور۔'

'جی مرزا جی۔'

'آج آپ نے ہماری قمیص پر استری کیوں نہیں فرمائی؟'

غفور دھوبی نے گھبراتے ہوئے کہا: 'مرزا جی آج گھاٹ سے کپڑے دھل کر آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ معافی چاہتا ہوں۔'

'اماں! معافی، مرزا جی ہکلاتے ہوئے بولے۔ آپ حضرات کے ساتھ یہی تو مجبوری ہے، ایک تو آپ نے کام مکمل نہیں کیا پھر اس پر معافی۔ لاحول ولا قوۃ۔'

پھر کیا تھا مرزا جی شروع ہو گئے، میاں جب میں لکھنؤ میں رہتا تھا تو ابا حضور آپ جیسوں کی دکان پر جانا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

غفور دھوبی نے پوچھ ڈالا: 'مرزا جی تو کیا آپ کے ابا حضور کے گھر دھوبی بھی ہوا کرتا تھا۔'

'اماں! اب آپ کو ہم یہ بھی بتاتے ہیں کہ کیا نہیں ہوا کرتا تھا۔ وہ تو کم بخت فرنگیوں کو آپ برا کہیے، جو ابا حضور سے وعدہ کر کے اور پھر ہمیں دھوکا دے کر رخت سفر باندھ گئے۔'

غفور دھوبی بھی بڑی چالاک شے تھا اس نے مرزا جی کی دکھتی ہوئی رگ پر فوراً ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگا:

'مرزا جی کچھ ایسی سنائیے کہ کہانی کا مزا آجائے۔'

'میاں یہ کہانی نہیں ہے حقیقت ہے۔ ہوا یوں کہ ہمارے لکھنؤ میں کیا مجال کہ کوئی ہمارے حکم کے بغیر ایک چڑیا بھی پر مار دے۔ میاں ہمارے یہاں جو دربار لگتا وہ کوئی شام تک جاری رہتا۔ بس حوالدار، ڈاکٹر اور افسران۔ ایک ایک کر کے آتے اور انعام لے کر رخصت ہو جاتے۔'

مرزا جی اپنی کہانی سنا ہی رہے تھے کہ سامنے والی حجام کی دکان میں ایک لڑکی داخل ہوئی۔

'اماں! غفور میاں۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔'

غفور میاں نے استری کونے میں رکھتے ہوئے کہا، 'کیا مطلب مرزا جی؟'

مرزا جی نے ڈبیا سے پان نکالا اور منہ میں پان دبا کر چباتے ہوئے بولے: 'اماں شنکر حجام کی دکان میں یہ لونڈیا کون تھی؟'

غفور دھوبی نے سر کو ہلاتے ہوئے جواب دیا، 'مرزا جی ہم نے آج ہی سنا ہے کہ کوئی لونڈیا بھی شنکر حجام کے یہاں آتی ہے۔ ویسے شنکر کہہ تو رہا تھا کہ وہ کیا انگریزی میں بولتے ہیں، بوٹی۔۔۔'

'بیوٹی پارلر'

مرزا جی بیوٹی پارلر کی اصطلاح کے رموز سے قطعاً نا آشنا تھے بوکھلا کر پوچھنے لگے 'تمھارا مطلب۔۔ یعنی حجامت کے علاوہ کچھ اور۔۔۔'

غفور نے بات کاٹتے ہوئے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

'ہاں وہی مرزا جی لگتا ہے اب شنکر کے یہاں عورتوں کے بال کی کٹائی بھی شروع ہو گئی ہے؟'

'اماں! کیا بکواس کرتے ہو! شنکر سے تو ہمارے موئے خمدار کو سنوارنے میں ہاتھ کانپنے لگتے ہیں۔ اب وہ خاتون کی نازک زلفوں کو کیا خاک ہاتھ لگا کر سنوارے گا۔'

مرزا جی کی بے قراری تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ غفور دھوبی بھی مرزا جی کی دلچسپ باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں مرزا جی غفور دھوبی سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں کہ 'کیوں نہ ہم بھی آج اپنے موئے پیچیدہ کو ترشوا لیں۔'

بس پھر کیا تھا اگلے ہی پل مرزا جی شنکر حجام کی دکان پر پہنچ گئے۔ اور انتہائی شانِ نوابی سے ہم کلام ہوئے۔

'اماں شنکر میاں۔ کہاں ہو بھئی تم؟'

شنکر حجام اندر سے پردے کو سرکاتے ہوئے باہر آتا ہے اور بہت ہی احترام سے کہتا ہے؛ 'آداب مرزا جی۔' 'آداب عرض ہے۔'

'بھئی آج تمھاری دکان میں بڑی رونق ہے۔'

'رونق تو آپ کے تشریف لانے سے ہوئی ہے مرزاجی!' شنکر حجام نے ازراہِ تمسخر جواب دیا۔
'وہ تو ہے مگر آپ کی دکان آج کچھ بدلی بدلی سی دکھ رہی ہے۔'
'مرزاجی! آج سے ہماری دکان میں حجامت کے ساتھ ساتھ مالش کا بندوبست بھی ہوگیا ہے۔'
'کیا مطلب؟ اب تم نے مالش کرنے کے لیے پہلوان رکھ لیے ہیں۔'
شنکر حجام نے فوراً جواب دیا 'ارے نہیں مرزاجی، پہلوان نہیں بلکہ ایک سندری مالش کرے گی۔'
'لاحول ولاقوۃ آپ کا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا ہے۔'
مرزاجی نے شنکر کی بات پر اس طرح ناک بھوں چڑھائیں کہ واقعی انھیں لونڈیا کا آنا ناگوار گزرا ہو مگر اس لڑکی کو دیکھنے کے اشتیاق نے مرزاجی کے دل کے اندر اضطراب و تجسس کی ایک آگ سی لگادی تھی۔ بس ان کے دماغ میں یہ بات فوراً بیٹھ گئی کہ یہ لڑکی کہیں ایسے ویسے کام کے لیے نہ لائی گئی ہو۔ ابھی مرزاجی آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر اس بات کو سوچ ہی رہے تھے کہ شنکر حجام نے ان کی خاموشی کو توڑتے ہوئے یہ سوال داغ دیا۔
'تو کہیے مرزاجی آج آپ کی کیا خدمت کی جائے۔'
'میاں شنکر بس وہی جو تم ہمیشہ کرتے ہو۔'
'لیکن مرزاجی داڑھی تو میں نے کل ہی بنائی تھی۔'
'ہاں ہاں کل بنائی تھی نا مگر آج تو نہیں۔ آپ کو میں یہ بتانا چاہوں گا کہ ابا حضور کے زمانے میں صبح اور شام دونوں وقت ہمارے یہاں حجام آتے تھے اور وہ رونق ہوتی تھی کہ بس مت پوچھیے۔'
مرزاجی اپنی شیخی شنکر کے سامنے بگھار ہی رہے تھے کہ گلابی پردے کے پیچھے سے ایک نرم و نازک سی آواز نے مرزاجی کو کھانسنے پر مجبور کر دیا۔
'مرزاجی اگر آپ کو مالش کی خواہش ہو تو اندر تشریف لے آئیے۔' مرزاجی نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اور کھانستے ہوئے بمشکل تمام شنکر سے پوچھا: 'میاں شنکر جو میں نے سنا کیا یہ سچ ہے۔'
شنکر نے کہا 'مرزاجی! اگر خواہش ہو تو اندر تشریف لے جائیے۔'
اب تو مرزاجی کا چہرہ کھل اٹھا اور سوچنے لگے کہ حجامت جائے بھاڑ میں بس سارے بدن کی گرما گرم مالش ہو جائے۔
'اماں! شنکر ذرا جلدی ہاتھ چلانا کل ہی تو تم نے حجامت بنائی تھی پھر پتہ نہیں آج اتنا وقت کیوں لگا رہے ہو۔؟' مرزاجی نے گرج کر شنکر سے کہا۔
'مرزاجی میں تو روز جیسا ہی بنا رہا ہوں پتہ نہیں آج آپ کو الگ کیوں لگ رہا ہے۔'

'میاں کیانام بتایا اس خاتون کا تم نے؟'

'روپا۔'

'ہاں وہ روپا نے شاید کچھ کہا تھا۔'

'جی مرزا جی وہ آپ ہی کا انتظار کر رہی ہے۔'

مرزا جی کی باچھیں کھل اٹھیں وہ کرسی سے اٹھ کر اندر کی جانب بڑھے اور پردے کو ہلکے سے سرکایا اور کہا ''بی بی اندر آجاؤں؟''

'جی مرزا جی آئیے۔'

اندر کا نظارہ دیکھ کر مرزا جی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ گلابی اور ہرے رنگ کی روشنی میں کمرے کا عجیب ہی ماحول دکھ رہا تھا۔ کئی طرح کے پاؤڈر اور تیل کی بوتلیں سامنے رکھی ہوئی تھیں۔ ماحول بالکل غیر مانوس تھا۔ کرسی پر لال رنگ کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ مرزا جی ابھی ماحول کا جائزہ ہی لے رہے تھے کہ روپا نے بڑی شوخی بھرے لہجے میں کہا ''بیٹھیے نا۔''

مرزا جی بلا جھجک کرسی پر جلدی سے بیٹھ گئے۔

روپا نے آہستگی سے کہا، اگر آپ شیروانی اتار دیں تو مہربانی ہوگی؟'

مرزا جی نے فوراً شیروانی کو اتار دیا اور ٹانگنے کی بجائے اس کو ایک کونے میں پھینک دیا۔ روپا نے اپنے نازک ہاتھوں سے مرزا جی کے ماتھے پر جو تیل ملا تو بس پھر کیا تھا مرزا جی کے چہرے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہوگئیں اور جسم کانپنے لگ گیا۔ بے چارے مرزا جی کی اس حالتِ زار کو دیکھ کر جب روپا سے کچھ نہیں بن پڑا تو وہ اپنے ہاتھوں کو مضبوطی کے ساتھ مرزا جی کے سر پر پھیرنے لگی۔ مرزا جی ایسے بے بس ہو کر کرسی سے چپک گئے تھے جیسے اب وہ کبھی نہ اٹھ پائیں گے۔ اسی کشمکش میں مرزا جی مبتلا تھے کہ شکر نے آواز لگائی۔

'مرزا جی! مرزا جی! مالکن آرہی ہیں۔'

یہ سنتے ہی مرزا جی کے ہوش اڑ گئے۔ ہڑبڑا کر مرزا جی کرسی سے کود کر فوراً بانس کی طرح کھڑے ہو گئے۔ شیروانی کو جیسے تیسے بدن پر ڈال کر ہکلاتے ہوئے شکر سے کہا۔

'میاں پیسے میں کل بھجوا دوں گا۔'

مرزا جی بے تحاشہ دم دبا کر بھاگ رہے تھے اور بیگم صاحبہ پیچھے پیچھے یہ کہتی ہوئی چلا رہی تھیں کہ میں تمھاری ایسی حجامت بناؤں گی کہ زندگی بھر تمھارے سر پر بال نہیں اگیں گے۔

☆☆☆☆

طارق شیخ

ڈینجر زون!

"اے زمین والو۔۔۔۔۔۔؟"

بل کینڈی اپنے دفتر میں کام میں مصروف تھا کہ دفعتاً اس کے پیغام رسانی کے آلے پر کسی نامعلوم مقام سے پیغام موصول ہوا اور حیرت انگیز طور پر یہ الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے۔

"ہیلو۔۔۔۔۔۔ہیلو۔۔۔۔۔۔میں زمین سے بات کر رہا ہوں۔۔۔۔۔۔اوور۔"

اس نے آواز کا جواب دیتے ہوئے واپس تحریری پیغام بھی بھیج دیا اور جواب ملنے کا انتظار کرنے لگا لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ وہ خلا میں سگنل پہ سگنل بھیجتا رہا جس دوران اس نے اپنے تحقیقاتی ادارے کے اوپر سے چند اڑن طشتریوں کو مسلسل پرواز کرتے ہوئے دیکھا۔ نامعلوم مقام سے ملے اس مختصر پیغام اور اڑن طشتریوں کے مسلسل پرواز سے تحقیقاتی ادارے میں ہلچل مچ گئی اور سارا عملہ متحرک ہو کر اڑن طشتریوں کے حرکات وسکنات کا باریک بینی سے مشاہدہ کرنے لگا۔

مشہور خلائی سائنس دان بل کینڈی برسوں سے اپنی ٹیم کے ہمراہ پراسرار خلائی مخلوق کے بارے میں تحقیق کے ساتھ ساتھ خلا میں پیغامات بھیج کر اس پراسرار مخلوق سے رابطہ کرنے کے مشن اور سمندر کے اس حصے کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا، جس طرف جانے والے بحری جہاز، کشتیاں اور اس علاقے کے اوپر اڑان بھرنے والے ہوائی جہاز سینکڑوں مسافروں اور عملے سمیت غائب ہو جاتے تھے۔ تحقیقاتی ادارے کو نامعلوم جگہوں سے ایسے پیغامات پہلے بھی موصول ہو چکے تھے جن کا کافی کوششوں کے باوجود کچھ پتہ نہیں چلا تھا کہ یہ پیغامات کہاں سے اور کس نے بھیجے ہیں؟ لیکن نہ جانے کیوں بل کینڈی نے آج کے مختصر پیغام کو سنجیدگی سے لیا اور اسے نامعلوم خلائی مخلوق کے ساتھ رابطے استوار ہونے اور اپنے مشن میں کامیابی کی امید پیدا ہو گئی۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ کیا واقعی ایک دن ایسا آئے گا جب ہم کسی اور کائنات کی مخلوق سے رابطے استوار کرنے میں کامیاب ہو نگے؟ یہ نئی مخلوق کیسی ہو گی؟ ان کے ساتھ ہمارے تعلقات دوستانہ ہوں گے یا دشمنانہ؟ ان کے سبب ہماری ترقی پر کیا اثرات مرتب ہو نگے؟ دورانِ سفر غائب ہوئے سینکڑوں لوگوں کا پتا ملے گا کہ نہیں۔۔۔۔۔۔؟

وہ پراسرار خلائی مخلوق سے رابطے کے فراق میں لگا تار بھی دنوں تک اس نامعلوم مقام، جہاں سے

اس کو مختصر پیغام موصول ہوا تھا، کی طرف پیغامات اور سگنلز بھیجتا رہا لیکن حسب معمول اسے کوئی کامیابی نہیں ملی۔اس دوران اس کا حوصلہ یوں برقرار رہا کہ فضا میں غیر معمولی طور اڑن طشتریاں لگاتار پرواز بھرتی رہیں، جس کا اس نے یہ مطلب نکالا کہ پر اسرار مخلوق کی غیر معمولی سرگرمیوں میں ضرور کوئی راز ہے جسے جاننے کے لیے اس کا تجسس ہر لمحہ کے ساتھ بڑھتا ہی گیا۔کافی سوچ بچار کے بعد آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ایک بار پھر خلا میں جاکے اس راز سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرے گا، حالانکہ ایک بار وہ خلائی سفر کے دوران بڑی مشکل سے جان بچا کر واپس آیا تھا۔اس نے اپنی ٹیم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور سفر کی تیاری میں جٹ گیا۔۔۔۔۔

"سر۔۔۔۔۔۔یہ بہت ہی پر خطر سفر ہے اور آپ کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے"۔

"اپنے ایک قریبی ساتھی نے اس کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔"

"میں جانتا ہوں لیکن اس پر اسرار خلائی مخلوق سے رابطہ اور ان سینکڑوں لوگوں کی تلاش، جو اس جانب سفر کے دوران غائب ہو گئے ہیں، ضروری ہے۔اس چیلینج میں اگر میری جان بھی چلی جائے تو سودا مہنگا نہیں ہے، ویسے بھی لوگوں کے چلے جانے سے ارادے ختم نہیں ہوتے"۔

اپنی ٹیم کے ساتھیوں سے صلاح مشورے کے بعد بالا آخر وہ تمام سہولیتوں سے لیس جدید ترین خلائی جہاز میں بیٹھ کر سفر پر روانہ ہو گیا اور اپنے سفر کی پل پل کی خبریں اور تصویریں اپنے تحقیقاتی مرکز کو بھیجتا رہا۔اس دوران اچانک اس نے عجیب قسم کا خوف ناک شور سنا جیسے ہزاروں مرد و زن ایک ساتھ چیختے، چلاتے اور رو رہے ہوں۔اس نے جاننے کی بہت کوشش کی کہ اس ویرانے میں یہ شور کہاں سے اٹھ رہا ہے؟ لیکن اسے کوئی سراغ نہیں ملا۔اسی لمحہ اس نے سمندر کی طرف نظر ڈالی تو سمندر کے ایک حصے کا پانی بالکل سفید تھا اور ایک بہت بڑی غار نما جگہ سے آگ کے بھیانک شعلے بلند ہو رہے تھے۔یوں تو وہ ایک مضبوط دل کا انسان تھا لیکن یہ مناظر دیکھ کر اس پر خوف اور گھبراہٹ طاری ہو گی اور جسم سے ٹھنڈے پسینے کے قطرے چھوٹنے لگے کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں سفر کے دوران جہاز اور کشتیاں مسافروں سمیت غائب ہو جاتی ہیں اور پھر ان کا کوئی بھی اتہ پتہ نہیں چلتا۔اس نے خود کو خطرے میں محسوس کرتے ہوئے اپنے ادارے کو ساری صورت حال سے واقف کرانے کے لیے پیغام بھیجنا چاہا لیکن حیرت انگیز طور پر اس کے جہاز میں نصب مواصلاتی نظام کے ساتھ ساتھ اس کی گھڑی اور کیمرہ نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔اس کے خوف میں تب اور اضافہ ہوا جب اچانک اس کی خلائی جہاز کو تیز آندھی اور چمکدار بادلوں نے گھیر لیا لیکن خوف کے باوجود اس کے حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی اور اس نے خلا کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔وہ خلا میں اڑان بھرتے ہوئے، بہت دور پہنچ گیا تھا کہ دفعتاً اس کی خلائی جہاز کو چند اڑن طشتریوں نے گھیر لیا جن کے پائلٹ خوفناک انداز میں اسے

گھور رہے تھے اور اشاروں سے جہاز کا رخ موڑنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہ ان کے اشاروں کو نظر انداز کرتا رہا لیکن آخر ان کے تیور دیکھ کر اس نے جہاز کا رخ موڑا اور ان کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنے نقشِ راہ کے مخالف سمت اپنا سفر جاری رکھا۔ اب اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ بھی اس طرف سفر کرنے والے غائب ہو چکے ان سینکڑوں لوگوں کی طرح اغوا ہو چکا ہے۔ اس کے اندازے کے مطابق بیسیوں گھنٹوں کے سفر کے بعد اسے ایک جگہ، جو ایک نئی ہی دنیا تھی، ایک صاف وشفاف کھلے میدان میں، جہاں رنگا رنگ پانی کی نہریں بہتی تھیں، خلائی جہاز اتارنے کی ہدایت دی گئی اور جہاز سے نیچے آتے ہی اس کو ہتھیاروں سے لیس ایک نئی ہی مخلوق کے لوگوں نے گھیر لیا جنھیں دیکھ کر اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہی خلائی مخلوق (ایلین) ہے۔

اس کے دل میں ایک طرف جہاں یہ خوشی تھی کہ برسوں بعد خلائی مخلوق سے رابطے کی اس کی کوششیں رنگ لانے والی ہیں وہیں طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے بھی جنم لے رہے تھے کہ نہ جانے یہ اجنبی مخلوق اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی، واپس زمین پر جانا اس کے نصیب میں ہوگا بھی کہ نہیں۔ جامہ تلاشی کے بعد اسے پاس ہی واقع ایک عمارت میں لے جایا گیا اور پوچھ تاچھ شروع کی گئی۔ اس نے بغیر کسی لگی لپٹی کے اپنے مشن کے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتایا، بہرحال کئی گھنٹوں کی سخت پوچھ تاچھ کے بعد بغیر کوئی اذیت پہنچائے۔ اسے وہاں سے واپس نکالا گیا اور آرام دہ سواری میں بٹھا کر پاس ہی واقع ایک عالیشان خوب صورت محل تک پہنچایا گیا جو ٹمٹماتی روشنیوں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا اور وہاں بھینی بھینی خوشبو کی فواری برس رہی تھی۔ کچھ لمحے صحن میں انتظار کرنے کے بعد اس کو محل خانے کے اندر لے جایا گیا جہاں تخت پر براجمان ایک پُروقار حسینہ، جس پر سپیدۂ سحر کا ہالہ چھایا ہوا تھا، وہاں موجود بیسوں درباریوں سے محوِ گفتگو تھی، اس کے اندر جاتے ہی سارے درباری اس کی تعظیم میں کھڑے ہو گئے اور ملکہ شیریں لہجے میں گویا ہوئی۔

"خوش آمدید۔۔۔اے اولادِ آدم"۔

"بہت بہت شکریہ ملکہ صاحبہ۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کر ملکہ کا شکریہ ادا کیا۔

"آپ ڈینجرز زون کی طرف کس مقصد سے جا رہے تھے؟"

"ملکہ صاحبہ۔۔۔۔وہ۔۔۔۔دراصل مجھے۔۔۔۔۔۔"

اس سے کوئی جواب نہیں بن پا رہا تھا کیوں کہ ڈینجرز زون کے بارے میں اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا اور تھوڑی دیر پہلے ہوئی پوچھ تاچھ کے دوران ان ہی کی وساطت سے وہ اس بارے میں جان چکا تھا۔

"شکر کرو کہ ہمارے سرحدی محافظوں نے آپ کو وہاں جانے سے روکا، جہاں جانے والے کبھی

واپس نہیں لوٹتے۔ آپ زمین والوں کا یہ المیہ ہے کہ آپ کارخانہ قدرت میں بے جا مداخلت کر کے اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہے ہو"۔

اسے جب کوئی جواب نہیں بن پایا تو ملکہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور اپنا کلام جاری رکھتے ہوئے حکم صادر فرمایا۔

"اس خاص مہمان کو عزت و توقیر کے ساتھ مہمان خانے میں ٹھہرایا جائے، خیال رہے کہ اسے کوئی پریشانی نہ ہو"۔

اسے مہمان خانے میں لے جایا گیا جہاں اس کی خدمت کے لیے کئی خادم موجود تھے، جنھوں نے اس کی خدمت میں کوئی کسر نہیں اٹھائے رکھی۔ انتہائی لذیذ پھل، مشروبات اور دیگر انواع و اقسام کی غذائیں لاکر اس کے سامنے رکھی گئیں۔ اسے چونکہ بہت بھوک لگی تھی سو اس نے بھی خوب پیٹ بھر کے کھالیا اور تھکان دور کرنے کے لیے وہاں موجود انتہائی خوبصورت پلنگ پر بچھے نرم و گداز بستر پر لیٹتے ہی نیند کی میٹھی آغوش میں چلا گیا۔ نہ جانے کتنی دیر تک محو آرام رہنے کے بعد جب وہ جاگا تو سب کچھ ویسا ہی تھا یعنی دن اور رات کا وہاں کوئی تصور نہیں تھا۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کا جائزہ لینے کے بعد اس نے نہانے کی خواہش کا اظہار کیا تو ایک خادم اسے مہمان خانے کے اندر ہی موجود سوئمنگ پُول تک لے گیا، نہانے کے بعد جب وہ واپس آیا تو خادموں نے اس کے سامنے انتہائی لذیذ قہوہ پیش کیا۔ قہوہ نوش کرنے کے بعد اس نے ملکہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ایک خادم نے اس کی یہ خواہش ملکہ تک پہنچادی اور کچھ دیر بعد ہی اسے ملکہ کے سامنے پیش کیا گیا۔

"اے اولادِ آدم۔۔۔۔۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

ملکہ نے انتہائی مشفقانہ لہجے میں پوچھا۔

اس نے اپنا تعارف دینے کے بعد اپنے مشن کے بارے میں بتانے کے ساتھ ساتھ اہل زمین کی ترقی کے بارے میں بھی تفصیل سے جانکاری دی اور زمین والوں کی اس خواہش کا اظہار کیا کہ زمین والے آپ کی دنیا کے ساتھ اچھے تعلقات اور رشتے قائم کرنا چاہتے ہیں۔

"اولادِ آدم۔۔۔ ہمیں زمین پر رونما ہونے والے واقعات کی پل پل کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ اہل زمین کے ترقی کے سارے دعوے کھوکھلے ہیں۔ وسائل کے فراوانی کے باوجود وہاں بھوک ہے، غربت ہے اور اولادِ آدم کی خود غرضیوں کے سبب فتنے فساد اور خون ریزی کے بے شمار واقعات رونما ہو رہے ہیں۔۔۔۔ قدرت کا شاہکار سیارہ زمین ابن آدم کے خون سے ہی لالہ زار ہو رہا ہے۔"

ملکہ نے بے رخی سے جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ ملکہ کی باتیں پگھلا ہوا سیسہ بن کر

اس کے کانوں میں اتر گئیں۔ خفت اور خجالت سے اس کا وجود گندی نالی میں پڑی ہوئی اوجڑی کی طرح سڑنے لگا۔

"ملکہ کا اقبال بلند ہو۔۔۔۔آپ نے میرے سوال کا پورا جواب نہیں دیا۔"

کچھ دیر انتظار کے بعد وہ ملکہ سے مخاطب ہوا۔

"کوئلے کی کان میں ایک بار بھی جانے والوں کے مُنہ اور ہاتھ کالے ہو کے ہی رہتے ہیں۔"

"ملکہ صاحبہ۔۔۔۔میں کچھ سمجھا نہیں؟"

"آپ زمین والوں تک ہمارا یہ پیغام پہنچا دو کہ جب تک وہاں امن و امان، باہمی بھائی چارہ، محبت ،انصاف اور سچائی کا پرچم بلند نہیں ہو گا تب تک ہم یہاں کے قانوں کے مطابق زمین والوں سے کوئی بھی تعلق یا رشتہ قائم نہیں کر سکتے۔ آپ جب تک چاہو ہمارے مہمان بن کر رہ سکتے ہو"۔

ملکہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا اور اسے واپس مہمان خانے میں لے جایا گیا، جہاں کچھ دیر سنجیدگی سے غور فکر کرنے کے بعد اس نے واپس اپنے سیارے پر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ملکہ سے اجازت لے کر کچھ لوگوں نے اسے اس کی خلائی جہاز تک پہنچایا اور اڑن طشتریوں میں سوار ہو کر اپنی نگرانی میں اس کو اپنے سیارے کے سرحد تک پہنچا کر واپس چلے گئے۔ اسے اپنے مشن کی ناکامی کا سخت افسوس تھا اور وہ سوچوں کی بھول بھلیوں میں گم ہارے ہوئے جواری کی طرح زمین کی طرف واپس آنے لگا۔

"اہل زمین کے ترقی کے سارے دعوے کھوکھلے ہیں۔۔۔۔قدرت کا شاہکار سیارہ زمین ابن آدم کے خون سے ہی لالہ زار ہو رہا ہے۔۔۔۔"

ملکہ کے کہے ہوئے یہ الفاظ اذیت بن کر اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہی وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں ایک راستہ ڈیغرزون کی اور دوسرا زمین کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے زمین کی طرف ایک بھرپور نفرت بھری نظر دوڑائی اور عالم یاس و اضطراب میں اچانک خلائی جہاز کا رخ ڈیغرزون کی طرف موڑ دیا۔

☆☆☆☆

ترجمہ: نسیم سید (کینیڈا)

میں ماں ہوں

(بلیک فٹ (Black Foot) ایک قبیلے نام ہے۔ ابورجنل باشندوں کے ایک قبیلے کا نام ہے بلیک فٹ اور یہ ان کا ایک لوک گیت ہے)

مقدر میں جو میرے وقت تھا
سب خرچ کر آئی
میں سب رشتے برت آئی
وہ میری روح کے رشتے

ضرورت کے تقاضوں کے وہ رشتے
بھوک میں بھونے ہوئے
دن رات کی محنت کے رشتے
کسی بے نام رشتے کی
وہ لمبی اور ٹھنڈی، گہری راتیں
عشق کے پہلو سے
میرے تن میں جو

سورج کے جیسے گرم اجیالے
سجاتی تھی
وہ سب یادیں
وہ سب لمحے

بدن کی بوڑھی گٹھڑی میں سمیٹے
دور گھر سے
سرد اور ٹھنڈی زمیں پر
سر جھکائے بے اماں ہوں
مرے ماحول اور میرے رواجوں کا یہ کہنا ہے
کہ سب رشتوں کی ہمراہی میں
جینے کے لیے
سینے کے مرکز میں
دہکتا گرم لوہا چاہیے
بوڑھے بدن میں، جیسی میں اب ہوں (بہت سی بھربھری ہڈی کا ڈھانچہ)
وہ جو سینے میں دھکتی ہمتوں کی
آگ والی دھونکنی کو
دھونکنے لائق نہیں رہتے
انھیں چپ چاپ گھر کو چھوڑ کے
اپنے لیے کوئی ٹھکانہ ڈھونڈنا ہوگا
رواجوں کا مرے فرمان ہے یہ
سو گھر سے دور
میں ٹھنڈی زمیں پر منجمد ہوں
یہ فر کا کوٹ
یہ کمبل، یہ میرے بوٹ
حاصل ہیں یہ میری زندگی کا
بس یہی میرا اثاثہ ہیں

میں خود کو گرم رکھنے کے لیے
رشتوں کے بارے میں
جو میں نے گیت گائے تھے
مسلسل گنگنا کے
اپنے سینے میں اترتی برف کو
پگھلا رہی ہوں
مسلسل گنگنا کے خود کو میں بہلا رہی ہوں

مرے وارث
ادھر سے گر کبھی گزرے
تو جو کچھ بچ رہیں گی بھیڑیوں سے
ہڈیاں میری
یہ میرا کوٹ فرکا، بوٹ میرے۔ میرے موزے
وہ۔۔
تبرک جان کے لے جائیں گے ہمراہ اپنے
اور میں۔۔۔
ان کی حفاظت کے لیے
خیموں پہ ان کے
روح کا اپنی
بہت مضبوط اک خیمہ لگا دوں گی
کہ میں۔۔۔اک ماں ہوں
یہ دستور میرا ہے

☆☆☆☆

نصر ملک۔ (کوپن ہیگن۔ڈنمارک)

ان کہانیوں کے بارے میں

شمالی بحر اوقیانوس میں گھرے، جزائر فیرو کی تین کہانیاں بعنوان آسمانی سفر، بھوک اور جونکیں آپ کے ذوق مطالعہ کی نذر ہیں۔ان کہانیوں میں اسکینڈے نیویا کے اس دورافتادہ ملک کے مصنفین کاانداز بیاں،ان کے اس روایتی طرزِ تکلم کی نشاندہی کرتا ہے جو پچھلی دو صدیوں سے جزائر فیرو کی ادبی شناخت کا علمبر دار سمجھا جاتا ہے۔میری معلومات کے مطابق جزائر فیرو کے کسی ادیب کی کوئی کہانی اب تک اردو میں نہ کبھی ترجمہ ہوئی اور نہ ہی شائع ہوئی۔

یہ پہلا موقع ہے کہ یہاں جزائر فیرو کی تین کہانیوں کا اردو میں ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔جزایر فیرو کے ادیب وشعرا اگرچہ اپنی زبان میں لکھتے ہیں لیکن بیش تر اپنی تخلیقات ڈینش زبان میں بھی لکھتے ہیں یا ان کا خود ہی ڈینش زبان میں ترجمہ کرتے ہیں۔میں نے یہ کہانیاں ڈینش زبان سے اردو میں ترجمہ کی ہیں۔ڈینش جزائر فیرو کی دوسری زبان ہے۔جزائر فیرو اگرچہ اب ایک نیم خودمختار ملک ہے لیکن ابھی تک تاجِ ڈنمارک کے زیر تسلط ہے۔

☆☆☆☆

ولیئم ہیلمن
ڈینش زبان سے ترجمہ: نصر ملک

آسمانی سفر

اس کے لیے وہ محض ایک عام لڑکی تھی۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ جس کے ساتھ وہ رفاقت کر رہا تھا وہ "اشتراوت" تھی، قدیم چاند دیوی، جو محبت کی دیوی تھی اور جسے موت اور پیدائش پر بھی اختیار حاصل تھا۔

اس نے مذاقاً اس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اسے اپنی کشتی میں بٹھا کر کواکب کے ہجوم میں نیلے ستارے کی طرف لے جائے گا اور سیر کرائے گا۔ یہ فطری طور پر اس کی طرف سے اچھی نوعیت کا سلوک تھا اور اسے یقیناً توقع نہیں تھی کہ وہ اس کی دعوت کو سنجیدگی سے قبول کر لے گی۔ لیکن ایک سہانی شام جب وہ اپنی کشتی کو تیار کر رہا تھا وہ، ساحل پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہیں تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ کشتی میں بٹھا کر دور گہرے پانی میں لے جائے۔

جونہی اس نے کشتی ساحل سے پانی میں اتاری تو اس کی چھاتی میں خوشیوں کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ وہ سوچ بچار کرنے والا ایک ذہین شخص تھا، موسیقی اور شاعری تو اس کی رگوں میں بسی ہوئی تھی۔ اور وہ، وہ تو بس خوبصورتی کا مجسمہ تھی، .. پرستش کی مستحق!

"چند سالوں میں میری کشتی اپنے پیندے کے ساتھ ساحل پر پڑی ہوگی، جب کہ یہ لڑکی ابھی تک ایک کھلی ہوئی کلی، قابل تحسین و پرستش ہے"، اس نے سوچا۔ "لیکن مجھے اس سب سے کیا، جب تک وہ یہاں میری کشتی میں بیٹھی ہوئی ہے میں اس کی حیرت انگیز جوانی کا وزن محسوس کر سکتا ہوں۔"

سمندری پانی ایک براق آئینہ، آسمان کے ستاروں کو گود میں سمیٹے ہوئے تھا اور وہاں ایک عجیب، جادوئی کیفیت تھی، جو اس دنیا سے نہیں تھی۔ اوپر آسمان پر اور نیچے سمندر میں ستارے چمک رہے تھے، اور اب ایک طرح سے وہ دونوں کہکشاں ہی پر چل رہے تھے۔ اور پھر اچانک تاریکی میں سے، بہت ساری جیلی مچھلیوں کی طرح تیرتا ہوا "پلیاڈوس" نمودار ہوا۔ اور یہاں تک کہ اجنبی آسمانی جیلی مچھلی خود بھی منظر پر آ گئی، بالکل "اینڈ ومیڈا"، وہ قدیم ایتھوپیائی اساطیری شہزادی کی طرح کی، جبکہ وہ دور دراز کائنات جس کی روشنی کو زمین اور انسانی آنکھ تک پہنچنے میں دس لاکھ سال لگتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کائناتی سمندری مخلوقات سے کہیں زیادہ آنکھوں کو خوبصورت، حسین و جمیل لگتی ہے۔ اب یہی منظر تھا، اس کی نگاہیں، سمندری لہروں میں حیرت انگیز طور پر چمکتے

ہوئے "دبِ اکبر" اور اس کے ساتھی ستاروں کو درخشاں و تاباں دیکھ رہی تھیں۔

"کیا ہم جلدی وہاں موجود ہوں گے؟" نوجوان عورت نے پوچھا۔

"آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں، میں تو یہی کہوں گا"، اس نے ہلکی ہلکی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بڑی خوشی سے جواب دیا۔

وہ پُراسرار طور پر مسکرایا، اور اب ایک بار پھر اس کے اندر دھنیں بج رہی تھیں۔

لیکن اب جب وہ اٹھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، اس نے دیکھا کہ کشتی واقعتاً اس طرح اوپر اٹھنے لگی تھی جیسے اسے کوئی بڑے مضبوط پر لگے ہوں۔ اب وہ وہاں بیٹھا ہوا میں پیڈل مار رہا تھا۔ اس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ وہ چپو کے ساتھ لیٹ گیا اور اپنے ہی خوبصورت خیالوں میں خواب دیکھنے لگا، جہاں وہ محسوس کر سکتا تھا کہ کس طرح فضا اور وقت کا تناسب تیزی سے مسخ ہو جاتا ہے۔

اب اس کی حیرت نے اسے جلد ہی تکلیف و اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ کیوں کہ جیسے جیسے رفتار بڑھتی گئی اور کشتی زمین کے ماحول سے باہر نکلتی گئی، ایک ناخوشگوار بدبختی ہر شے پر چھا گئی۔ آسمان کے نیلے رنگ کی جگہ اب سیاہ بدصورتی نے لے لی تھی اور ستاروں نے بھی چمکنا چھوڑ دیا تھا۔ آسمانی خوبصورتی اور انسان دوستی ان کی آنکھوں سے تقریباً مٹ گئی تھی، اور وہ اندھیرے میں برف کے ٹھوس ڈلوں کی طرح لٹک رہے تھے۔

چاند کی حرکت رک گئی تھی۔ اس کا حلقہ جو زمین سے کہیں اونچا ہے، غلاظت و غربت کا یوں تاثر دے رہا تھا جیسے کسی نے کسی مرحلے کی پسماندہ شاخوں کو چھوڑ دیا تھا۔ اس نے خوف کی زد میں یہاں تک دیکھا کہ زمین بھی ایک افسوسناک شکل میں بدل گئی تھی۔ بالکل ایک دھندلی سرخ لالٹین کی یاد دلانے والی کوئی شے۔ اس طرح کی بجھی بجھی ہوئی لالٹینوں کو دیکھا جا سکتا تھا۔ ناقص، پرانے زمانے کے لیمپ جنھیں وقت نے بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ مریخ اور وینس، مشتری اور زحل، اور یورانس و نیپچون۔ ان میں سے ایک کو خاص طور پر نوادرات، آرائشی حلقوں اور کٹھ پتلیوں کے المناک انداز میں دوسروں سے ممتاز کیا جا سکتا تھا، جو اس متجسس غبارے "آرنین" کی یاد دلاتا تھا جس میں بیٹھ کر سویڈش مہم جو آندرے نے قطب شمالی تک پہنچنے کی کوشش میں اپنی جان گنوا دی تھی۔ یا پھر یہ مٹی کے تیل کے ان لیمپوں میں سے ایک تھا جو اب بھی ملک کے دیہی علاقوں میں پرانے زمانے کے پارلروں میں پائے جاتے ہیں۔ ان سب پرانے چھت والے لیمپوں سے درحقیقت مٹی کے تیل اور زہریلے بخارات والی بے ہوشی کی بو آ رہی تھی۔ سورج، جو صدی کے موڑ کے گرد کچھ ناخوشگوار طور پر ہنستے اور پھیلتے ہوئے منقل لیمپ کی طرح چڑھائی میں موجود تھا، اب بہت پیچھے چلا گیا تھا۔ اندھیرا تقریباً مکمل ہو گیا تھا، لیکن اس میں کوئی طاقت نہیں تھی۔ درحقیقت، کائنات کی وسعت جو زمینی افادیتی نقطے سے طاقت کو اس طرح

کا بلند مقام بخشتی ہے، اب یہ محض غربت کے ایک بھاری بھرکم اور بے معنی بوجھ کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ یعنی اک گھٹیا خانہ، ایک تنگ اور بہت خستہ حال گودام!

اب وہ اپنی منزل، روشن ترین، شلیاق ستارے کے قریب پہنچنے والے تھے، لیکن افسوس وہ بھی نا امیدی کا ایک بے مقصد اور دلچسپی سے بالکل خالی ایک سیاہ مجسمہ نکلا۔

"کیا اس میں بھی کچھ ہے؟" لڑکی نے پوچھا، جو کشتی کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اب اس کے پاس کچھ کہنے، کرنے کو تھا نہیں، سوائے اس کے کہ وہ اپنے بے بس ہونے کی تصدیق کرے۔

اب اس نے وحشت اور کپکپی کی صورت حال میں دیکھا کہ لڑکی کا جوان چہرہ بھی بدل کر سست اور مدھم ہو چکا تھا۔ اور اس کے چہرے کے خد و خال کی خوبصورت خصوصیات غائب تھیں اور اس پر جھریاں ابھر آئیں تھیں۔ گال کھوکھلے تھے، اور اس کے منہ کے کونوں پر سیاہ لکیریں نمودار ہو رہی تھی۔ اور اس کے گھنے، بھرے، طلسماتی آتش گیر بال، راکھ کی طرح سفید اور بے جان ہو چکے تھے۔

"مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔" اس نے ایک سسکی آمیز انداز میں سوچا، اور پھر خود کو ایک مایوس کن پسپائی پر چھوڑ دیا۔ "اس سب کا مطلب، صرف ایک مذاق ہی تھا"، وہ زیر لب بڑبڑایا۔

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا، اس کے پاس بھی مزید کچھ کہنے کو نہیں تھا۔ اس نے اپنے تئیں مزید غور و فکر کرتے ہوئے اپنی پوری طاقت سے کوشش کی کہ جو کچھ بھی ہوا ہے اس کی وجہ سے ان خوفناک چیزوں کی وضاحت حاصل کی جا سکے۔ لیکن اسے اس جواب کے سوا کچھ اور نہ مل سکا کہ "یہی آخیر ہے: موت اسی طرح آتی ہے۔"

اور اب، اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کا دل مرجھا رہا ہے اور اس کی شریانوں نبض کس طرح سست پڑتی جا رہی ہے۔

اب آہستہ آہستہ کچھ تھوڑے سے خوف اور پچھتاوے نے اسے ایک ناقابل بیان تھکاوٹ اور ٹھنڈ سے دو چار کر دیا۔ اس نے اپنی گردن جھکا کر اپنے چہرے کو اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ لیکن اچانک اسے محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا ہے۔ اس کے دل میں امید کی ایک لہر پھیل گئی، اور جب اس نے اپنا سر اٹھایا تو اس نے بڑی حیرت سے دیوی کی نگاہوں میں دیکھا اور جان لیا کہ یقیناً کوئی معجزہ رونما ہوا ہے۔

تشکر اور نئی امیدوں سے دو چار، اس نے دیکھا کہ زندگی کس طرح ایک جوان و خوبصورت عورت کی خصوصیات کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں نرم چمک آ گئی اور، اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور پھر

اچانک وہ بڑی گرمجوشی سے مسکرایا اور پھر اس نے بڑے جوش اور گہری خوشی سے ایک لمحے کے لیے ایک دم آنکھیں بند کر کے، خود کو اس کے حوالے کر دیا۔

اب جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنی کشتی میں تنہا بیٹھا ہوا تھا اور وہ چپو پر اپنے ہاتھوں کی گرفت محسوس کر سکتا تھا۔ بلور کی طرح شفاف، بڑی بڑی سمندری لہریں آسمان کو چھو چھو کر اب تھک چکی تھیں۔ اس نے اپنے جسم کی پوری مضبوطی کے ساتھ ایک گہرا سانس لیا۔ بلور کی مانند ہموار اور خوشبو سے معطر، ٹھہرا ہوا سمندر، اس نے ایک بار پھر گہری سانس لی۔ اب اس نے ایک بار پھر سات ستاروں کے جھرمٹ کو دیکھا جو اسے شبنم میں بھیگے ہوئے نارنجی موتیوں کی طرح محسوس ہوئے، اور وہ "اورین برج"، آسمان کا دسواں بڑا ستارہ، ایک سرخ رنگ کا چمکدار ہالہ! لہروں میں اس کی عکاسی، روشنی کی چمک، سب کچھ اس کے سامنے تھا۔

کہکشاں کا ایک طویل و لامحدود حد تک پھیلا ہوا سلسلہ، ستاروں کی جھلملاہٹ جو وقت اور مادے کا اس قدر ناقابل فہم وزن برداشت کرتا ہے لیکن ایک جاندار کی روحانی روح سے بھی ہلکا ہوتا ہے۔

ان سارے راس چکروں کی لرزتی کانپتی چمک دمک یوں تھی کہ انسانی روح میں محبت کی حیرت کی عکاسی ہوتی تھی لیکن وہ دیوی تو جا چکی تھی۔ اس کا بوسہ اب بھی اس کی روح میں برقی لہروں کی طرح ٹکا ہوا تھا، اور اس کے بالوں کی ہلکی خوشبو اب بھی ہوا میں موجود تھی اور اس میں سمندری نمک اور ساحل کی گیلی ریت کی تازہ باس بھی ملی ہوئی تھی۔

لیکن دیوی تو جا چکی تھی۔

وہ گہری حیرت میں کھویا ہوا کشتی سے اترا اور آہستہ آہستہ ساحل پر چلنے لگا۔

☆☆☆☆

ماڈس انڈری آس وتھر
ڈینش زبان سے ترجمہ: نصر ملک

بھوک

سیسال ایک بہت ہی غریب لڑکی تھی۔ اسے گرجا گھر میں ہمیشہ پچھلی نشست پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ بیلا بھی اپنے بچوں کے ساتھ یہیں بیٹھتی تھی۔ انھی کی طرح غریب بوڑھا لارس بھی اپنی بیوی کے ساتھ یہیں بیٹھا کرتا تھا۔ یہ سبھی "بھوک" کے معنی و مطلب بہت اچھی طرح سمجھتے اور جانتے تھے۔

اس اتوار کو سیسال کے گرجا گھر پہنچنے سے پہلے ہی گرجا گھر میں عبادت کے لیے سبھی پچھلی نشستیں بوڑھے غریب لوگوں سے بھر چکی تھیں۔ اس نے نشستوں کے پیچھے سب سے آخر میں برآمدے والے دروازے کے قریب اپنے لیے ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی تلاش کر لی۔ گرجے میں ویسا ہی ہوتا ہے جیسا ہر جگہ ہوتا ہے۔ اچھے کھاتے پیتے، اشرافیہ میں شمار ہونے والے بااثر لوگ اگلی نشستوں پر اور غریب غربا سب سے پیچھے۔ ہر اتوار کو یہاں ایسا ہی ہوتا تھا۔ سیسال، بیلا، لارس اور ان کی طرح پچھلی نشستوں پر بیٹھنے والے اس پرانی رسم کو توڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ گرجا گھر میں جب بھی تبرکات یا متبرک روٹی اور سرخ شراب بنام خداوند برائے بندگانِ خداوند تقسیم کی جاتی تو ان پچھلی نشستوں پر بیٹھنے والوں کی باری سب سے آخر میں آتی اور اکثر و بیشتر اوقات وہ ان تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی۔

سیسال بڑی باقاعدگی سے ہر اتوار گرجے میں جاتی تھی۔ اور پادری کی تبلیغ میں اپنے لیے بہت آرام و سکون محسوس کرتی تھی۔ پادری ہر اتوار کو غربت اور غریب لوگوں کو بہت سراہتا اور ان کی خاص تعریف کیا کرتا تھا۔ وہ بڑے زور سے کہا کرتا تھا کہ اِن لوگوں کے لیے جنت میں داخل ہونا اور، خداوند خدا کی بادشاہی میں جگہ پانا بہت ہی آسان ہوگا۔

"خداوند کی بادشاہی میں کسی امیر آدمی کے داخل ہونے کے مقابلے میں ایک اونٹ کا ایک سوئی کے نکے میں سے گزرنا آسان ہے۔" وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ اور پھر اس کی تشریح کے دوران مثالوں سے ثابت کرتا تھا کہ غریب ہونا کتنا اچھا ہے۔

سیسال پادری کے اِن وعظوں سے بڑی متاثر تھی اور اسے یقین تھا کہ عبادت کے دوران گرجے میں اگلی نشستوں پر بیٹھنے والے خدا کے ان لفظوں کو اپنے دل میں محسوس کریں گے اور بیلا، لارس اور خود اس

کے اپنے جیسے بھیک مانگنے والے غریب لوگوں کے لیے سخاوت سے کام لیں گے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ بڑے بڑے لقمے ایسے لوگوں کے حلق سے نیچے نہیں اترتے۔ غربت و تنگدستی کی وجہ سے صرف خیرات پر گزر بسر کرنے کو یقیناً زندگی بسر کرنے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ سیسال یہ بہت اچھی طرح جانتی تھی !

وہ قصبے کے امیر ترین آدمی، جوگوان آبریگو کے گھر جب کبھی جاتی تو اسے یقین ہوتا تھا کہ وہاں اسے یہ ضرور سننا پڑے گا کہ دوسری جگہوں کے لوگ کتنے آسودہ و خوشحال ہیں۔ جوگوان کی رکھیل زمینی اشیا کی بڑی دلدادہ اور پرستار تھی، کوئی نا کوئی ایسی بات ضرور کہے گی۔۔۔ اور اس دنیا کے امیر لوگ۔۔۔! وہ ہر اتوار کو گرجے میں سامنے کی پہلی نشست پر اس وقت تک بیٹھی دکھائی دیتی تھی جب پادری عبادت کرانے میں مصروف ہوتا تھا۔ اور پھر اسے خراٹے لینے کی بری عادت تھی اور وہ خراٹے رہتی تھی جس کی آواز پچھلی نشستوں کے آخیر تک سنی جا سکتی تھی۔

سیسال کو اس موقع پر اونٹ اور سوئی کے نکے والی مقدس کہاوت یاد آ جاتی۔

''سیسال تم بہت خوش قسمت ہو۔ تمہارے پاس سوچنے کو کچھ بھی نہیں اور نہ ہی تمہارے پاس کچھ کھونے کو ہے۔ تمہیں اپنی اس زندگی پر شکرگزار ہونا چاہیے جو تم بسر کر رہی ہو''۔ جوگوان کی رکھیل اکثر اس سے کہا کرتی تھی۔

لیکن سیسال شکرگزار نہیں تھی، وہ بالکل اکیلی تھی اور دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا اور بیشک خداوند خدا جانتا تھا کہ وہ کوئی زیادہ مطالبہ کرنے والی نہیں تھی لیکن پھر بھی اکثر و بیشتر اسے بھوکی رہنا پڑتا تھا۔ بیلا کے لیے بھی زندگی آسان و بہتر نہیں تھی، اسے اپنے بچوں کے لیے خوراک دکھانے کا بندوبست کرنا ہوتا تھا جو بے حد محال تھا۔ خوراک کہاں سے آئے وہ اسی فکر میں رہتے ہوئے سوچتی رہتی تھی۔

اور پھر ایک دن سیسال مر گئی۔

بیلا ماتم کناں تھی کی سیسال کی موت کا سبب سراسر غربت و بھوک ہے۔

قصبے کا ڈاکٹر بھی یہی کہہ رہا تھا۔ بھوک اور صرف بھوک! وہ سیسال کی لاش کا معائنہ کرنے کے بعد قصبے کے لوگوں اور اچھے کھاتے پیتے امیر افراد کے پاس گیا۔

''یہ تم ہی ہو جنھوں نے سیسال کو بھوک سے مارا ہے، یہ تم ہو جو اس کی موت کے ذمہ دار ہو!۔''

ڈاکٹر چلا رہا تھا۔

''ہم؟ آپ کی خیر ہو! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم نے تو سیسال کو نہیں مارا!، خداوند خدا اس کی مغفرت کرے اور آپ کو بھی معاف کرے! اسے کمیونٹی کی طرف سے پورے پچیس کرونا سالانہ دیے جاتے تھے۔''

کمیونٹی سرپرست نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔
"پچپیس کرونا"، ڈاکٹر دانت پیس رہا تھا۔
"ہاں یہ پچپیس کرونا سالانہ کسی غریب و کمزور اور وہ جو تمھاری نظر میں نیچ مخلوق ہوتے ہیں انھیں مارنے کے لیے کافی ہو سکتے ہیں!"۔
"میں ہر روز دولت مندوں کو گرجے میں یہی تبلیغ کرتا ہوں کہ وہ خداوند خدا کی بادشاہی میں داخل ہونے کے لیے اپنی خاطر کس طرح آسانیاں پیدا کر سکتے ہیں۔ مجھے یہ امید ہوتی تھی کہ وہ اپنے لیے آسانیاں حاصل کرنے کی خاطر کچھ خیرات دے دیا کریں گے۔" پادری جو ایک کونے میں کھڑا تھا، بولا ۔
"میں نے تو اپنی ذمہ داری پوری ایمانداری سے نبھائی ہے۔"
"میں اس بارے میں تمھارے ساتھ کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا"، ڈاکٹر بولا ۔ وہ خود بھی کسی حد تک خود کو گناہگار محسوس کر رہا تھا۔ "میں تمھیں صرف ایک بات بتانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ، بیلا کے بچے، لارس، پیٹ آرا اور ان کی طرح کے کئی دوسرے یہاں قصبے میں غربت کی وجہ سے بھوکے رہ رہے ہیں۔"
پادری نے قصبے کی کونسل کے ساتھ ایک میٹنگ کی۔
"ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" چیئرمین نے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔
"ہم کیمونٹی پر زیادہ بوجھ نہیں ڈال سکتے!" کونسل کے سبھی ارکان یک زبان ہو کر بولے۔
"نہیں ہم ایسا نہیں کر سکتے"، پادری بولا۔
"لیکن ہم ان تمام غریب بچوں کو اچھے گھروں میں ڈال سکتے ہیں، جہاں وہ کوئی چھوٹا موٹا کام کر سکتے ہیں۔ کچھ کو یہاں قصبے ہی میں رکھا جا سکتا ہے اور کچھ کو جزیرہ ڈیمون پر بھیجا جا سکتا ہے۔ یہ گھروں کے اندر اور باہر کھیتوں وغیرہ میں کام کر سکتے ہیں اور بدلے میں بہت اچھی گزر بسر کر سکتے ہیں"۔
پادری کی اپنی امید بھر آئی تھی اور سبھی دوسروں نے بھی سکھ کا سانس لیا اور پادری کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے انھیں ایک نیک نصیحت کی۔
"تم شاید اس سارے بندوبست کی خود حفاظت کر سکو" کونسل کے ارکان نے کہا۔
"میں اس سارے معاملے سے دور رہنا اچھا سمجھتا تھا لیکن اب میں کچھ نا کچھ تو کروں گا کیونکہ تم لوگوں نے کہا ہے، اب مجھے کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔" پادری بولا ۔
اگلے دن پادری بیلا کے پاس گیا۔
"دن بخیر، خدا کی رحمت ہو تم پر، بیلا تمھارا کیا حال ہے؟"۔

"خداوند خدا خوب جانتا ہے کہ میرا حال کیسا ہے، وہی تو ہے جس نے اس حال میں رکھا ہوا ہے، آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک ایسے گھر میں جہاں مجھ جیسی غریب عورت کو گھر داری کے ساتھ کئی بچوں کے لیے خوراک اور دیکھ بھال کا بندوبست کرنا پڑے وہاں کا حال کیسا ہو سکتا ہے۔ ہمارے لیے بیشتر اوقات مشکلیں ہی ہوتی ہیں اور یہ کوئی مبالغہ یا جھوٹ نہیں۔"

بیلا نے کہا۔

پادری اپنے اردگرد ایک کمرے پر مشتمل بیلا کے گھروندے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"اف خدایا یہاں کتنا بنجر پن اور تکلیف دہ ماحول ہے!۔"

پادری زیرلب بولا۔ بیلا اور اس کے بچوں کی ظاہری حالت وہ سب کچھ بتا سکنے کو کافی تھی جو بیلا اپنی زبان سے نہیں کہہ پا رہی تھی۔

"ہاں، ہاں! اچھا تو یہ اس طرح ہے۔ زندگی بعض لوگوں پر دوسروں کے مقابلے میں بہت سخت ہے اور اسی لیے ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی ہے۔ اور ہاں! ہم نے اس بارے میں بات چیت کی ہے، اور میرے خیال میں تمھارے لیے یہی اچھا ہوگا کہ تم اپنے بچوں کو کسی اچھے گھر میں ڈال دو۔ میں اس کے لیے تمھاری مدد کروں گا۔" پادری بولا۔

"خدا آپ کو معاف کرے!"

بیلا بولی۔ اس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو! میں اپنے بچوں کو خود سے کیسے علیحدہ رکھ سکتی ہوں؟۔"

پادری اس پر زور دیتا رہا کہ اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ بھی نہیں تھا۔

بیلا رو رہی تھی لیکن پادری بڑے آرام سے بڑے ہی مہربانہ الفاظ میں اسے سمجھا رہا تھا اور پھر جیسا وہ چاہتا تھا، یہ ملاقات اسی طرح ختم ہو گئی۔

انھوں نے بیلا کے تمام بچوں کو اس کے گھر سے اٹھا لیا۔ وہ بے حد روتی اور مسکین آنسو بہاتی رہی۔ بچوں کی حالت بھی کچھ کم نہ تھی۔ لیکن وہاں کوئی فریاد سننے والا تھا ہی نہیں۔ لارس اور دوسرے غریب مسکین لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اور یوں بھوک اس قصبے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فرار ہو گئی اور اشرافیہ کو یقین ہو گیا کہ وہ اب کبھی قصبے کا رخ نہیں کرے گی۔ بعض تو یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ اگر کبھی اس نے یہاں سر اٹھایا بھی تو اسے ایک قتل کی طرح چھپا دیا جائے گا۔

☆☆☆☆

ہینن بر
ڈینش زبان سے ترجمہ: نصر ملک

جوئیں

لنگوریہ سے تھوڑی دور شمال میں، ڈھلوان کے سب سے زیادہ مضبوط حصے پر ایک تنہا مکان ہے اور اس گھر کے آس پاس کھیتیاں ہیں۔ یہاں کلوراور اس کے والدین رہتے تھے۔

کلور جب بیس سال کا تھا تو اس کی ماں فوت ہوگئی تھی۔ اور اس کا باپ بستر پر جا پڑا تھا۔ کلور کے لیے اس کی ماں کی وفات تو اتنی بھاری ضرب نہیں تھی لیکن اس کے باپ کا ایک مردے کی طرح بستر پر پڑے رہنا اس کے لیے بدتر تھا۔ اگر اس نے خاموشی اختیار کر لی ہوتی تو کلور کو شکایت کرنے کے لیے کچھ نہ ہوتا۔ لیکن صبح، دوپہر، اور ہر رات وہ اپنے بیٹے پر زور دیتا رہتا تھا کہ وہ شادی کر لے۔

کلور نے اس معاملے میں کوئی پیش رفت نہیں کی تھی۔

بوڑھا بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ مسلسل زور دیتا رہتا تھا: "اگر ہم گھر میں کوئی عورت نہ لائیں گے تو میں ان سب جوؤں سے مرجاؤں گا۔" وہ کہتا رہتا۔

کلور کی آنکھیں اشک بار ہو جاتیں۔

اس کا باپ جلدی سے اپنے گھٹنوں پر کھڑا ہو جاتا اور پھر جوئیں تلاش کرنے کے لیے بستر کو الٹ پلٹ کرنے لگتا۔ وہ لوہے کی ایک چمٹی کے ساتھ جوؤں کو پکڑتا اور انھیں کچلنے کے بعد اپنے بستر کے اوپر لٹکی ہوئی ایک ٹوکری میں ڈال دیتا۔ وہ اس ٹوکری کو اپنے بیٹے کے لیے ایک خطرہ بنائے رکھنا چاہتا تھا۔ "میں اسے ہر ایک کو دکھاں گا۔ میں بتاؤں گا کہ تم کس طرح مجھے موت کی طرف دھکیل رہے ہو۔۔۔ تم قتل کر رہے ہو!"، وہ کہتا۔

کلور ایک عام سا نوجوان تھا جو جنس مخالف کی طرف راغب ہونا تو محسوس کرتا تھا۔ لیکن اپنے ساتھیوں میں وہ ایسا تھا کہ اس کے لیے ہمت نہیں کر پاتا تھا۔ اور جونہی وہ ایسا کرنے کے نزدیک ہوتا، اس کے اعصاب اسے جواب دے جاتے۔ نہیں، اسے نہیں پتا تھا کہ لڑکیوں کو کس طرح کی چیزیں پسند ہوں گی۔

لیکن آخر کچھ تو کرنا تھا: اب وہ اس بوڑھے آدمی کے ساتھ وہاں مزید نہیں رہ سکتا تھا۔ اب گالی گلوچ میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

اس کا باپ خوفناک حد تک تمباکو چباتا رہتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ یہ جوؤں کا سب سے مؤثر علاج ہے۔ وہ تمباکو کو اس حد تک چباتا کہ تمباکو کا رس اسکے گلے سے ہوتا ہوا، شریانوں تک پہنچے اور پھر پسینے کی طرح اس کی جلد پر نمودار ہو۔۔۔۔۔۔"اب جوؤں کو آنے دو، ان کم بختوں پر لعنت ہو۔۔۔۔۔۔ !" وہ بڑبڑاتا۔

اس نے اپنے بستر کی پاس ایک لاٹھی بھی رکھی ہوئی تھی جو اس کی پرانی کشتی کے چپو سے بنائی گئی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ جوؤں کے بارے میں بات کرتا، وہ اپنے پیروں پر اچھل پڑتا اور اپنے اردگرد لاٹھی گھمانے لگتا۔ وہ ان کو للکارتا،"آؤ شیطانوں، آؤ!۔ میں تمھیں سبق سکھاتا ہوں!۔"

اور پھر جب وہ دیکھتا کہ ہزاروں جوؤں کا لشکر قطار بنائے اس کی جانب بڑھ رہا ہے تو وہ لاٹھی کو زور سے گھماتا ہوا ان کے درمیان پھینک دیتا اور خود پر بڑا فخر کرنے لگتا اور خود کلامی کرنے لگتا،"آہا، ہاں، ہاں، بوڑھے، اچھا، بہت اچھا۔۔۔۔۔ایک وقت تھا جب تم واقعی ایک مرد تھے۔ اب تم نوے سال کے ہو اور پھر بھی تم ایک ہزار کے مقابلے میں اکیلے کھڑے ہو سکتے ہو۔"

بوڑھا اپنی نوکری کو جتنا زیادہ بھرتا تھا، کلور اتنا ہی گھر میں اپنے لیے ایک بیوی لے آنے کے متعلق سوچتا۔ ایک دن وہ اپنے باپ کے پاس یہ جاننے کے لیے گیا کہ وہ اپنے وقت میں کسی لڑکی کے ساتھ کیسا تھا۔

کلور جب اندر داخل ہوا تو اس کا بوڑھا باپ بڑے زور سے تمباکو چبا رہا تھا۔ وہ بستر کے درمیان بیٹھا، کھڑکی سے اندر آتی چمکیلی دھوپ کی کرنوں کو دیکھ رہا تھا اور ابھی تک تمباکو چبا رہا تھا۔ کلور نے اس سے بات کی، لیکن نہیں، بوڑھے نے اس پر کوئی دھیان نہ دیا۔ پھر اچانک اس نے اپنی گردن بڑھائی اور منہ سے بستر پر تمباکو کے رس کی قے کر دی۔ اور اپنی بانھوں کو اوپر اٹھالیا اور ایک زوردار چیخ ماری۔

"تم اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟" کلور نے پوچھا۔

"میں اس طرح کیوں بیٹھا ہوں! کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اس میں سے سولہ جوئیں بستر کے پائے سے اوپر چڑھ رہی تھیں؟ وہ مرگئی ہیں، ہر ایک مر چکی ہے، تمباکو کے رس میں ڈوب کر!"، اور پھر اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

کلور کو اس ملاقات سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا اور وہ بوڑھے کی کسی لڑکی کے ساتھ وقت گزاری کے متعلق کچھ بھی نہ اگلوا سکا۔ اب یہی بات براہِ راست پوچھنے کے لیے اس کے اعصاب ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ لیکن بوڑھے نے ابھی تک اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اسے کوئی جھجک یا شرم تھی، نہیں، ایسا نہیں تھا۔۔۔ بوڑھے نے اس کی چٹکی لی اور اس کے ساتھ کشتی لڑنے لگا اور وہ کافی حد تک اس پر مسلط رہا۔

بیٹے کو یہ سب کچھ ناامید و مایوس کرنے کے لیے کافی تھا، وہ پیچھے ہٹ گیا۔

"نہیں ! مجھے اس کے لیے خود کوشش کرنی ہوگی۔"

اس نے سوچا۔

اب شام کے وقت کلو رنے گاؤں قصبے جانا شروع کر دیا۔ وہ ان گھروں میں جاتا جہاں گھر بیٹھی بیٹیاں ہوتی تھیں۔ وہاں جا کر وہ ان کی طرف دیکھتا رہتا لیکن اس نے کبھی ایک لفظ تک نہ بولا۔

بوڑھا آدمی جاننا چاہتا تھا کہ معاملات کیسے چل رہے تھے۔

"نہیں، کلور کی حوصلہ شکنی ہوئی تھی، اس طرح چکر لگانے کا کوئی فائدہ نہیں مجھے کچھ بھی تو حاصل نہیں ہو رہا"۔ وہ سوچتا۔

"وہ تو میری طرف دیکھتی تک نہیں۔ کاش میں نے ڈانس کرنا سیکھا ہوتا تو میں بھی ان کے ساتھ ڈانس میں شامل ہو سکتا تھا، پھر معاملات بھی خود بخود بہتر ہو جاتے"۔

اور پھر بوڑھا ایک دن اپنے بستر سے اٹھ کھڑا ہوا تاکہ کلور کو ڈانس کرنا سکھا سکے۔ ان دونوں نے کہنیوں کو جھکا لیا اور ایک نعرہ لگاتے ہوئے تیز تیز قدموں پر دائیں بائیں اور پھر آگے پیچھے، گھیرے کی صورت میں گھمایا اور یہ عمل بار بار دہرایا۔ اور جب بیٹا ڈانس کے دوران قدم اٹھانے کے طور طریقے سیکھ گیا تو بوڑھا پھر اپنے بستر میں جا گھسا۔

اب کلور ڈانس کے لیے گیا اور وہاں موجود لڑکیوں کو بڑی بے تابی و اشتیاق سے دیکھنے لگا، لیکن انھوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ کلور حوصلہ شکنی کا شکار ہو گیا اور واپس چلا گیا۔

بوڑھے نے پوچھا کہ معاملہ کیسا رہا۔

"نہیں! کچھ بھی نہیں ہوا، میں کچھ بھی حاصل نہیں کر پایا"

کلور بولا۔ "تم ڈرپوک ہو، بے وقوف!۔"

بوڑھا بولا۔ اب جانے سے پہلے ایک دو جام پی، اور پھر جا، یہ تمھارے اعصاب کو بحال رکھنے کے لیے کافی ہوگا۔"

کلور کو کچھ برانڈی تو مل گئی، لیکن ہوا کیا؟ اس نے کچھ اتنی چڑھا لی کہ وہ قصبے تک پہنچ ہی نہ پایا، اور سڑک پر کہیں سے کہیں گزر گیا اور جہاں تک جا سکتا تھا، گیا۔

لیکن ایک شام جب کلور ڈانس ہال سے واپس جا رہا تھا، اس وقت وہ ایک عورت کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔۔۔۔ وہ اتنی کم عمر نوجوان لڑکی نہیں تھی جو قصبے کے مضافات میں واقع ایک گھر پر کسی سے ملاقات کے لیے جا رہی تھی۔ راستے میں ایک زبردست برفانی طوفان نے انھیں آ لیا اور انھیں پتھر کی ایک باڑ کے پیچھے پناہ لینی

پڑی۔

یہ موسم کافی وقت تک جاری رہا، اور برفباری ہوتی رہی۔ لڑکی نے سردی کی شکایت کی۔ "میں ٹھٹھر رہی ہوں"۔ وہ بولی۔

"ج ج جی، ہاں!۔"

کلوراس سے متفق تھا کہ سخت سردی پڑ رہی تھی۔ اس نے اپنے بازؤں کو اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیا، لیکن مزید کچھ نہ بولا۔ لڑکی کو اب مزید سردی لگنے لگی تھی اور ٹھنڈ اس کے بدن میں داخل ہو رہی تھی۔ آخرکار وہ بولی: "کلور، اگر تم واقعی مرد ہوتے تو تم مجھے تھوڑا سا گرم کرتے۔"

کلور ہنسا، اس نے سوچا یہ کوئی مذاق تھا۔ لیکن لڑکی ثابت قدم رہی "تم مجھے تھوڑا سا گرم کیوں نہیں کرتے؟"، وہ بولی۔ اب کلور کو احساس ہوا کہ شاید وہ اس کے متعلق سنجیدہ ہے، اور اس لیے وہ بولا: "ٹھیک ہے، اگر میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے، تو پھر، یقیناً میں کروں گا"۔

"تمھیں کیا کرنا ہے!"، لڑکی بولی۔ "تم میرے قریب بیٹھ سکتے ہو، آؤ، تم میرے ساتھ لگ کر بیٹھو، اور مجھے اپنی باہنوں میں لے لو، بس یہی کچھ تو ہے۔"

اس موقع پر کلور کی زبان گنگ ہو گئی، وہ برف میں تھوڑا سا ادھر ہوا اور احتیاط سے بیٹھ گیا اور لڑکی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا لیکن اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ لیکن اب وہ آہستہ آہستہ اس کا لمس اور گرمی محسوس کرنے لگا تھا۔ اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ اس کے کپڑوں کے نیچے ایک نرم جسم یعنی آرام دہ عورت کا جسم ہے۔ پھر اس میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے اپنے ہونٹ لڑکی کے گال تک لے جا کر اسے ایک بوسہ دیا۔ اس نے دوبارہ اسے چومنا چاہا اور اس کے ہونٹ خودبخود اس کے رخسار پر جا لگے کیوں کہ اسے اب معلوم تھا کہ رخسار کہاں ہے۔

لیکن اب لڑکی نے اپنا سر پھیر لیا تھا لیکن کلور نے اسے منہ سے پکڑ لیا، وہ ابھی تک آگ سے بھرا ہوا تھا اور اس نے لڑکی کو اتنی سختی سے بھینچا کہ اس کی آنکھیں نکل آئیں اور اس طرح ان پر پڑی برف پگھل گئی۔

اس رات جب کلور دیر گئے گھر آیا تو اسے آواز سنائی دی کہ بوڑھا آدمی ایک گانٹھ لگا رہا تھا، اور وہ اپنی لاٹھی کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ کلور اس کے پاس گیا اور کہا کہ اب اس گھر میں ایک عورت آئے گی۔

"ہاں! وقت آ گیا ہے"، بوڑھے نے اسے ٹوکری دکھاتے ہوئے کہا، جس میں جوئیں بھری ہوئی تھیں۔ اب اس کے بعد کلور ایک اور شخص تھا۔ وہ ہر اتوار کو نہاتا تھا، نئے کپڑے پہنتا اور گھر کے اردگرد صفائی ستھرائی رکھتا۔ بوڑھا اس تبدیلی پر حیران، بستر میں لیٹا ریمارکس دیتا رہتا کہ اب یہ

گھرا تنا فینسی ہے کہ وہ کسی کو یہاں آنے کے لیے کہہ سکتے ہیں۔

لیکن پھر ایک دن جب وہ بوڑھا آدمی اپنی لاٹھی سے ٹیک لگائے ہوئے اپنے بستر پر کھڑا تھا، تو ایک عورت ہاتھ میں ایک ٹب لیے ہوئے اندر آئی اور اسے فرش پر رکھ دیا۔ پھر وہ پانی لانے کے لیے باہر گئی اور پانی لا کر ٹب میں ڈال دیا۔ بوڑھا یہ سب دیکھتا رہا لیکن اس نے ایک لفظ بھی نہ بولا۔ پھر اچانک بوڑھے نے پوچھا کہ کیا وہ کلور کی بیوی ہے؟

''ہاں، میں ہوں!'' وہ بولی۔ اب بوڑھا سب جوئیں اتارنے والا تھا، اور وہ اس کی مدد کرتے ہوئے اسے ٹب تک لے جانے والی تھی۔

بوڑھے نے پوچھا کہ کیا وہ ''پنٹسٹ'' ہے؟ اس کا اپنا تو بپتسمہ ہو چکا ہوا تھا۔ اس نے زور سے قسم کھائی کہ وہ اپنے کپڑے نہیں اتارے گا۔

لیکن عورت نے بوڑھے کو پکڑ لیا اور اس کے کپڑے اتارے اور انھیں ایک کونے میں پھینک دیا۔ بوڑھے نے اپنی زندگی کی جنگ لڑی، لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ بہت مضبوط اور طاقتور تھی۔ پھر اس نے بوڑھے کو اٹھایا اور ٹب میں پھینک دیا۔ وہ مدد کے لیے چیختا چلایا۔ اب نوے سال کی عمر میں وہ دوبارہ مکمل بپتسمہ لینے کی بجائے، اپنی جوؤں سے مر جانے کو ترجیح دے رہا تھا۔

اس نے ان تمام قوتوں کو پکارا جو اِس وقت اس کا ساتھ دے سکتی تھیں۔ تب، اسی وقت ایک زوردار حادثہ ہوا، ایک پتھر پہاڑی سے بڑی تیزی کے ساتھ لڑکھڑاتا ہوا، گھر کی کھڑکی سے ٹکرا کر اسے توڑتے ہوئے اندر فرش پر جا گرا۔ اس نے ٹب کو توڑ ڈالا لیکن اتنے بوڑھے مرد یا عورت کو نقصان نہیں پہنچا سکا تھا۔

''تم نے وہاں دیکھا!''

اب بوڑھے نے بڑی اونچی آواز میں پوچھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک جادو کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

لیکن اس عورت نے ہمت نہیں ہاری تھی۔۔۔۔۔ اب وہ ایک اور ٹب لے آئی تھی۔ اس نے اسے پانی سے بھرا اور بوڑھے کو اس میں پھینک دیا، اور اسے برش سے دھونے اور جھاڑنے لگی۔ جب وہ اسے نہلانے سے فارغ ہوئی تو اس نے ایک قینچی لا کر پہلے اس کی داڑھی اور پھر ساتھ ہی سر کے بال بھی کاٹ دیے۔ اب بوڑھے نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے بدن کے ''مخصوص حصے'' کو چھپا لیا۔

''نہیں! نہیں!''، وہ بولی۔ اس نے بوڑھے کے ہاتھوں کو پرے ہٹایا۔ تمھارے بدن کے ساتھ گندگی کا ایک نشان بیشک رہ جائے لیکن میں تمھارے جسم پر موجود ہر بال کاٹ ڈالوں گی۔

بوڑھے آدمی نے روتے ہوئے اس دن پر لعنت بھیجی جب اس نے اپنے بیٹے سے گھر میں اس دہشت کو لانے کی درخواست کی تھی۔

اس عورت نے، بستر میں جو کچھ تھا سب جلا دیا۔ باقی سب کچھ دھویا، جھاڑا اور جب وہ بوڑھا دوبارہ اپنے بستر پر واپس آیا تو، لحاف، گدے، لاٹھی، تمباکو، سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اور گھر میں کہیں بھی جوؤں کا کوئی نشان نہیں تھا۔

پھر بوڑھے نے اپنے ساتھ اس بدتمیزی اور واہیات برتاؤ کے باجود، عورت کو سراہا کہ اس نے یوں جوؤں کو یکسر ختم کر دیا تھا۔ لیکن اس کے فوراً بعد اس کی موت ہو گئی۔ اب جب جوئیں چلی گئیں تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاس زندہ رہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا، نہ کوئی شے جس کے ساتھ وہ لڑ جھگڑ سکے، اور اسی وجہ سے وہ مر گیا۔

وہ مر گیا، ہاں شاید آپ اسے، بیزاری دستی کہہ سکتے ہیں۔

☆☆☆☆